ننھے حضورؐ

(ایک تاریخی بیانیہ)

احسان بی، اے

ناشران

آئینۂ ادب ۔ چوک مینار ۔ انارکلی لاہور

فون نمبر ـــــــ ۶۷۵۰۴

بار اوّل
تعداد گیارہ سو
۱۹۶۳ء

قیمت: دس روپے

اہتمام
م ۔ ع ، سلام ۔ آئینہ ادب چوک مینار
انار کلی ۔ لاہور

(اشرف پریس ۔ لاہور میں چھپا)

فہرس

بلا اعتذار

تاریخ اور سیرت کی بے شمار و بے اندازہ کتابوں کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔ لیکن مجھے خدائے لایزال کے اس عظیم احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے جس نے مجھے ایک ناول نویس کی قوت متخیلہ بخشی۔ میں اس قوت کے سہارے دربار نبوت میں باریاب ہونے کی سعادت حاصل کرسکا ہوں۔

تاریخ اور سیرت کی کتابوں نے رہنمائی اور نشاندہی کے تمام فرائض

پورے خلوص سے سرانجام دیئے ہیں لیکن ناول نویس کی قوتِ متخیلہ نے اُن تمام رہنماؤں کو پیچھے ـــــــــ بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور میں اس کے سہارے اُن سرحدوں کو چھُو لینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جہاں اُن علوم کو بار نہیں مل سکتا۔

○ میں احمدؐ مجتبےٰ محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوا ہوں۔

○ میں طویل لمحوں تک آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے مکہ اور یثرب کے کوچہ و بازار میں گھوما ہوں۔

○ میں نے سردار عبدالمطلب کی محبت اور اس محبت میں کھوئی ہوئی پریشانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

○ میں نے برکہ بن کر محمدؐ کو اپنے سینے سے لگایا ہے اور اس بیکراں سکون و سرور کے لمبے لمبے جرعے پیئے ہیں، جس سے برکہ کی رُوح کی پور پور شاد اور کامران ہوئی ہو گی۔

○ میں نے مائی حلیمہؓ کا سایہ بن کر محمدؐ کو پاؤں پاؤں چلتے دیکھا ہے۔ اُن توتلی باتوں کو سُن سُن کر گھنٹوں جھوما ہوں جو بادیۂ بنو سعد کے خیموں میں گونج ہوں گی۔

○ میں نے مائی حلیمہؓ کے شاوند حرث کا کندھا بن کر اُس مقدس بوجھ کو اپنے اس گنہگار جسم پر محسوس کیا ہے۔

○ میں نے محمدؐ کے بچپن کو ہر رنگ میں، ہر انداز میں دیکھا ہے۔ اس

کے ہر پہلو سے شدید جذباتی محبت کی ہے اور یہی محبت میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

اور آج میں قوم کے دربار میں حاضر ہوا ہوں تاکہ اس سرمائے میں آپ سب کو شریک کر لوں۔

اوراق کا یہ مجموعہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے ناول نہیں ہے۔ گو اس کا انداز اور واقعات کو بیان کرنے کی تکنیک ناول ہی کی ہے۔ بایں ہمہ یہ ناول نہیں۔ ان اوراق میں میں نے اپنے اُن واردات کو قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے جو محمدؐ کا لفظ میرے قلب و دماغ پر طاری کرتا ہے۔ یہ اُن محسوسات کے ادراک کی ایک کوشش ہے جو دنیا کے اس عظیم ترین انسان صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ نے میرے دل میں پیدا کیے۔

علمائے تاریخ کو ان اوراق میں ایک نہیں ہزاروں غلطیاں دکھائی دیں گی۔ میں ان کی پیشانی پر غصے کی سلوٹیں اُبھرتی اور بیقرار ہوتی دیکھ رہا ہوں، لیکن میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ مجھ گنہگار کے پاس لے دے کر ایک ہی سرمایہ ہے اور وہ محمدؐ کی ذاتِ قدسی سے محبت ہے۔ میں نے اس محبت کو ناول نگار کی قوتِ متخیلہ کی کمک پہنچائی ہے اور اُن قدموں میں لوٹ لوٹ جانے میں کامیاب ہوا ہوں جن کی گرد تک پہنچنے سے بہت پہلے علم کا قافلہ تھک کر بیہوش ہو جایا کرتا ہے۔

اور یہ کون نہیں جانتا کہ محبت میں حماقتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ گستاخیاں بھی بعید از قیاس نہیں۔ مجھ سے بھی ممکن ہے، محبت کی بے شعوری میں کچھ حماقتیں

سرزد ہو گئی ہوں۔ میں تہ دل سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتا اور سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کوتاہیوں کی معافی چاہتا ہوں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کے لئے رحمت بن کر آنے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور میری ہر کوتاہی ہر تقصیر معاف کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد میں کسی کے سامنے اپنی تنگ دامانی کے اعتراف یا اعتذار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

احسان بی۔ اے

طلوعِ مہر

سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

حفیظ جالندھری

۱

سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا اور مکے کے اونچے نیچے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں کوہ ابوقبیس کے سائے میں سمٹتی جا رہی تھیں ــــــــ!

مقدس کعبہ سے کچھ دُور مشرق کی طرف بازار سے ذرا ہٹ کر مکہ کے عظیم قبیلہ قریش کے معزز و محترم سردار عبدالمطلب کے سہ منزلہ مکان کی چھت پر سے دھوپ ابھی ابھی ہٹی تھی۔ اور چھت پر بچھے ہوئے پتھر ابھی تک گرم تھے۔ جیسے انہیں دہکتے تنوروں سے نکالا گیا ہے۔ لیکن یہ تپش سردار عبدالمطلب کی بھتیجی بہو آمنہ بنت وہب کو چھت پر آنے سے نہ روک سکی تھی۔ آمنہ بنت وہب پاؤں میں اونٹ کے بالوں کی نرم اور موٹی جوتی پہنے چھت پر آ گئی تھیں اور منڈیر کے قریب کھڑی دُور شام سے آنے والی سڑک کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔

یہ سڑک مٹیالے سانپ کی طرح بل کھاتی ابوقبیس کی پسلیوں پر لپٹتی
ہوئی اُس کی انتہائی بلندیوں تک جاتی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی
آمنہ کو یاد تھا۔ آج سے پورے انتیس دن پہلے صبح کے دھندلے ستاروں کی
جھلملاتی روشنیوں میں اُنہوں نے اسی چھت کی اسی منڈیر پر کھڑے ہو کر ایک
قافلے کو اسی سڑک کے پیچ و خم کو قطع کرتے دیکھا تھا۔ ان کی نگاہوں نے
دُور تک اس قافلے کا ساتھ دیا تھا۔ اُن کے کانوں نے اپنی پوری قوت صرف
کرکے اونٹوں کے بلبلانے کی آواز سنی تھی اور اس دن ہوا بھی کتنی مہربان تھی۔
اونٹوں کی بلبلاہٹ ناچتی ہوا کے دوش پر آتی اور آمنہ بنت وہب کے
کانوں میں کسی جانے والے کا پیغام بن کر ڈوبتی جاتی۔ یہ بلبلاہٹ سن کر آمنہ کی
نگاہوں کے سامنے وہ منظر مجسم ہو گیا تھا جب وہ آنکھوں میں آنسو لئے عبداللہ
کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔ وہ اپنے سرتاج سے بہت کچھ کہنا
چاہتی تھیں۔ اُن کے ذہن میں الفاظ کا ایک غوغا برپا تھا۔ خیالات زبان پر
آنے کے لئے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ لیکن زبان انہیں ادا
کر دینے سے قاصر ہو گئی تھی۔ انہوں نے صرف اپنے سرتاج کو ایک نظر اٹھا کر
دیکھا تھا۔ آنکھوں میں پھیلتی اور سمٹتی ہوئی نمی چادر پر ایک جوان حسین چہرہ پگھلا
پگھلا سا دکھائی دیا تھا۔ تازہ تازہ داڑھی کے ریشمی بال اُن کے عبداللہ کے
سنہرے گندمی چہرے پر کتنے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اور وہ بڑی بڑی
تیز سیاہ آنکھیں جن کی لمبی کالی پلکوں میں محبت کی جنتیں لوٹ رہی تھیں۔ اس نمی
چادر کے باوجود کتنی صاف، کتنی کشادہ اور زندگی سے کتنی بھرپور دکھائی دیتی

تھیں۔ آمنہ نے اپنی ٹھوڑی کا دباؤ اپنے سرتاج کی انگلی پر ڈال کر اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اور پھر اُن کے کانوں نے اپنے عبداللہ کی آواز سنی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے،

"میں بہت جلد لوٹ آؤں گا اور اتنا بہت سا منافع کما کر آؤں گا۔ شام میں کھجوروں کے دام دُگنے چوگنے ملتے ہیں۔"

اور ابھی وہ کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سردار عبدالمطلب کی آواز سیڑھیوں پر سے گونجتی ہوئی پتھر کی محرابوں سے ٹکرائی تھی،

"عبداللہ اب آ بھی چکو۔ بہت دیر ہو گئی۔"

"حاضر ہوا۔" عبداللہ نے اپنے والد کے جواب میں کہا تھا! اور آمنہ بنت وہب کو خوب یاد تھا۔ کہ اس وقت اس غیور اور طاقتور عرب کی آواز میں ایک خفیف سی لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ آمنہ نے اس آواز سے چونک کر اپنے عبداللہ کی طرف دیکھا تھا اور عبداللہ اُن کی ان اٹھتی ہوئی آنکھوں کی تاب نہ لا کر فوراً مڑ گئے تھے۔ انہوں نے مڑتے مڑتے ایک دفعہ پھر کہا،

"میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔"

اور چوڑی چکلی پیٹھ تیزی سے سیڑھیوں کے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔ عبداللہ کے طاقتور قدموں کی زد سے گھر کی چھت کانپ گئی تھی۔ آمنہ کا جی چاہا تھا کہ بھاگ کر دروازے میں جائیں اور عبداللہ کو سیڑھیوں پر سے اُترتا دیکھیں لیکن کسی اَن دیکھی طاقت نے جیسے اُن کے پیر پکڑ لئے۔ وہ عبداللہ کی پیٹھ نہیں

دیکھیں گی۔ نہیں وہ انتظار کریں گی۔ تیس دن! صرف تیس دن۔ یوں چٹکی بجاتے میں تیس دن گزر جاتے ہیں۔ بس سات اور پھر سات اور پھر سات اور پھر — ہاں اور پھر کل سات اور عبداللہ آجائیں گے۔ آمنہ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ جب انہوں نے سوچا کہ وہ عبداللہ کو یہ کہہ کر چھیڑ سکیں گی کہ جاتے وقت خود عبداللہ کی آواز بھی کانپ گئی تھی۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کمرے کے ملگجے اندھیاروں میں مسکرادیں اور پھر یکایک تیزی سے بھاگ کر چھت پر چڑھ گئیں۔ اسی منڈیر کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے دیکھا دور — مقدس کعبہ سے خاصے فاصلے پر — مکہ کے چوک میں جہاں تین سڑکیں آکر ملتی ہیں، ایک قافلہ دھکڑ دھکڑ جلتی ہوئی شمعوں کی روشنی میں تیار ہو رہا تھا۔ روشنی اور اُجالے کی سرمئی آنکھ مچولی میں کئی لمبی لمبی عبائیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اونٹوں پر سامان لادا جا رہا تھا۔ اور پھر اندھیرے اور اُجالے کی اسی سرمئی آنکھ مچولی میں تین اور عبائیں پھڑپھڑائیں۔ آمنہ نے انہیں فوراً پہچان لیا تھا۔ ان میں سے ایک عبا وہ تھی جس پر سارے عرب کے ہونٹ محبت اور عقیدے کے بوسے ثبت کیا کرتے تھے۔ یہ سردار عبدالمطلب کی عبا تھی۔ ان کے ساتھ حارث تھے اور حارث کے پیچھے عبداللہ — !

آمنہ کی نگاہیں جیسے عبداللہ پر گڑ کر رہ گئی ہوں۔ وہ جہاں بھی جاتے آمنہ کی نگاہوں کی زد میں تھے۔

اور پھر قافلہ چلا تھا۔ اونٹوں کے بلبلانے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور آمنہ بنتِ وہب کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کہ یہ آوازیں اُن کے عبداللہ کے

اُس وعدے کو دُہرا رہی ہیں۔ جو اُنہوں نے جاتے وقت کمرے کے ملگجے اندھیاروں میں کیا تھا۔

"گھبرانا نہیں! میں جلدی لوٹ آؤں گا"

اور آج بھی جب کہ اُدھا کٹہ غروب ہوتے ہوئے سُورج کی کرنوں سے دھویا جا رہا تھا، آمنہ بنت وہب وہی آواز سُن رہی تھیں۔ سڑک سنسان تھی دُور دُور تک کسی جاندار کا اس پر نشان نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی "مٹیالا اژدہا" ابو قبیس کی پسلیوں سے لپٹ کر ہانپ رہا ہے۔ لیکن اس خاموشی اور تنہائی کے باوجود آمنہ بنت وہب کے کان وہی آواز سُن رہے تھے،

"میں لوٹ آؤں گا ——— میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔"

اور آج انتیسواں دن تھا۔ صبح ستاروں کی روشنی میں ہدی خوانوں کی آواز گونجے گی۔ اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی مترنم گھنٹیاں گنگنانے لگیں گی اور فضاؤں کو بیدار کر دیں گی اور عبداللہ آ جائیں گے ——— آمنہ بنت وہب کے عبداللہ ——— اُن کے اپنے عبداللہ اور پھر زندگی ایک مترنم ندی کی طرح اٹھکیلیاں کرتی ہوئی بہنے لگے گی ———!

آمنہ اس خیال میں کچھ ایسی محو ہو گئی تھیں کہ اُن کا ماحول اپنا نہیں رہا تھا وہ پس و پیش سے بے خبر سڑک کو تکے جا رہی تھیں کہ اُن کی لونڈی برکہ کی آواز نے انہیں چونکا دیا،

"مالکن حضور ———!"

اور مالکن نے چونک کر دیکھا برکہ کے ایرانی خدوخال پر مسکراہٹیں پھیل رہی

کی طرح قربان ہو رہی تھیں۔ آمنہ کی نگاہوں میں بڑے واضح سوال کو برکہ نے پڑھ لیا اور لپک کر کہا،

"آقا سردار تشریف لائے ہیں اور نچلے کمرے میں مالکن حضور کا انتظار فرما رہے ہیں"

"بڑے ابا ـــــــ؟"

"جی ہاں!"

"شاید قافلے کی خبر لائے ہوں؟" آمنہ بنت وہب کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ پھولوں کی طرح جھڑنے لگی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھیں۔ برکہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کی مالکن ہوا میں اڑ رہی ہیں۔

لیکن یہ تیزی ـــــــ؟

معبود ـــــــ!

اور بے اختیار برکہ کی زبان چیخ اٹھی،

"مالکن حضور ـــــــ ویانا وُں کے واسطے آہستہ چلئے۔ سنا ہے ان دنوں میں بھاگا نہیں کرتے۔ دشمنوں کو تکلیف نہ ہو جائے۔"

اور مالکن نے محبت بھری نظروں سے کنیز کو دیکھا۔ ایک مسکراہٹ معنی کے ہزار دفتر سمیٹے اُن مقدس ہونٹوں پر قربان ہو گئی۔ اور پھر آہستہ خرامی سے سیڑھیاں قطع ہونے لگیں۔

سردار عبد المطلب کمرے میں بچھے ہوئے کمبلوں پر آہستہ آہستہ ٹہل رہے

تھے۔ وہ اس دنیا میں سو کے قریب برساتیں گزار چکے تھے۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے مکے کی سیاست کو ایک نہیں کئی بار پلٹتے دیکھا تھا اور اپنے ہاتھ سے پھر اُسے سیدھا کیا تھا۔ وہ دن بھی انہیں یاد تھا جب مکے کی سیادت و امارت قصی بن کلاب کے خاندان والوں کے ہاتھ سے چھین لینے کی سازش مکمل ہو گئی تھی۔ انہیں وہ خواب آج بھی بالکل اس طرح یاد تھا جیسے انہوں نے آج ہی دیکھا ہو جس میں انہیں چاہ زم زم کی نشاندہی کی گئی تھی اور حکم دیا گیا تھا کہ اسے کھودو اور اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ اہلِ مکہ کو بھی سیراب کرو۔ اس کنوئیں کے حقوق ملکیت کے لئے قریش کے گھروں میں انتشار پیدا ہونے لگا تھا۔ اور اسی وقت عبدالمطلب کو یہ احساس ہوا تھا کہ اُن کی اپنی اولاد ہونی چاہیئے، کثیر اور مضبوط۔ انہوں نے لات و عزیٰ کے سامنے منت مانگی تھی کہ اگر انہیں دس لڑکے عطا ہوں تو وہ ان میں سے ایک کو دیوتاؤں کی راہ میں قربان کر دیں گے اور پھر انہوں نے اس آرزو کو پورا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ دس بیٹوں کے باپ اور قریش کے طاقتور سردار بن گئے۔ انہوں نے منت پوری کرنے کے ارادے سے ہبل کے تیروں سے فال نکلوایا۔ ——عبداللہ—— ان کا سب سے عزیز اور پیارا بیٹا قربانی کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ عبدالمطلب گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے عبداللہ کے بدلے اونٹ قربان کرنا چاہے اور ہبل دیوتا سو اونٹوں سے کم میں راضی نہ ہوئے تھے۔

اور پھر عام الفیل——!

وہ ہولناک دن جب ابرہہ ایک جرار لشکر اور ہاتھی لے کر کعبہ
مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا۔ کس کی مجال تھی جو اس عظیم لشکر کا
کرتا۔ اور کون تھا جو مست ہاتھی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔ عبدالمطلب
نے سردار مکہ کی حیثیت سے یہ عام حکم دے دیا کہ اہل مکہ شہر خالی کر دیں
اور اپنی اپنی حفاظت کے لئے ارد گرد کی پہاڑیوں میں چلے جائیں۔ چنانچہ
حسب الحکم شہر خالی کر دیا گیا۔ لیکن عبدالمطلب کے کچھ اونٹ جو پہاڑیوں
چر رہے تھے ابرہہ کے فوجیوں کے ہاتھ لگ گئے اور وہ انہیں مال غنیمت
سمجھ کر اپنے لشکر میں ہانک لے گئے۔ عبدالمطلب کو جب اس بات کا
ہوا تو وہ سیدھے ابرہہ کے پاس پہنچے تھے اور انہوں نے اپنے اونٹوں کی
واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ ابرہہ نے عربوں کے اس سردار سے حیران ہو کر پوچھا
تھا،

"ہم تمہارے شہر پر حملہ کرنے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے
کے لئے آئے ہیں۔ تمہیں اپنے شہر کی حفاظت کی فکر نہیں لیکن اونٹوں کا اتنا
خیال ہے کہ فوراً انہیں واپس لینے کے لئے آ گئے ہو۔"

اور عربوں کے غیور سردار نے اپنی نڈر سادگی سے جواب دیا تھا،

"اونٹوں کا مالک میں ہوں۔ اس لئے ان کی فکر مجھے ہے۔ لیکن اس گھر
کا مالک خدا ہے وہ خود ہی تم سے نبٹ لے گا۔"

ابرہہ ہنس دیا تھا۔ اس نے اونٹ دے دیئے لیکن دوسرے ہی
دن اُسے معلوم ہو گیا کہ سردار مکہ نے جو کہا تھا غلط نہ تھا۔ کعبہ کے مالک نے

بچے گھر کی حفاظت کر لی۔

یہی سردار عبدالمطلب آج اپنے گھر کے ایک کمرے میں اونٹوں کے بالوں سے بُنے ہوئے کمبل پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اُن کا لانبا وجیہہ جسم بلند کے تنے کی طرح توانا اور سیدھا تھا لیکن آج اُن کی بھویں اُن کی آنکھوں پر جھک آئی تھیں اور وہ چہرہ جو اکثر بشاش نظر آیا کرتا تھا، آج کچھ اداس معلوم ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہل رہے تھے جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔

آمنہ بنت وہب تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں لیکن ٹھٹھک گئیں۔ خسر کی پریشانی نے انہیں جیسے اَن سنے الفاظ میں کچھ کہہ دیا ہو اور وہ ٹھٹھک گئی ہوں۔ اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا،

"ابا حضور ــــــ!"

سردار عبدالمطلب نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک چھوٹے سے روشندان سے عرب کی طویل لرزتی شام کی آخری زرد روشنی اندر آ رہی تھی اور کمرے میں گھرتی تاریکی سے جیسے پسپائی کی جنگ کر رہی ہو۔

برکہ شمعدان لے کر اندر آ گئی اور کمزور زرد روشنی کے چھوٹے چھوٹے دائرے کمرے کی گھرتی تاریکیوں میں اُبھر آئے۔ سردار عبدالمطلب کی آواز میں بڑھاپے کی لرزش نہیں جوانی کی گرج تھی۔ انہوں نے بڑی صاف اور بلند آواز میں کہا،

"آمنہ ــــ میری بچی آؤ ــــ!"

اور آمنہ اپنے سر کی اوڑھنی درست کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

"بیٹھو!" سردار عبدالمطلب نے کہا۔

اور آمنہ یوں بیٹھ گئیں جیسے وہ کوئی بہت بڑی خبر سننے کے لئے بیٹھی ہوں۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔ جانے کیا بات ہے۔ ابا حضور کیا بات کہنا چاہتے ہیں۔

سردار عبدالمطلب سامنے ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سمیٹا۔ وہ جیسے کچھ کہنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں لیکن بات کس طرح شروع کریں؟ وہ شاید یہی سوچ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے کہا،

"آمنہ ـــــ میں ـــــ کئی دنوں سے سوچ رہا تھا ـــــ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا ـــــ" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ آمنہ کا کلیجہ جیسے منہ میں آگیا ہو۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں ابا حضور ـــــ!" اُن کا دل چیخ اٹھا۔

سردار عبدالمطلب کی پیٹھ آمنہ کی طرف تھی۔ اُن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا۔ حارث یہاں نہیں ہیں۔"

"حارث ـــــ؟" آمنہ کو سخت حیرت تھی۔ حارث اگر یہ بیں نہیں تو پھر ـــــ؟

"ہاں حارث ـــــ!" عبدالمطلب نے کہا، "وہ کئی دنوں سے یثرب میں تھے۔"

"مگر ابا حضور ـــــ؟" آمنہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں۔

"عبداللہ کی بیماری کی خبر آئی تھی ـــــ" آمنہ کے کلیجے پر جیسے کسی نے

تاک کر گھونسا مار دیا ہو۔ وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور تیزی سے عبدالمطلب کے قریب پہنچ گئیں۔

"۔۔۔ بیمار!" ان کے ہونٹوں سے جیسے یہ الفاظ لڑھک پڑے ہوں

"ہاں ۔۔۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین ہے یثرب کے کاہن اپنے فن کے بڑے استاد ہیں۔ انہوں نے عبداللہ کو اچھا کر دیا ہوگا اور پھر حارث خود گئے ہیں"

"تو ۔۔۔ تو ابا حضور وہ کل نہیں آئیں گے؟"

"کل صبح یثرب سے ایک قافلہ آ رہا ہے۔ عبداللہ اور حارث ضرور اس کے ساتھ ہوں گے مگر عبداللہ ۔۔۔ میرا مطلب ہے اتنے توانا اور تندرست نہ ہوں گے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ بیماری کے بعد نقاہت کا جو عالم ہوتا ہے اس سے تم ناواقف نہیں ہو۔ مگر وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ میں اپنے بیٹوں کو خوب جانتا ہوں۔ وہ اونٹ کی طرح طاقتور ہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے بتا دینا مناسب سمجھا کہ تم پریشان نہ ہو جاؤ انہیں دیکھ کر۔"

"شکریہ ۔۔۔ ابا حضور" آمنہ نے دل سے کہا۔ سردار قریش کو کتنا خیال ہے میرا۔ یہ سوچ کر آمنہ کی رگوں میں خوشیاں تیرنے لگیں۔

"میں نے ہبل کے تیروں سے فال لیا تھا۔ عبداللہ آ رہے ہیں۔ میں نے تین دفعہ تیر پھینکے تھے اور تینوں بار نکلا وہ خوش و خرم لوٹ رہے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اور ہبل کے تیر جھوٹ نہیں بولا کرتے بیٹا ۔۔۔ تم بالکل نہ گھبرانا۔ عبداللہ آئیں گے تو کچھ کمزور کمزور دکھائی دیں گے۔ شاید وہ زیادہ سلیں۔۔۔

پھرنے کے بھی قابل نہ ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ـــــ کہ عبداللہ ـــــ میرا مطلب ہے بیماری کی وجہ سے خود بھی پریشان ہوں۔ آدمی بیماری سے چڑچڑا بھی تو ہو جاتا ہے۔ تم گھبرانا نہیں۔ اُسے تم سے اتنی محبت ہے جتنی شاید ریت کے ذرّوں کو عرب کی سرزمین سے بھی نہیں۔"

اُنہوں نے مڑ کر آمنہ کو دیکھا۔ اُن کو دونوں کندھوں سے اپنے مضبوط ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بڑی ہی شفقت کے لہجے میں فرمایا،

"ہماری بیٹی گھبرائے گی تو نہیں ـــــ ہماری بچی بہت مضبوط ہے۔ بنی کلب کا خون اس کی رگوں میں ہے اور بنی ہاشم کی عزت کی وہ امین ہے۔ ہماری بیٹی بہت مضبوط ہے ـــــ وہ کبھی نہیں گھبرائے گی۔"

اور آمنہ جیسے اس زمین سے کہیں بلند ہو گئی ہوں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان کی بعید وسعتوں میں بکھرے ہوئے ستارے اُن کی گرد راہ بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ ایک عظیم قبیلے کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے بھائی، ان کے ماموں کڑیل جوان تھے جن کی تلواروں کی چمک نے پورے عرب پر اپنی بہادری اور عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور اُن کے بھائیوں نے آمنہ سے والہانہ محبت کی تھی لیکن سردار عبدالمطلب کی اس آسمانی محبت کے سامنے وہ محبت بھی ہیچ معلوم ہونے لگتی تھی۔

اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تشکر" کا جذبہ جب الفاظ کی سرحدوں سے ماوری ہو جاتا ہے تو اپنا اظہار آنسوؤں ہی سے کیا کرتا ہے۔

دُور سے گھنٹیوں اور جھجوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ دھیمی ہلکی ـــــ

سردار عبدالمطلب نے کہا،

"حرب بن امیہ کی بیوی ہبل کی پوجا کرنے آئی ہے۔ میرا وہاں ہونا ضروری ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ عبداللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اور وہ چلے گئے۔ آمنہ بنت وہب کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سردار عبدالمطلب کے ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا اور اب ان کے قدموں کی حرکت میں اطمینان اور سکون کروٹیں لے رہا ہے۔

یکایک آمنہ کے ذہن میں گونجا،

"کیوں نہ میں بھی کعبہ جاؤں اور پوجا میں شرکت کرکے کعبہ کے دیوتاؤں سے عبداللہ کی صحت کے لئے دعا کروں۔" اور ان کے قدم اس خیال سے اٹھ بھی گئے۔ انہوں نے سردار عبدالمطلب سے اجازت لینے کے لئے ایک قدم بڑھایا بھی لیکن پھر یکایک رک گئیں۔

کیوں ———؟

اس کا جواب شاید بنت وہب بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب سے آمنہ امید سے ہوئی تھیں۔ کعبے کے دیوتا کچھ بیگانے سے ہو گئے تھے۔ آمنہ کو اکثر یہ خیال ہونے لگا تھا کہ کعبے میں پتھر ہی پتھر ہیں۔ ویسے ہی پتھر جیسے اُن کے گھر کی دیواروں میں چن دیئے گئے ہیں۔ ان پتھروں کے سامنے عبودیت کا اظہار کیسے جائز ہو سکتا ہے ———؟ اور وہ اپنے ان خیالات سے ڈرنے لگی تھیں۔

اب بھی کعبہ میں جانے اور دعا مانگنے کے خیال کے ساتھ ہی کہ "اہ،

خیالات اُن کے ذہن میں گونج اٹھے تھے۔ سان کے خون کی روانی نے جیسے اُن کے کان میں یہ سب کچھ کہہ دیا ہو۔

اور وہ اپنے خون کی ان آوازوں کو اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دینے کے لئے اپنے آپ کو مصروف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

"برکہ" انہوں نے ڈری ہوئی آواز میں پکارا۔

"مالکن حضور ــــ!" برکہ تو جیسے پاس ہی تھی۔

"کل ــــ کل صبح تمہارے مالک آرہے ہیں ــــ"

"کل صبح مالکن۔"

"ہاں ــــ یثرب کے قافلے کے ساتھ۔"

اور گھر میں جیسے بارات آ گئی۔ بکری ذبح کی گئی تاکہ یخنی بنائی جائے۔ اور پھر عبداللہ کے ساتھ کوئی مہمان بھی تو آسکتا تھا۔ بنی ہاشم کے گھر میں کوئی مہمان آئے اور اُس کی آؤ بھگت نہ ہو ــــ؟ اس لئے پوری بکری پکائی جائے گی۔ برکہ کے احتجاج کے باوجود مالکن حضور خود سارا کام کرنے پر مصر تھیں۔ کم از کم چھوٹے سردار کا کھانا تو وہ خود ہی پکائیں گی۔ انہیں ان کے ذائقے کا علم تھا۔ اگر شوربے میں ذرا سی بھول چوک ہو جائے تو ثرید کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور آمنہ کے ہاتھ کا پکا ہوا ثرید کتنے شوق سے کھاتے ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ اس کی تعریف کی تھی۔ اس لئے آج آمنہ ہی اُن کے لئے یہ تیاریاں کریں گی

لیکن آج عجیب سی بات ہو رہی تھی۔ ہر کام یوں چٹکی بجاتے میں ہو جاتا ... کا تازہ گوشت پلک جھپکتے میں گل گیا اور ابھی کھجور سے حرب ن

امیہ کی بیوی کے کھیتوں کی آواز نہ ملتی تھی کہ ثرید کے لئے شوربہ تیار ہو چکا تھا۔
برکہ نے اس دفعہ پھر مالکن کی خدمت میں ادب سے عرض کیا تھا کہ وہ اب آرام فرمائیں۔ بہت وقت ہو چکا ہے۔ لیکن آمنہ نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا تھا،

"کیا پو پھٹ گئی۔"

"نہیں ـــــ ابھی ثریا کا جھومر نصف آسمان تک بھی نہیں پہنچا۔"

"تو پھر ـــــ"

"کیا مالکن شب بیداری فرمائیں گی۔"

"نہیں، ہم سوئیں گے ـــــ مگر ـــــ"

اور یکایک آمنہ کی نگاہ مطبخ کا جائزہ لینے لگی۔ عبداللہ بہت نفاست پسند آدمی ہیں۔ برکہ کو معلوم ہے لیکن اس کے باوجود برکہ نے خیال نہیں کیا اگر انہوں نے باورچی خانے کو اس حال میں دیکھ لیا تو کیا سوچیں گے۔ یہ مشکیزے یہاں پڑے کیا کر رہے ہیں۔ یہ چھاگلیں صاف نہیں ہوئیں۔ اور یہ برتن کیسے بکھرے پڑے ہیں عبداللہؓ کیا سوچیں گے کہ ادھر انہوں نے گھر سے باہر قدم رکھا اور گھر کسی کاہن کی گپھا بن گیا اور پھر برتن صاف ہونے لگے۔ مشکیزوں کو قرینے سے ٹانک دینے کی جگہ تجویز ہوئی۔ اس پر لمبی بحث کا آغاز ہوا اور بڑی وقتوں کے بعد مشکیزے ایسی جگہوں پر رکھے گئے جہاں وہ خوبصورت معلوم ہوں۔
لیکن یہ کام بھی جلد ختم ہو گیا۔ کنیز کے کہنے پر آمنہ نے آرام کرنے کا وعدہ کیا اور سونے کے لئے چلیں لیکن جانے سے پہلے وہ ایک دفعہ چھت

پر ہو آئیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔

اور چند لمحوں کے بعد وہ چھت پر تھیں۔ زرد رو نصف چاند آسمان کے درمیان شکستہ فانوس کی طرح لٹک رہا تھا اور چھت کے پتھر شبنم میں اس طرح نہائے ہوئے تھے جیسے اُن پر کسی نے پانی چھڑک دیا ہو۔ ہوا میں خنکی اور نمی اس قدر تھی کہ آمنہ کے سر کی اوڑھنی چند لمحوں تک کھڑے رہنے کے بعد بھیگ گئی۔

خاموش چاندنی مکّے کی پُرسکون فضاؤں پر ایک روپہلی چادر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ ایک عجیب خاموشی، ناقابلِ فہم رعب دار سناٹا چاروں طرف مسلط تھا اور دھندلی روشنی میں مکّے کا چوک صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس کے دھندلے نقوش پر بھی آمنہ بنت وہب دیکھ رہی تھیں ایک قافلہ، جو ہر قافلے سے مختلف تھا ــــــ ایک ہنگامہ جس کی نوعیت ہر ہنگامے سے علیحدہ تھی ــــــ

اور وہ شاید دیر تک اس عجیب قافلے کو دیکھتی رہتیں کہ برکہ نے ایک دفعہ پھر ان کے تصورات کی زنجیر توڑ دی۔

"قیامت کی شبنم گر رہی ہے دشمنوں کی طبیعت ناساز نہ ہو جائے" اُس نے کہا اور ضد کی کہ مالکن نیچے چلیں۔ یہ برکہ عجیب لونڈی تھی۔ مالکن سے بچے کی طرح ضد کرتی اور مالکن بھی سارے عرب سے مختلف تھیں۔ وہ اپنی اس لونڈی کی ضدیں مان جاتی تھیں جیسے بڑی بہن چھوٹی بہن کی ضد مان لیتی ہو۔

بستر کی نرمیوں نے گرمجوشی کے ساتھ آمنہ بنت وہب کو اپنے

آغوش میں سمیٹ لیا۔ خیالات کے لئے کون سی زنجیر ہو سکتی تھی۔ برکہ نے کئی بار جھانک کر اندر دیکھا اور ہر بار مالکن کو جاگتے پایا۔ ایک دفعہ وہ آہستہ آہستہ قدم دھرتی ہوئی آئی اور سرہانے رکھی ہوئی شمع کو بجھانے لگی۔

"اسے جلنے دو برکہ ——— صبح پھر جلانا پڑے گا۔"

"لونڈی نے انتظام کر لیا ہے۔" برکہ نے پھونک مار کر شمع گل کر دی۔ اور پائنتی پر بیٹھ کر پیر دبانے لگی۔

"مگر تم کیوں نہیں سو جاتیں برکہ ———"

"مالکن حضور کی نیندیں بڑی قیمتی ہیں۔" اور دائی نے شرارت سے مالکن کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "مالکن حضور مکہ کو زندگی دینے والی ہیں۔"

آمنہ بنت وہب نے تو صرف مسکرا دیا لیکن ان کے ارد گرد کی فضا ناچنے لگی۔ ان دیکھے ہونٹوں نے ان سنی آوازوں میں برکہ کو داد دی تھی کیونکہ برکہ کی نگاہوں نے مستقبل کا سینہ چیر کر رکھ دیا تھا۔

اور ابھی آمنہ نے آنکھ جھپکی ہی تھی کہ فضا شتربانوں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ ایک شور زمین سے اٹھا اور آسمان کے نیلے گنبدوں میں گونج گیا۔ اونٹ اس زور سے بلبلائے کہ مکہ کی دیواریں کانپ گئیں۔ آمنہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ شور کم ہو گیا۔ یک لخت جیسے کسی نے اسے تلوار کی تیز دھار سے کاٹ دیا ہو۔

لیکن دور سے گھنٹیوں، آوازوں اور اونٹوں کے بلبلانے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ آمنہ نے چہرے اور انتظار کیا۔ شاید اب بھی وہ جاگی

نہ ہوں اور یہ آوازیں خواب ہی میں ان کے کانوں سے ٹکرا رہی ہوں۔ لیکن نہیں یہ آوازیں حقیقی تھیں۔ قافلہ آ چکا تھا۔

آمنہ یک لخت اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اور ان کے ہونٹوں نے پکار کر کہا،

"بُرکہ"

"حاضر ہوئی"

اور آواز کے ساتھ ہی دروازے کی جھریوں میں سے روشنی کی قاشیں کٹ کٹ کر کمرے میں بکھر گئیں۔

دروازہ آہستگی سے کھلا۔ برکہ ہاتھ میں شمع لئے ہوئے کمرے میں آگئی ——

"مالکو حضور —— "

"شریر کہیں کی —— کتنی بھولی بن رہی ہے" آمنہ نے مسکرا کر کہا اور برکہ زور سے ہنس پڑی۔

"قافلہ آگیا —— "

اور آمنہ جیسے ایک جست میں چھت پر پہنچ گئی ہوں۔

چاند دور افق میں ٹنک رہا تھا۔ تارے جھلملا رہے تھے اور ان ملگجی اندھیاروں میں شمعیں دھکڑ دھکڑ جل رہی تھیں۔ وہی تاریکی اور روشنی کی آنکھ مچولی اور اس آنکھ مچولی میں پھڑپھڑاتی ہوئی وہی عبائیں۔

برکہ نے چلا کر کہا،

"وہ رہے آقا سردار" اور برکہ بچوں کی طرح چھت پر اچھلنے لگی۔

پھر نہ جانے اُسے کیا سوجھی کہ وہ اچھل کر اپنی مالکن کے گلے سے
لپٹ گئی۔

"آقا آگئے ـــ" اُس کی آواز میں رقص کی کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہی نہیں، اس کی ساری کائنات محورِ رقص ہے۔ "انعام دلوا دیجئے مالکن آقا آگئے۔"

آمنہ نے بدقت اسے الگ ہٹایا۔ ان کا بھی رواں رواں خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اُنہوں نے مسرتوں سے مغلوب ہوتی ہوئی میٹھی ڈانٹ پلائی،

"دیکھنے تو دے کم بخت!"

اور پھر ان کی نگاہیں چوک پر مرکوز ہو گئیں۔

"وہ دیکھئے ـــ وہ عبا چمکی شمعوں کی روشنی میں ہاشمیوں ہی کی عبائیں چمکا کرتی ہیں۔ وہ ـــ وہ پھر اُدھر ہو گئے۔ ابھی پھر سامنے آئیں گے خیال رکھئے گا۔"

اور آمنہ کی نگاہوں میں اُن کی پوری دنیا سمٹ آئی۔ اُنہوں نے اپنی قوتوں کو مرکوز کر دیا لیکن ابھی تک شمع کی جھلملاتی روشنی میں عبداللہ کی وہ عبا نہیں چمکی تھی جس کی طرف برکہ مالکن کو متوجہ کرنا چاہتی تھی کہ نیچے کا دروازہ زور زور سے بھڑبھڑایا گیا۔

آمنہ نے برکہ کی طرف اور برکہ نے آمنہ کی طرف تعجب سے دیکھا۔

دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا اور سردار عبدالمطلب کی آواز گونجی:

"برکہ ـــ"

"آقا ـــ سردار!"

"وہ تو شاید ابھی گئے ـــ!"

اور آمنہ فقرہ پورا کئے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ ہرن کی سی تیزی اور پھرتی سے اُن کے پیر سیڑھیوں کو قطع کرنے لگے۔ ہر کہ کے کہنے کے باوجود انہوں نے دھیان نہیں دیا ـــ لیکن ـــ معبود ـــ!

کتنی لاتعداد تھیں یہ سیڑھیاں۔ آمنہ کو آج محسوس ہوا تھا کہ یہ گھر بہت ہی اونچا ہے۔ اپنے عبداللہ تک پہنچنے میں انہیں کتنی دیر لگ رہی تھی۔

وہ دروازے تک پہنچ گئیں۔

ان کے ہاتھ اٹھے۔ کنڈی ٹٹولی گئی لیکن وہ سوچ رہی تھیں۔ عبداللہ کی آواز کیوں سنائی نہیں دیتی؟ وہ ان کا نام لے کر کیوں نہیں پکارتے۔ اور انہوں نے پھر خود ہی فیصلہ کر لیا: "ابا حضور ساتھ ہیں اور پھر وہ بیمار بھی تو ہیں۔"

دروازہ اتنی تیزی سے کھلا جیسے یہ خود کھل جانے کے لئے بے چین تھا۔ آمنہ کی نگاہوں نے بیک نظر دیکھ لیا۔ سردار عبدالمطلب ہیں ـــ ساتھ حارث بھی ہیں، اور ـــ اور ـــ

"عبداللہ کہاں ہیں؟" اُن کے ہونٹوں نے چیخ کر کہا۔

سردار عبدالمطلب کی آواز کسی کنوئیں میں سے سنائی دی۔

"روؤ ـــ روؤ آمنہ ـــ اپنے بال نوچ لو ـــ تم بیوہ ہو گئیں۔"

آسمان کے اونگھتے ہوئے بڈھے ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔

۲

ابھرتے ہوئے سورج کی نرم سنہری شعاعیں لپک لپک کر اور بڑھ بڑھ کر
مقدس کعبے کے غلاف پر اپنے کنوارے بوسے نچھاور کر رہی تھیں۔ نیلے آسمان
کی نیم قوس میں تنی ہوئی سنہری دھوپ سے بہت اونچے نیلے خلاؤں کے
عین وسط میں کعبے کے مقدس کبوتر سفید نقطوں کی طرح گڑھے ہوئے معلوم
ہوتے تھے۔ لیکن مکہ ابھی تک نیم خوابی کے عالم میں اونگھ رہا تھا۔ آج کسی
قافلے کو نہیں آنا تھا۔ اس لئے مکے کی آبادی نے اپنے گھروں سے نکلنے کی
ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ مکے کے امیر تاجر حریر و دیبا کے نرم گدوں پر رات
بھر لنڈھائی ہوئی شراب کے کسل پر کروٹیں لے رہے تھے اور نادار طبقہ
اپنی اپنی گندی کوٹھریوں کی سیلی ہوئی ٹھنڈکوں میں پڑا سوچ رہا تھا کہ آج کے
کھانے کا انتظام کہاں سے اور کیونکر کرے۔ اس لئے بازار خاموش تھا۔
لیکن اسی خاموشی —— اس پُراسرار سکوت میں ایک عجیب ہنگامہ تھا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مکّہ کسی آنے والے کے انتظار میں ہے اور آنے والا جیسے آسمان کی بلندیوں پر سے اترے گا۔ جیسے آسمان میں کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور مکّہ دم بخود اس آنے والے کے انتظار میں چشم براہ ہے۔ ابھی ان اثیری بلندیوں میں کھلی ہوئی کھڑکیوں میں کوئی ظاہر ہوگا۔ اور اپنے راستے میں پھیلی ہوئی دھوپ کی سنہری بانات پر باوقار قدموں سے چلتا ہوا مکّے میں اتر آئے گا۔ اور جب اس کے قدم مکّے کی ریت کو نوازیں گے تو سارا مکّہ خوش آمدید کے نعروں سے گونج اٹھے گا اور یہ عجیب خاموشی، یہ پراسرار سکوت، یہ امید بھرا سناٹا یکدم فلک گیر شورِ استقبال میں ڈوب جائے گا۔

اور اس پراسرار سناٹے سے ہٹ کر، حرمِ مقدس کی پاک سرزمین کے اندر جہاں تین سو پینسٹھ خدا ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی کنواری شعاعوں میں نہاتے ہوئے ابراہیم کے گھر کے بالکل قریب پرجوش غصیلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فضا ان آوازوں سے گونج رہی تھی،

"کعبے کے خدا ـــــ تو نے میرے عبداللہ کو مجھ سے چھین لیا میرے عبداللہ کو ـــــ میں تجھ سے اس کی نشانی مانگ رہا ہوں، کعبے کے دیوتاؤ ـــــ اگر تم صرف پتھر نہیں ہو تو میرے عبداللہ کی نشانی مجھے دو ـــــ میں نے تمہاری خدمت میں جوانی کو بڑھاپے میں بدل دیا ـــــ میں اس کا انعام چاہتا ہوں۔ عرب کے دیوتاؤ ـــــ میرا انعام دو ـــــ میرے عبداللہ کی نشانی مجھے دو۔"

اور عبدالمطلب کعبے کی اوٹ سے نکلے اور کعبے کے اردگرد طواف کرنے لگے۔ وہ سرتاپا برہنہ تھے۔ ان کے کپڑے ایک طرف پڑے تھے اور

وہ تیزی سے کعبے کے اردگرد طواف کر رہے تھے۔ اُن کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دُعا نہیں کعبے کے دیوتاؤں سے اپنا حق مانگ رہے ہیں۔

سردار قریش اسی طرح اپنے حق کا مطالبہ کرتے کعبے کے اردگرد طواف کرتے رہے۔ ان کی آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سُرخ ہو گئی تھیں۔ جسم کے رونگٹے صبح کی غیر مانوس سردی کی وجہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔ اتنی دیر سے عرب کے دیوتاؤں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے مشقت طلب کام نے سردار قریش کو یقیناً تھکا دیا ہو گا لیکن ان کی محویت اس درجہ تھی اور ان کے جسم اور رُوح اپنی اس دعا اور اپنے اس مطالبے پر اس شدت سے مرتکز ہوئے تھے کہ اُن کا ماحول اُن کا نہیں رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کا جسم پگھل کر اس مطالبے میں ڈھل گیا ہے۔ اور جب تک یہ مطالبہ پورا نہیں ہوتا جسم کی کسی فطری ضرورت کا احساس انہیں نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ تیس پینتیس سالہ جوان حرم میں داخل ہوا ہے، آگے بڑھا ہے اور سردار قریش کو برہنہ دیکھ کر وہیں پر رُک گیا ہے۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے۔ حیا کی سُرخیاں اس کے گندمی چہرے پر چھا گئی ہیں اور اس نے نرم دھیمے لہجے میں کہا ہے،

"سردار قریش !"

اس آواز نے بھی معمر سردار کی محویت کو نہیں توڑا۔ وہ اسی طرح کعبے کے خداؤں اور عرب کے دیوتاؤں کو پکارتے، جھنجھوڑتے، بیدار کرتے، طواف کرتے رہے۔ ان کا مطالبہ اسی طرح کعبے کی مقدس مربع عمارت کو چاروں

طرف سے لپٹیا رہا۔

جب سردار قریش دوسری دفعہ نوجوان کے قریب سے گزرنے لگے تو نوجوان نے پہلے سے ذرا بلند آواز میں کہا،

"سردار قریش"

محویت ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئی اور سردار قریش نے گھوم کر دیکھا ــــ نوجوان کی پیٹھ دکھائی دی۔ سردار قریش نے بڑھ کر اپنی سفید کتان کی چادر اٹھائی اور جسم پر لپیٹتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا،

"کون ہے ــــ؟"

"میں ورقہ ــــ سردار قریش"

"او ــــ ابن نوفل" انہوں نے ورقہ بن نوفل کے قریب بڑھتے ہوئے کہا اور پھر یکایک بولے، "گھر سے آرہے ہو ورقہ"

"جی ہاں چچا سردار"

"آمنہؓ کا کیا حال ہے۔"

"بھابی کا ــــ؟ کیوں ــــ؟ وہ کل تک تو ٹھیک تھیں"

"ہاں آدھی رات کے قریب انہیں یکایک تکلیف ہوگئی تھی ابن نوفل ــــ کعبے کے دیوتا ہمیں عبداللہ کی نشانی سے نوازنا چاہتے ہیں"

"آپ تو بہت پریشان ہیں"

"آمنہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی ہے ــــ ابن نوفل ــــ میں ان پتھروں کو جھنجھوڑ دینا چاہتا ہوں ــــ اگر انہیں زندگی ہی کی ضرورت

ہے تو میری جان حاضر ہے لیکن میرے عبداللہ ــــــ"

"آقا ســـردار ـــ آقا ســـردار" دور سے کسی نے پکار دیا۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ برکہ ہرن کی سی تیزی سے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے بتوں میں سے بھاگتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

سردار قریش لپک کر اُس کے پاس پہنچ گئے۔

"گھر چلئے ـــ آقا سردار ــــ جلدی گھر چلئے"

"کیا ہوا ــــ" بوڑھے عبدالمطلب کے ہونٹوں پر پپڑیاں اُبھر آئی تھیں۔

"ننھے حضور تشریف لائے ہیں آقا سردار" برکہ کے جسم کا ایک ایک رواں مسکرا رہا تھا۔

"ننھے حضور ــــ" سردار عبدالمطلب نے حیرت سے پوچھا اور غیر شعوری طور پر جاننے والوں کی فہرست ان کے ذہن میں اُبھر آئی۔ لیکن فوراً ہی بعد یکایک جیسے سارے پردے ہٹا دیئے گئے ہوں اور سردار عبدالمطلب کی ساری کائنات نور سے جگمگا اٹھی ہو مسکراہٹیں اُن کی داڑھی میں چھپے ہوئے ہونٹوں پر معصوم بچوں کی طرح لوٹنے لگیں اور انہوں نے پوچھا،

"لڑکا ــــ"

"ہاں آقا ســـردار ـــ!" برکہ کے جسم کی پور پور میں ناچتی ہوئی شوخیاں احساس ادب کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھیں۔

اور حرم مقدس میں بکھرے ہوئے پتھر کے گھڑے اور ان گھڑے دیوتاؤں پر جیسے بجلی چھا گئی ہو۔ کعبے کی مقدس عمارت پر جوانی آ گئی۔ فضائیں جھوم اٹھیں

سورج کی کرنیں ناچنے لگیں۔

سردار عبدالمطلب کو اُس وقت کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔ لیکن ان کے پاس اس احساس کو پوری طرح سے سمیٹ لینے اور اس سے حظ اندوز ہونے کا وقت نہ تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے حرم سے باہر جا رہے تھے۔

اونچی نیچی فراز کو اُبھرتی ہوئی پتھریلی سڑک سردار قریش کے قدموں کے نیچے تیزی سے سمٹتی گئی جیسے خود سڑک کو انہیں جلدی سے گھر پہنچا دینے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ بر کہ کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ہانپ گئی تھی۔ اگر ایک بے پناہ آسمانی محبت اس کے خیال کے ہر پارے کو اپنے اندر نہ سمیٹ چکی ہوتی، تو وہ یقیناً بوڑھے سردار کی اس تیز روی پر حیران ہوتی اور یہ سوچے بغیر نہ رہ سکتی کہ ایک صدی کی طوالتیں ایک لمحے کے لئے سمٹ گئی ہیں اور سردار ایک دفعہ پھر بھرپور جوانی کی قوتوں سے مالا مال ہیں۔

راستے تقریباً خاموش تھے لیکن کہیں کہیں ایک دو نوجوان گھروں سے باہر نکل کر گول پتھروں سے جُوا کھیل رہے تھے اور ہار جیت کے لئے ایک دوسرے سے اُلجھنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے چند نے سردار عبدالمطلب کی سبک خرامی کو حیران نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے مشغلے میں مصروف ہو گئے۔

سردار عبدالمطلب اپنے گھر کے دروازے پر تھے۔ لکڑی کا موٹا دروازہ جیسے ان کے اشارے کا منتظر تھا ــــــ وہ آپ ہی آپ کھل گیا اور سردار دھندلائی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔

وہ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے آکر ٹھٹھک گئے۔ ان کا ہاتھ دروازے کو دھکیل دینے کے لئے اٹھا لیکن رُک گیا۔ اندر سے ایک ننھی سی آواز فضا کو چیرتی ہوئی سی آرہی تھی۔ یہ آواز رونے کی تھی —— ایک بچے کے رونے کی آواز اور سردارِ قریش ایسی کئی آوازیں سُن چکے تھے۔ کئی دفعہ اپنے کئی گھروں میں —— لیکن اس آواز میں عجیب جادو تھا۔ عجیب کیف جس کی تیزیوں میں ملائے اعلیٰ کی مبارکیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ سردارِ قریش کو یوں معلوم ہوا جیسے گھر کی فضا میں پروں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں سمو دی گئی ہیں۔ انہوں نے غیر شعوری طور پر اُن پروں کو دیکھنا چاہا لیکن کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ کوئی انوکھا پن کہیں سے دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن فضا میں نغمے تیر رہے تھے۔ جیسے خود ہوائیں گا رہی تھیں۔ جیسے مکان کا ایک ایک ذرہ، ہوا کی ایک ایک لہر خوشی کے ترانے گا رہی ہو —— نہیں عرش سے فرش تک پوری کائنات نغمہ و نور کے بے کراں سمندر میں بدل گئی ہو ——

سردارِ قریش ان نغموں کو سننا چاہتے تھے۔ ان سرگوشیوں کو معنی پہنانا چاہتے تھے۔ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ یہ نغمے اُن کی اپنی رُوح سے پھوٹ رہے ہیں۔ یا ان کا خارجی ماحول ان کی رُوح کو اپنے نغمات میں لپیٹ لینا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ بَرکہ آگئی۔ اُس نے مسکراتے ہونٹوں اور چمکتی ناچتی آنکھوں سے سردار کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالی اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی جھریوں میں سے رونے کی آواز ایک سیلِ انبساط کو جلو میں لئے پھوٹ پھوٹ کر پوری کائنات کو بھگو رہی تھی۔

سردار نے مسکرا کر برکہ کی طرف دیکھا اور کہا،

"اندر جاؤ برکہ ——— جاؤ اندر اور آمنہ سے کہو ہم اپنے پوتے کو ——" اور وہ رُک گئے، مسکرائے اور پھر بولے، "سلام کرنے کے لئے اندر آنا چاہتے ہیں۔"

برکہ جیسے ہوا پر تیرتی ہوئی اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کی آواز آئی،

"سردارِ قریش تشریف لائیں۔"

سردار عبدالمطلب کا ہاتھ جوش سے اٹھا لیکن کانپ گیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ اُن کے قدموں پر کسی اَن دیکھی طاقت نے نہ جانے کیوں کئی کئی من کے پتھر باندھ دیئے تھے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

کمرے کی دھندلی فضاؤں میں ملکوتی حسن لہرا رہا تھا۔ سامنے الگنی پر موٹے کمبلوں نے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کمبلوں کی چادر کے اس طرف سردارِ قریش کھڑے تھے اور اس پردے کی اوٹ میں سے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

برکہ نے کمبل ایک طرف ہٹا دیا۔ آمنہؓ ایک پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اُن کے جسم پر تین چار کمبل پڑے ہوئے تھے۔ اور اُن کا چہرہ اوڑھنی کی کئی تہوں میں نصف سے زیادہ چھپا ہوا تھا۔ لیکن سردار قریش کی نگاہیں آمنہ سے فوراً ہٹ کر اُن کے پاس چادر میں لپٹے ہوئے گوشت کے ایک ننھے سے لوتھڑے

پر مرکوز ہو گئیں جس کا چہرہ باریک اوڑھنی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس باریک اوڑھنی میں سے رونے کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

برکہ نے اوڑھنی ہٹادی اور خوشی کی کسی اخیری بلندی پر سے پکار کر کہا "ننھے حضور ــــــ !"

سردار قریش نے دیکھا۔ ننھی ننھی سرخ مٹھیاں فضا سے لڑ رہی تھیں۔ ننھی آنکھیں بند تھیں اور چھوٹا سا سرخ دہانہ زندگی کے فوارے اچھال رہا تھا۔ چھوٹی سی ناک، اونچی پیشانی، گیلے گیلے ریشم جیسے بال۔ ناک کے اوپر ملی ہوئی بھنوؤں کی پتلی سی لکیر اور چھوٹی چھوٹی سرخ رگوں کا جال جو زرد زرد کھڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے رونگٹوں کی تہہ میں بُنا ہوا تھا سردارِ قریش کی نظروں میں گھوم گیا۔

انہوں نے چند لمحوں کے لئے اپنے پوتے کو دیکھا۔ ان کے خون کی گردش نے جیسے لپک کر گنگنایا ہو ــــــ "عبدالمطلب تمہیں مبارک ہو۔"

اردگرد کی فضائیں گونج اٹھیں۔ پوری کائنات مبارکباد کی صداؤں سے جیسے لبالب بھر گئی۔

اور عبدالمطلب ان ناچتی گاتی فضاؤں کے درمیان کھڑے اپنے پوتے کو دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے جھک کر ننھے حضور کو اٹھا لیا۔ سردار عبدالمطلب کے ہونٹ جھکے اور بلند پیشانی سے پیوست ہو گئے۔

اُف معبود ــــــ !

یہ کیسا سرور تھا عبدالمطلب کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے آمنہ کے لال کے ماتھے پر نہیں مقدس کعبہ کے سنگِ اسود پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ہیں۔

اور اسی سرور، رُوح کی گہرائیوں میں کروٹیں لیتے ہوئے اسی اطمینان کی لہروں پر سوار عبدالمطلب نے ایک دفعہ پھر قریب سے اپنے پوتے کو دیکھا۔ اُن کی آنکھیں سمٹ گئیں۔ اُن کا دل جیسے پگھل کر ان کی نگاہوں میں سمٹ آیا ہو۔ انہوں نے تیزی سے ابن عبداللہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک آواز خود بخود چیخ کر اُن کے دل کی گہرائیوں سے ابھری اور ہونٹوں پر آکر فضا میں بکھر گئی۔ انہوں نے کہا،

"عبداللہ ــــ آؤ ــــ دیکھو ــــ تمہارے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔"

اور اس آواز نے آمنہ بنت وہب کے سینے میں جیسے آنسوؤں کے سوتے کھول دیئے۔ اُن کی رُوح چیخ بن کر اُن کے ہونٹوں پر سمٹ آئی اور انہوں نے کمبل دانتوں تلے داب کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

۴

سردار عبدالمطلب کا مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ــــــ!

ابن عبداللہ کو تشریف لائے آج ساتواں دن تھا اور قریش کی دیرینہ رسم کے مطابق آج عبدالمطلب نے اپنی قوم کو دعوت دی تھی تا کہ قوم ابن عبداللہؐ کو دیکھ لے اور اس نام کو سُن لے جس کا اضافہ عبدالمطلب کے خاندان میں ہوا تھا۔

لیکن قریش کے اس اجتماع میں بھی انتشار کی ایک عجیب کیفیت دکھائی دیتی تھی۔ ایک جگہ پر جمع ہونے کے باوجود قصیٰ کے نام لیوا چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں ایک دوسرے سے ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہلکی دھیمی آوازیں فضا میں بھنبھنا رہی تھیں اور کبھی کبھی ایک ٹکڑی دوسری ٹکڑی کی طرف تیکھی نظروں سے اس طرح دیکھ لیتی تھی۔ گویا وہ اس اتحاد کی سرے سے ہی مخالف ہے۔ لیکن اس کے باوجود سردار عبدالمطلب کی شخصیت نے ان کے مخالف گروہوں کو

ایک چھت کے نیچے جمع کر دیا تھا۔ اور یہ اپنی خواہش کے خلاف اس چھت کے نیچے جمع ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

حرث کی کنیزوں اور عبدالمطلب کے غلاموں نے مہمانوں کے سامنے ثرید کے پیالے سلیقے سے چن دیئے تھے۔ بکری کے شوربے میں بھگوئی ہوئی شام کی گندم کی روٹیاں ہاشمی گھرانے کا خاص پکوان تھا جس کی نقل عرب میں ہر جگہ ہوتی تھی۔ لیکن جس کے ذائقے کو ابھی تک کوئی نہیں پا سکا تھا۔ جس کو قحط کے زمانے میں مکہ کے نواح کے بادیہ نشینوں نے خوب خوب کھایا تھا اور ہاشم کی تعریف میں قصیدے کہے تھے۔ اور جس سے جل کر امیہ نے قوم سے سخاوت اور بلند ہمتی کی سند حاصل کرنے کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے لیکن اسراف کی حدیں گزر جانے کے باوجود ہاشم کی سخاوت کو چھونے میں ناکام رہا تھا۔

وہی ثرید آج پھر ہاشم کے پوتے عبدالمطلب کے دسترخوان پر قرینے سے چنا گیا اور اسی کو چکھنے کے لئے مکہ کی سرحدوں پر رہنے والے قریشی بھی عبداللہ کے یتیم کو دیکھنے کے لئے آ گئے تھے۔

لیکن قریشیوں کے اس عظیم اجتماع میں ثرید کی موجودگی کے باوجود کچھ کمی سی محسوس کی جا رہی تھی۔ لوگ کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ لیکن زبان ہلانے اور ذہن میں ابھرتے ہوئے سوالات کو ہونٹوں کی کمک پہنچانے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی۔

بالآخر چندے سکوت کے بعد ابو سفیان بن حرب بن امیہ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے والد سے پوچھ رہے تھے،

"ابا ــــــ شراب نہیں ہے۔"

ابو سفیان کے لڑکپن نے وہ بات کہہ دی جو جوان اور بوڑھے عبدالمطلب کے ادب کی وجہ سے نہیں پوچھ سکتے تھے اور اس چھوٹے لڑکے کی بات نے گویا پوری قوم کی ترجمانی کی اور حرب بن امیہ نے خاصے رعب دار انداز میں عبدالمطلب کے ایک غلام سے مخاطب ہو کر کہا،

"شراب لاؤ۔"

غلام خاموش ہو گیا۔

شراب کی کمی واقعی سبھی محسوس کر رہے ہیں، سردار قریش "ایک نے جرأت کی اور سردار عبدالمطلب جو ایک طرف کھڑے مہمان نوازی کا حق ادا کر رہے تھے، پلٹ پڑے۔ انہوں نے خاموش نگاہوں سے اپنی قوم کی طرف دیکھا اور پھر چندے توقف کے بعد کہا،

"آج کے دن شراب نہیں پی جائے گی۔"

"کیوں ہاشمیوں نے ابن عبداللہ کی خوشی میں شراب اپنے اوپر حرام کر لی؟"

"نہیں حرب۔" سردار عبدالمطلب کی آواز گونج بن کر فضا پر چھا گئی۔

"ہاشمیوں کے ثرید کی داد اسی وقت دی جا سکتی ہے۔ جب قوم حالتِ سکر میں نہ ہو۔"

"لیکن اموی ثرید کی لذتوں کو تو ہمیشہ سکر کی حاجت رہی ہے، سردار"

قریش۔" کسی نے دُور سے کہا اور پیالے میں انگلیاں ڈبو دیں۔

حرب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ابو سفیان کا رنگین جوانی کے بانکپن کی نقل کرنے کے لیے بیچے کی طرف لپک پڑا۔ لیکن حرب نے فوراً کہا،

"ثرید تمہارے انتظار میں ہے بیٹا، ہاشمی ثرید کی داد نہ دینا بخل ہو گا۔"

ابو سفیان نے کریدتی ہوئی سی سوالیہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اپنے باپ کے دل کی بات سمجھ لینا چاہتا تھا لیکن حرب کی تیز چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں کو ندے کی طرح اپنے بیٹے کی آنکھوں سے ٹکرائیں، جھکیں، اٹھیں اور اُس نے پدرانہ شفقت کے بھرپور لہجے میں کہا،

"وقت کی پہچان سب سے پہلی چیز ہوتی ہے بیٹا۔ تلوار اگر وقت سے پہلے نکل آئے تو بہادری کی علامت نہیں ہوا کرتی۔"

ابو سفیان نے عجب طرح کا منہ بنایا۔ اموی عزت وحشمت پر چوٹ کرنے والے کی طرف گھور کر دیکھا اور ثرید کھانے میں مشغول ہو گیا۔

شاید اس کی یہ تلخیاں کافی دیر تک قائم رہتیں لیکن ہاشمی ثرید کی لذت ہی مختلف تھی۔ اور وہ کوشش کے باوجود اپنے دل سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ ہاشمی ثرید کو واقعی شکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسی ثرید کی خوشبوئیں اُوپر کے کمرے میں الگنی پر ٹنگے ہوئے کمبلوں کی اوٹ میں سے اُبھر کر پورے کمرے کی فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور آمنہ بنت

وہب اپنے پلنگ پر لیٹی ان خوشبوؤں کو اپنے ذہن کی گہرائیوں سے چکھ رہی
تھیں۔ مٹی کا پیالہ اُن کے سرہانے کے طاقچے میں رکھا تھا اور بھاپ کی ہلکی
پتلی لکیر بل کھاتی دھندلائی ہوئی ساکن فضا میں جیسے گرتی چلی جا رہی تھی۔ برکہ
نے بڑا زور مارا تھا اور اپنی پوری ضد اور ہٹ صرف کر دی تھی کہ مالکن حضور
سات دن سے کھجوروں، ستوؤں اور روغن زیتون سے اکتا گئی ہوں گی! ایک
ہی طرح کا کھانا اور وہ بھی میٹھا اور مرغن یقیناً کام و دہن کو پریشان کر دیتا ہے
اس لئے انہیں ثرید کے مسالوں سے منہ کا مزہ بدل لینا چاہیئے اور تھوڑا بہت
چکھ لینا چاہیئے۔ لیکن مالکن جو اس عجیب ضدی کنیز کی اکثر ضدیں مان جایا کرتی
تھیں، راضی نہ ہوئیں۔ خوشامد ــــ روٹھ جانے اور بھیرمن جانے کے انداز اور
بچوں کی طرح بکھر بکھر جانے کا ہر وہ حربہ جس سے برکہ اکثر اپنی مالکن کو منا لیا
کرتی تھی آج ناکام ہو گیا تھا اور مالکن حضور کے تعمیلِ حکم میں برکہ کو ثرید کا پیالہ
سرہانے کے طاقچے پر رکھ دینا پڑا تھا۔

اور مالکن حضور برکہ کے جانے کے بعد دیوار کی طرف کروٹ کر کے
لیٹ گئی تھیں۔ گویا اپنے آپ کو دیوار کے آغوش میں بکھرے ہوئے سایوں
میں چھپا دینا چاہتی ہیں اور نہیں چاہتیں کہ وہ خیالات جو اس خوشی کے موقعہ پر
ان پر ہجوم کر لینا چاہتے تھے انہیں یہاں تنہائی میں پالیں اور ماضی کی اُن تابناک
محرابوں میں لے جائیں جو آمنہ بنت وہب سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئیں
لیکن جنہیں آمنہ بنت وہب کسی بھی قیمت پر اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی
تھیں ــــ!

لیکن دیوار سے لپٹے ہوئے گہرے سائے اس ضمن میں کوئی مدد نہ کر سکے تھے۔ ادھر برکہ نے کمرے سے قدم باہر رکھا تھا کہ سارے خیالات ایک سیل بے پناہ کی صورت میں امنڈ آئے اور عبداللہ کی معزز و مکرم بیوہ بے حال ہو کر اُن کی سطح پر تیرنے لگی۔ کیسے عجیب خیالات تھے یہ ____؟

اس چھت کے عین نیچے قریش کے سارے سردار جمع تھے۔ وہ قریشی بھی آئے تھے جنہیں خانہ جنگیوں نے مکّے سے نکال دیا تھا۔ وہ بھی تھے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور وہ بھی جن کی تلواریں مکہ اور قرب و جوار کے بسنے والوں کا تکیہ کلام تھیں اور وہ بھی جو اپنی روزمرہ کی روٹی کے لئے دوسروں کے محتاج تھے۔ قصی بن کلاب کا ہر نام لیوا اس چھت کے سائے میں بیٹھا تھا لیکن وہی نہیں تھا جس کی آواز آمنہ بنت وہب کے دل کی محرابوں میں گونجتی۔

ابا حضور خوش تھے۔ سردار عبدالمطلب کا پورا خاندان نہال ہو رہا تھا۔ لونڈی اور غلام بھی آزاد کئے جا رہے تھے۔ دعوتیں بھی دی جا رہی تھیں سبھی کچھ اسی معمول پر چل رہا تھا جس معمول پر کہ چلنا چاہیے اور ثرید کی تیرتی، بل کھاتی لپٹیں اس کا سب سے بڑا ثبوت تھیں۔ لیکن جس کا نام لے کر یہ سب کچھ ہو رہا تھا، وہ کہاں ہے ___؟ اس بارات کا دولہا کہاں ہے ___؟ کیوں یہ سب مل کر نہیں جاتے اور یثرب کی خاک سے اُس دولہا کو چھین کر نہیں لے آتے کہ آمنہ بنتِ وہب بھی ان خوشیوں میں شامل ہو سکے ___؟

لیکن شاید کوئی بھی نہیں جا سکے گا ___! شاید کیا یقیناً کوئی نہیں جا سکے گا!

تو پھر یہ سب خوشیاں ____ یہ ہنگامے ____ یہ بارات ____ یہ

دعوتیں ـــــ مہمانوں کی یہ آؤ بھگت ـــــ قریشیوں کا یہ تانتا ـــــ کس لئے ـــــ کیوں ـــــ؟

کیا یہ سب عبداللہ کی موت ـــــ؟

نہیں ـــــ!

آمنہ بنت وہب نے بے چینی سے کروٹ لی۔ دیوار کی آغوش میں سمٹے ہوئے سائے، کمرے میں پھیلے ہوئے سرمئی دھندلکوں سے زیادہ پریشان کن ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ان دھندلکوں سے پلٹ آئیں، بھاگ آئیں ـــــ! وہ ذہن پر سے ان یادوں کو کھرچ دینا چاہتی تھیں۔

توڑ کر پھینک دینا چاہتی تھیں ـــــ!

اور اُن کی نگاہیں یکایک پلنگ سے ذرا پرے ہٹ کر چھوٹی سی رنگین پیڑھی پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی ننھی سی جان پر مرکوز ہو گئیں۔ جس پر باریک کتان کی اوڑھنی ڈال دی گئی تھی۔

چھوٹی چھوٹی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھلے کرتے میں نکلی ہوئی چہرے کے دونوں طرف پڑی تھیں۔ ننھے ننھے گھٹنے مٹھیوں کی سیدھ میں پڑے تھے۔ پیٹ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اور اس سے ذرا اوپر ہٹ کر کتان کی اوڑھنی ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں سے جذب ہو رہی تھی۔ باقی کی جزئیات کمرے کی دھندلی فضا اور اوڑھنی کے دودھیا رنگ میں چھپ گئی تھیں۔

لیکن اس کے باوجود آمنہ بنت وہب کے تصور کی نگاہوں نے آنکھوں پر کھچی ہوئی ناک کے اوپر تنی ہوئی بھنوؤں کی ننھی منی محرابوں کو دیکھا۔ ان محرابوں

کے عین وسط میں سرخی کی لکیر کو دیکھا اور پھر یکایک ملبے کے ایک چھوٹے سے حصے کے لئے انہوں نے دیکھا فضائیں معمور ہو گئی ہیں۔ کمرے کی دیواریں ایک ناقابل فہم انداز میں تحلیل ہو گئی ہیں ——— نہیں پورا مکہ تحلیل ہو گیا۔ بوقبیس کی سخت پتھریلی راہگذاریں جیسے سیلِ نور میں بہہ گئی ہیں۔ پوری کائنات تحلیل ہو کر ایک عجیب ملکوتی فضا میں تبدیل ہو گئی ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ زمان و مکان کی تمام حدیں جیسے یکایک غائب ہو گئیں اور وہ لامکان اور لازمان کی غیر محدود وسعتوں میں تیرنے لگی ہیں۔ انہیں حیرت تھی کہ محسوس اور معلوم چیزوں کے اس فوری ضیاع پر انہیں کسی قسم کا ہراس محسوس نہیں ہوا بلکہ جیسے اُن کی رُوح سے سارے غم، ساری کلفتیں، سارے رنج یک قلم مٹ گئے جو ان حدود کے پیدا کردہ تھے اور وہ ان تمام زمینی احتیاجوں سے بلند ہو گئیں، جو زمان و مکاں کی قیود کا لازمی نتیجہ تھیں۔ ان کی رُوح ہلکی محسوس ہوتی تھی۔ ایک عجیب انبساط آفریں انداز میں ایک ایسے طریقے سے جس کا ذہنی احتساب غیر ممکن تھا۔ لیکن جس کو قلب و روح کی گہرائیاں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

اور لامکان اور لازمان کے خلائے بسیط میں جس کی تشکیل غیر مادی نور سے ہوئی تھی آمنہ بنت وہب نے آوازیں سنیں جو ان دیکھے ہونٹوں سے نورانی فواروں کی طرح اچھلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کائنات کا ہر ذرہ انہیں مبارک دے رہا ہے ——— لامحدود کی عظیم اور ناقابل ادراک وسعتیں نغمات کے سانچے میں ڈھل کر اُن کی رُوح کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ اس نغمے کو سُن رہی تھیں۔ ایک لامحدود سماعت کے ذریعے

—— ایک ناقابل فہم صفائی کے ساتھ۔ ابہام کے کسی بھی خطرے کے بغیر۔
یہ نغمہ گونج رہا تھا۔
اے وہ مبارک ماں جس نے اس ذاتِ قدسی کو جنم دیا۔ جس کی تعریف
نہیں ہو سکتی —— !
اے احمدؐ کی ماں مبارک
اے احمدؐ کی ماں
احمدؐ —— احمدؐ —— احمدؐ
یہ نغمہ گونجتا رہا —— لامحدود کی عظیم اور ناقابل ادراک وسعتیں نغمہ و
نور میں ڈھل کر آمنہ بنت وہب کی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی رہیں اور
آہستہ آہستہ اسی طرح جس طرح یہ کائنات ۔ یو قبیس کی پتھریلی راگذاریں چاروں
طرف کھچی ہوئی دیواریں پگھل کر سیل نور میں بدل گئی تھیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ
یہ سیل نور پھر متشکل ہونے لگا۔ اور لامکان کی عظیم و بسیط پنہائیاں پھر زمان و
مکان کی قیود میں سمٹنے لگیں۔ آمنہ بنت وہب ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو
اپنے پلنگ پر محسوس کرنے لگیں۔
لیکن تب اور اب میں بڑا فرق تھا۔ اب بنت وہب اجالے سے
اندھیارے اور اندھیارے سے اجالے میں پناہ لینے کے لئے مضطرب نہ
تھیں۔ ان کے ہونٹ خود بخود ہل رہے تھے اور انہوں نے یکایک چونک
کر محسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو احمدؐ کی ماں کہہ رہی ہیں —— احمدؐ؟
ابن عبداللہ کا نام احمدؐ —— ؟ ان کے لختِ جگر کا نام احمدؐ ہوگا؟

لیکن ابھی تک تو کوئی نام تجویز نہیں ہوا تھا۔ سردارِ قریش سے بچے کے چچاؤں نے جب بھی پوچھا، سردار نے یہی جواب دیا کہ ابھی تک کوئی نام ان کے ذہن میں نہیں آیا۔ بعض نے کعبے میں رکھے ہوئے دیوتاؤں کے ناموں پر کسی ایک کی تجویز بھی پیش کی تھی جو بڑی سختی سے مسترد کر دی گئی۔ سردارِ قریش نے بلند آواز سے ایک طرح کی ڈانٹ پلا دی تھی کہ خبردار کسی قسم کا کوئی نام نہ رکھا جائے۔ وہ کیا سوچ رہے تھے؟ اپنے پوتے کو کس نام سے پکارنا چاہتے تھے۔ اس کا کسی کو علم نہیں ——!

تو پھر یہ عجیب و غریب نام ——؟ احمدؐ ——؟ اُن کی روح نے یہ نام کہاں سے سُنا ہے ——؟ اُن کی سماعت نے یہ لفظ کس نغمے سے اخذ کیا ہے؟ نور و نغمے کا وہ کون سا ہنگامہ تھا جو لمحہ بھر ایک چھوٹے سے حصے کے لئے بپا ہوا اور اُن کی روح، اُن کی ساری کائنات اس نام سے تر بتر ہو گئی ——؟

آمنہ بنت وہب نہ سمجھ سکنے کے باوجود یہ جانتی تھیں کہ اُن کے لختِ جگر کا نام احمدؐ ہے۔

اور کمبل ذرا سا ہٹا پا گیا۔ برکہ نے جھانک کر اندر دیکھا۔ مالکن اور کنیز کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ برکہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور آمنہ بنت وہب بھی مسکرا دیں۔ ایک تازگی، ایک خلوص، ایک عجیب طرح کا انبساط تھا اس مسکراہٹ میں۔ برکہ نے ان ساری چیزوں کو اپنے جسم کی ہر پور سے گویا چھو کر دیکھ لیا اور مچل کر کمبل ہٹا کر اندر آ گئی۔

اُس نے پیڑھی کی طرف ایک نظر ڈالی اور مالکن حضور کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا،

"قوم اپنے سردار کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

اور آمنہ بنت وہب نے نہیں، بلکہ ان کے دل میں بیٹھی ہوئی کسی دوسری طاقت نے فوراً جواب دیا،

"لیکن سردار آرام فرما رہے ہیں۔"

اور آمنہ بنت وہب اپنے ان الفاظ پر فوراً چونک سی گئیں۔

برکہ نے مالکن کو اس انداز میں دیکھ کر ہاتھ پیر نکالے۔

"مگر قوم کو اس وقت سردار کی ضرورت ہے اور ضرورت کے وقت آرام تج دیا جاتا ہے۔"

وہ لپک کر آگے بڑھی اور کتان کا ہلکا پردہ اٹھا دیا گیا۔ آمنہ بنت وہب نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ اوڑھنی کے ہٹتے ہی کمرہ بقعۂ نور بن گیا ہے۔ وہ چونکیں۔ انہوں نے پھر دیکھا لیکن شاید یہ اُن کا خیال تھا۔ کمرہ ویسے ہی سرمئی سایوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور ابن عبداللہ گہری میٹھی نیند سو رہے تھے۔

"بات کیا ہے ــــــ ؟" انہوں نے برکہ سے پوچھا۔

"قریشی اپنے نئے سردار کو دیکھنا چاہتے ہیں۔" برکہ پیڑھی کے پاس بیٹھ گئی۔ "آقا سردار کا ارشاد ہے کہ میں چھوٹے حضور کو نیچے لے آؤں۔"

"شاید نام کا اعلان ہوگا۔"

"شاید ــــــ مگر ــــــ" برکہ نے مالکن کی طرف دیکھا اور وہ پوری توجہ

سے ننھے حضور کو پیڑھی پر سے ہٹاتے ہوئے بولی،

"مگر مالکن حضور ــــ نام تو شاید ابھی کوئی تجویز ہی نہیں ہوا۔"

لیکن ننھے حضور یکایک چونک گئے۔ چہرے کی سرخیوں میں گندھے ہوئے زرد زرد روئیں یکایک کھڑے ہو گئے۔ کالی کالی ــ چمکدار ــ تیز آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ نچلا ہونٹ بھنچا اور رونے کی آواز موتیوں کی طرح ہواؤں میں بکھر گئی۔

"اری آرام سے برکہ ــ ڈرا دیا تو نے تو۔" ماں کی محبت ثرید کے پیالے میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرح بل کھا کر بکھرا گئی۔

"نہ نہ میرے حضور ــــ میرے آقا ــــ میرے مالک ــــ نہ نہ میری زندگی۔" برکہ نے ایک سانس میں بہت کچھ کہہ دیا اور چھوٹے حضور کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

خوش قسمت برکہ ــــ! تیری روح آسمان کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی ہو گی۔

ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ انہوں نے برکہ کو ضرورت سے زیادہ تلخی کے ساتھ ڈانٹا تھا۔

"نام تجویز ہو گیا پگلی۔" انہوں نے شہد سے زیادہ میٹھے اور دودھ سے زیادہ ملائم انداز میں فرمایا۔ گویا گزشتہ تلخی کے نشان دھو رہی ہوں۔

"تجویز ہو گیا مالکن۔" برکہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ حیران تھی کہ اسے اس راز میں کیوں شامل نہیں کیا گیا۔ "کیا نام تجویز ہوا میرے ننھے منے آقا کا؟"

حضور کی خاموشی پر برکہ کو کتنا پیار آ رہا تھا۔

آمنہ بنت وہب بتا دینا چاہتی تھیں لیکن رُک گئیں۔

"سُن لینا۔۔۔ آقا سردار بتا دیں گے۔" اور وہ مسکرا دیں۔

انہیں یقین تھا کہ جس طاقت نے احمدؐ کا لفظ ان کی رُوح میں گھول دیا تھا وہی طاقت آقا سردار کو مطلع کر چکی ہو گی۔ آخر سردارِ قریش اس سے محروم کیوں رکھے گئے ہوں گے۔

"آپ نہیں بتائیں گی۔۔۔"

"اُونہوں۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ ہم بھی دیکھتے ہیں۔۔۔"

عجیب کنیز تھی یہ برکہ۔۔۔! اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ اُسے دام دے کر خریدا گیا تھا۔ اس کی اس بے حسی پر مالکن کو پیار آ گیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"برکہ۔۔۔!" سردارِ قریش کی آواز سیڑھیوں کی محرابوں سے ٹکرائی۔

"اری جا پگلی۔۔۔" مالکن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سردار آقا ناراض ہوں گے۔"

اور برکہ جلدی سے چل دی۔

بھاری کمبل پھر اپنی جگہ پر آ کر ساکت ہو گیا۔ برکہ کے ننگے پیروں کی ہلکی آواز دور ہٹتی گئی۔ آمنہ بنت وہب نے جسمانی آنکھوں سے نہیں دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اس ساری کائنات کو اپنی چھوٹی چھوٹی بانہوں میں سمیٹے

کمرے میں سے گزر گئی ہے۔ دروازے میں سے نکلتی چلی گئی ہے اور سیڑھیوں پر سے اترنے لگی ہے۔

اور پھر وہ خود یکایک نہ جانے کیوں پلنگ پر سے اٹھ گئیں۔ ان کے کانوں کے پردوں پر خون سنسنایا۔ انہوں نے تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے آپ کو سمیٹا۔ پھر ہاتھوں پر زور دے کر اٹھیں۔ آج آٹھ دن کے بعد فرش کی ٹھنڈکوں نے ان مقدس پیروں کو چوما تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلیں —— قدم بقدم —— اردگرد پڑی ہوئی چیزوں کا سہارا لیتی ہوئیں —— اور دروازے کے قریب آ کر رک گئیں۔

نیچے سے آوازوں کا ہجوم جیسے تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا اور آمنہ بنت وہب کی سماعت سے لپٹتا جا رہا تھا۔

چھوٹے حضور کی آمد نے مہمانوں میں تحرک سا پیدا کر دیا تھا۔ گویا بادِ بہاراں کا جھونکا آیا جس سے پورا گلشن جھوم اٹھا۔ سارے مہمان برکہ کے گرد جمع ہو گئے۔ دشمن دشمنوں کے شانے سے شانہ جڑائے کھڑے تھے اور نظریں اپنی ساری کدورتیں بھول کر ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔ ابن عبداللہ کی چمکدار سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت دہانہ اور حسین مخروطی ٹھوڑی ان ساری نظروں کو گلے ملا رہی تھیں۔

سب نے تعریف کی۔ قریشیوں کے مخصوص حسن کی داد بڑی فراخدلی سے دی گئی۔ چمکدار آنکھوں اور ناک سے اوپر ملتی ہوئی بھنووں کی محراب کو خوب خوب

سراہا گیا۔ لیکن اس ہجوم نظر اور ہجوم الفاظ کے باوجود ابن عبداللہ اسی طرح برکہ کی آغوش میں پڑے آہستہ آہستہ آنکھیں جھپکتے رہے۔ اس شور، نظروں کے اس اجتماع اور کئی انگلیوں کے اس لمس کے باوجود اس حسین ننھے چہرے پر کوئی تبدیلی نمایاں نہیں ہوئی۔

بالآخر سردار قریش کے ہاتھ بڑھے۔ انہوں نے اپنی دولت کو برکہ کے ہاتھوں پر سے اٹھایا اور اپنے بوڑھے سینے سے لگا لیا۔ ایک عجیب سکون ایک عجیب فرحت بوڑھی رگوں میں تیرنے لگی۔ اور وہ نہ جانے کیوں کھڑکی کی طرف گھوم گئے۔

وہ خود نہیں جانتے تھے وہ کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہے ہیں۔ دُور بوقبیس کی بلندیوں پر سڑکیں مل کر جدا ہو رہی تھیں۔ اس کے نیچے مکے کا چوک تھا اسی چوک پر ایک صبح عبداللہ نے اپنے کھجوروں سے لدے ہوئے اونٹوں کی مہار تھامی تھی اور ٹیالی سڑک پر جا کر اس کی بلندیوں کے اُس طرف نیچے اتر گئے تھے۔ ہر روز قافلے ان سڑکوں پر چڑھتے اور پھر دوسری طرف اتر جاتے ہیں۔ لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ قافلے کچھ دن بعد اسی بلندی پر پھر نظر آتے۔ اور لوٹ کر چوک میں آجاتے ہیں۔

شاید سردار قریش اسی کو دیکھنے کے لیے گھومے تھے۔ شاید انہیں امید تھی کہ کوئی قافلہ ابھی بوقبیس کی بلندیوں پر دکھائی دے گا۔ ڈھلوان سڑک پر چل کر نیچے اترے گا، اور پھر مسافر بھاگتا ہوا آئے گا۔ دروازہ کھل جائے گا، پیر سلسلے قطع ہو جائیں گی اور نومولود بچے کسی کے سینے سے لگ کر باپ کی شفقت

کے ٹھنڈے میٹھے سایوں میں سمٹ کر سو جائے گا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ سردار قریش کے سامنے پہاڑیاں پگھلنے لگیں۔ آغازِ دوپہر کی چمکیلی دھوپ کے پگھلے ہوئے کچے سونے میں نہائی ہوئی پہاڑیوں پر جیسے جھرجھری آ گئی۔ کیوں کہ خود سردارِ قریش کی آنکھوں میں آنسو کانپ اٹھے تھے۔

"ہم اپنے بھتیجے کو کس نام سے پکاریں سردار قریش" کافی انتظار کے بعد ایک نے کہا۔

"ہوں ——" سردار نے جیسے خواب سے بیدار ہو کر پوچھا "نام"

اور افسردہ خیالات مکڑی کے جالوں کی طرح کٹ کٹ کر ذہن کی محرابوں میں سمٹنے لگے۔ آنکھوں کا پانی پلکوں کی جڑوں میں جذب ہونے لگا۔ اور انہوں نے دھوپ میں نہائی ہوئی اونچی نیچی پہاڑیوں کی طرف ایک دفعہ پھر دیکھا آمنہ بنت وہب سردار قریش کا جواب سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

کھڑکی کے سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیاں نئی نہ تھیں۔ سردار قریش نے انہیں صرف دیکھا ہی نہیں اپنے پیروں سے چھوا، اور ان کے اکثر سنگریزوں کو کچلا اور ٹھکرایا تھا۔ لیکن آج ان کی بلندی اور پستی، ان کا ناہموار پھیلاؤ عجیب معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے نیچی اور کہیں سے اونچی پہاڑیاں محض بے جان، بے روح مٹی اور پتھر کے ڈھیر نہیں ہیں۔ ایک زندہ، جاندار لفظ ہیں جنہیں قدرت نے روزِ اوّل سے مکے کے سینے پر لکھ دیا تھا۔

اس سے پہلے سردار قریش نے اس لفظ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے کبھی اسے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن آج اس سوال نے کہ "ہم اپنے بھتیجے کو کس نام سے پکاریں ۔۔۔؟" سردار قریش کو اس لفظ کے پڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہوں نے اس لفظ کو صاف پڑھا اور صاف الفاظ میں سنا دیا۔

"محمدؐ" انہوں نے کہا، "تم اپنے بھتیجے کو محمدؐ کے نام سے پکارو گے"

اور آمنہؓ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ محمدؐ اور احمدؐ ایک لفظ کے دو پہلو۔ تو سردار قریش نے بھی وہ ملکوتی نغمہ سن لیا۔ اور اس سے یہ نام اخذ کر لیا ہے؟ آمنہ بنت وہب کو اب یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے غلط نہیں سُنا۔

"محمدؐ ۔۔۔؟" حرب بن امیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا عبداللہ کے یتیم کو محمدؐ کے نام سے پکارا جائے گا ۔۔۔؟"

آمنہؓ نے ان باتوں کو سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور پلٹ گئیں۔

"ہاں" سردار قریش نے ایک انداز تفاخر سے کہا، "میرے پوتے اور میرے نو بیٹوں کے بھتیجے کا نام محمدؐ ہے حرب بن امیہ ۔۔۔! تم حیران کیوں ہو رہے ہو؟"

حرب اپنے لفظوں کے صحیح معنوں کو اب سمجھ سکا تھا۔ اس نے پردہ ڈالا۔

"نام تو بہت اچھا ہے۔ میں صرف حیران ہو رہا تھا۔ قریش میں یہ نام

کبھی سننے میں نہیں آیا۔"

"قریش ہی میں نہیں حرب ــــ پورے عرب میں کہو ــــ مکے کے سینے میں یہ نام صدیوں اور قرنوں سے امانت کے طور پر محفوظ تھا۔ آج مکہ اپنی امانت سے سبکدوش ہو رہا ہے۔"

سردارِ قریش کے الفاظ کھوکھلے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں قبیلے کی عظمت اور چڑھتی دھوپ کا جلال تھا۔ حرب بن امیہ اور دوسرے قریشی اس سے مرعوب ہو کر رہ گئے لیکن حرب نے اپنی ڈوبتی نبضوں کو ہنسی کا سہارا دیا۔

"سردار کی اس محبت پر قریش کو فخر ہے ــــ" اُس نے کہا اور بات ختم کر دی۔

اوپر کے کمرے میں آمنہ بنت وہب کو شیر گرم ثرید میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ وہ اپنے عبداللہ کی خوشی میں پوری طرح شریک ہو رہی تھیں اور انہیں نہ جانے کیسے یہ پورا یقین ہو چکا تھا کہ یثرب کی مٹی زیادہ دیر تک اپنی امانت کی حفاظت نہیں کر سکی اور عبداللہ موت کے پردے کو چیر کر اس عظیم خوشی میں شریک ہونے کے لئے آ گئے ہیں۔ وہ پوری شدت، پورے خلوص اور پوری سچائی سے محسوس کر رہی تھیں کہ ثرید کے پیالے میں تنہا ان کی انگلیاں ڈوب ڈوب کر نہیں ابھر رہیں بلکہ اُن کے سرتاج اُن کے ساتھ ہیں اور کیوں نہ ہوتے اُن کے اکلوتے کا پہلا جشن تھا ــــ وہ یثرب میں کیسے رُک سکتے تھے ــــ!

۴

۲۱ دن پنجوں کے بل چلتے قریب سے یوں گزر گئے کہ نشان پا تک نہ چھوڑا بس آئے اور گزر گئے۔ آمنہ بنت وہب اپنی بیوگی کے غم کو چھوٹے حضورؐ کے ذریعہ بھلانا چاہتی تھیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں، وہ کبھی کبھی اس میں کامیاب بھی ہو جاتیں۔ اکثر ان تابناک لمحوں کو بھول جاتیں جب موت ان کے نزدیک بے معنی لفظ ہوا کرتا تھا اور غم ایسی چیز جس کا وجود نہ ہو۔ اس وقت چھوٹے حضور ان کی گود میں ہوتے اور پوری کائنات پگھل کر ان چمکدار کالی کالی آنکھوں میں ڈھل جاتی۔ ماضی ان کے ذہن کی خفیہ محرابوں میں بھٹک کر کھو جاتا اور آمنہ بنت وہب اس کی تلخیوں سے یکسر بے نیاز ہو جاتیں۔ لیکن یہ لمحات بہت کم عمر ثابت ہوا کرتے تھے۔ چھوٹے حضور اکثر ان ہولناک یادوں کے راستے کی موثر رکاوٹ ثابت نہیں ہو سکتے تھے جو تنہائی کی طویل شاموں میں عبدالمطلب کے گھر کے در و دیوار پر اپنا خونیں

ناچ ناچا کرتیں اور جن سے نگاہیں پھیرنے کی پوری کوشش کے باوجود آمنہ بنت وہب ان کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ جایا کرتیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ چھوٹے حضورؐ کی موجودگی بذاتِ خود ماضی پر سے پردے ہٹا دیا کرتی۔

آمنہ انہیں گود میں لے کر بیٹھتیں۔ کالی کالی چمکدار آنکھیں کھلتیں اور آمنہ کے چہرے کا جائزہ لیتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ برکہ پاس ہوتی اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ برکہ ننھی ننھی باتیں کرتی۔ چھوٹے حضور کی ٹھوڑی کو چھو کر انہیں ہنسانے کی کوشش کرتی اور انہیں باتوں میں چھوٹے سردار کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔

آمنہؓ کو یکدم کوئی بات یاد آجاتی۔ ماضی نسیان کے سارے پردے چیر کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آجاتا۔ عبداللہ کو جب معلوم ہوا کہ وہ باپ بننے والے ہیں، تو کتنے خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے اُسی وقت سردارِ قریش کو یہ خوش خبری دینے کی ٹھان لی تھی۔ اٹھ کر چل دیئے تھے۔ آمنہ مارے شرم کے سُرخ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے سرتاج کی عبا تھام لی تھی۔ وہ رک گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کندھے پر سے دیکھا تھا۔ مسرت کے بیکراں سمندر اُن کی آنکھوں میں لہرا رہے تھے۔

"کیوں ــــ؟" انہوں نے آمنہؓ سے پوچھا تھا۔

"ابھی نہیں۔"

"مگر وجہ ــــ!"

"بس ہم جو کہہ رہے ہیں۔"

اور عبداللہ رک گئے تھے۔ ہنسے تھے۔ پلٹے تھے اور انہوں نے آمنہ

کو بولتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُن کی سیاہ ریشمی داڑھی میں چھپے ہوئے یاقوت جیسے سُرخ ہونٹ یونہی سے کانپے اور آمنہ سمجھ گئی تھیں۔ وہ یہ سب کچھ سننا چاہتی تھیں۔ اپنی روح اور اپنے دل کے کانوں سے۔ ان ساری باتوں کو اپنی کائنات میں جذب کر لینا چاہتی تھیں جو عبداللہ کے سینے میں مچل رہی تھیں۔ لیکن اس شدید خواہش بلکہ اپنے شعور اور لاشعور ـــــ کی اس شدید ضرورت کے باوجود نہ جانے کیوں وہ پلٹ جائیں۔ وہ ان باتوں کو عبداللہ کے ہونٹوں پر سے ابھرتا اور سماعت میں اترتا دیکھنا نہ چاہتی تھیں۔

اور پھر انہوں نے محسوس کیا تھا۔ ابن عبدالمطلب کے چوڑے مضبوط ہاتھ ایک انبساط آفریں بوجھ بن کر ان کے کندھوں پر آئے۔ کان کی لو کے قریب عبداللہ کی آواز سنائی دی اور آرزوؤں کا ایک دفتر کھل گیا۔ عبداللہ اپنے پہلوٹے کا استقبال بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے۔ وہ خوب تجارت کرنا چاہتے تھے۔ بہت سا روپیہ کمانا چاہتے تھے اور اس روپے کو بڑی فراخدلی سے اپنے بچوں پر صرف کرنا چاہتے تھے۔ اونٹوں کی قطاریں اناج کے گودام ریشمی کپڑوں کے ڈھیر، سونے اور چاندی کے پہاڑ ـــ اور پھر قبیلہ بنو سعد کی دایہ ـــــ!

اپنے پہلے بچے اور اس کے بعد آنے والے کئی بچوں کے لئے قبیلہ بنو سعد کی دایہ کا انتظام کرنا سردار عبداللہ کا محبوب ترین خواب تھا۔ کچھ اس لئے کہ بنو سعد کی زبان عرب کی ٹکسالی زبان تھی۔ اور مکہ کا ہر فرد جانتا تھا کہ بنو سعد کے بعد مکمل اور بہترین زبان کہیں نہیں مل سکتی۔ اگر عبداللہ اپنے بچوں کو

بنو سعد کے ماحول میں پروان چڑھا سکے۔ تو ان کی زبان عرب بھر میں اپنا لوہا منوائے گی اور کون نہیں جانتا کہ مکہ کی سرداری بڑی حد تک فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کی محتاج ہوا کرتی ہے۔ بنو سعد کے خیموں میں گویا عرب کے سردار ڈھلتے تھے اور عبداللہ اپنے ہر بچے کو سردار کا رتبہ دلانا چاہتے تھے۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک وجہ یہ تھی کہ بنو سعد کے خیموں میں قریش مکہ کے اکثر بچے پروان چڑھتے تھے اور بچے کا بنو سعد کی نگہداشت میں چلے جانا خود اپنی ذات میں امارت اور فخر کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ قریش کا جو خاندان اپنے بچوں کی پرداخت کے لئے بنو سعد کی دایہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گویا غریب سمجھا جاتا تھا اور مکہ والے اسے اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتے تھے عبداللہ سردار قریش عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے اور سب سے پیارے صاحبزادے تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ تفاخر و ناز کی اس معمولی لیکن ضروری شرط کو پورا نہ کریں۔

لیکن وہ ابھی کم عمر تھے۔ تجارت گو آبائی پیشہ تھا اور گھر کا ماحول اکلِ حلال کے اس معزز ترین طریقے کی باتوں سے اکثر گونجا کرتا تھا۔ لیکن عبداللہ نے شادی سے پہلے اس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ عام قریشی نوجوانوں کی طرح تلوار بازی تیر اندازی، شاہسواری اور دوسرے جنگی فنون میں انہیں خاصی دسترس ہو گئی تھی لیکن تجارت کا عملاً تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ذہن دولت کمانے اور دولت کے ذریعہ عزت حاصل کرنے کی طرف ابھی پوری پختگی کے ساتھ مائل

نہیں ہوا تھا۔ اس لئے شادی کے وقت خود ابن عبدالمطلب کی مالی حالت کچھ ایسی تسلی بخش نہ تھی۔ لیکن بچے کی آمد آمد کا ذکر سن کر انہیں یکایک اپنی ذمہ داری کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اپنی محبوب بیوی کا کندھا پکڑ کر ہر صالح اور محنت مند نوجوان کی طرح مستقبل کے متعلق عظیم اور رنگین آرزوؤں اور امیدوں کے خواب بننے لگے تھے۔ اونٹوں کی قطاریں، اناج کے گودام، ریشمی کپڑوں کے ڈھیر، سونے چاندی کے پہاڑ اور سب سے بڑھ کر بنو سعد کی دایہ ـــ!

اور آمنہ بنت وہب نے آرزوؤں کے ان رنگین تار و پود کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اس طرح سمیٹ لیا تھا جیسے یہ خواب نہیں جو آنکھ کھلتے ہی غائب ہو جائیں گے۔ بلکہ ٹھوس، محسوس اور جاندار حقائق ہیں جنہیں مادی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جنہیں ہاتھوں سے چھوا جا سکتا ہے۔ اور جن سے شعور اور احساس کی ہر پور کو گدگدایا جا سکتا ہے۔

ان سب خیالوں کے حقیقی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس دن کے بعد عبداللہ پورے جوش اور پورے انہماک کے ساتھ ان آرزوؤں کی تکمیل کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ باغات کے مالکوں سے سودے ہوتے بہترین قسم کی کھجوریں خریدی جا رہی تھیں۔ شام کو جانے والے محفوظ ترین راستوں کے متعلق پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ قافلوں کے متعلق تحقیق کی جا رہی تھی اور قافلہ سالاروں کی بہادری، ذکاوت، راستے کی سوجھ بوجھ اور راستے میں پڑنے والے قبیلوں کے ساتھ تعلقات کے متعلق باتیں ہونے لگی تھیں۔ ان باتوں سے پورا گھر گونج اٹھا تھا۔ سردار عبدالمطلب اپنے بھتیجے کے اس عزم و انہماک

پر بڑے ہی مسرور تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حارث کے بعد عبداللہ خاندان عبدالمطلب کو مالی استحکام دے سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے خود قافلہ سالاروں کے ساتھ بات چیت کی۔ راستے میں آنے والے تمام قبیلوں کے متعلق تفصیل سے عبداللہ کو اطلاعات بہم پہنچائیں۔ انہیں بتایا کہ مکہ کی اقتصادیات کا تانا بانا انہیں حلیف قبائل کی وجہ سے مضبوط ہے اور مکہ اس لئے تجارت کے اعتبار سے حجاز کا سب سے بڑا شہر ہے کیونکہ اس کے حلیف دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور اس کے تجارتی قافلوں کو بدوؤں سے خطرے کی کوئی وجہ نہیں۔

عبداللہ کو ان باتوں کے متعلق تشویش تھی۔ عبداللہ تجارت کے لئے جا رہے تھے۔ لیکن آمنہ کے دل کی پوری دنیا اپنی دنیا کے سنوارنے کے لئے رخصت ہو رہی تھی ——— عارضی طور پر ——— لیکن یہ عارضی فراق بڑے احتمالات پیدا کر رہا تھا۔ آمنہ ان احتمالات کو سردار قریش کے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تعلقات کے ذریعہ دور کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے جب کبھی یہ بات چلتی وہ پاس ہوتیں اور سردار کا اعتماد، ان کی مسرت، حارث کے مشورے اور تجویزیں آمنہ بنت وہب کے دل کو مضبوط بنا دیتیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سرتاج کو اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے سفر پر بھیجنے کے لئے تیار ہو گئیں۔

لیکن موت اس طرح آ جائے گی ———!

خود آمنہ بنت وہب کے اپنے شہر یثرب میں اُن کی دنیا لُٹ جائے گی اور کوئی حلیف، کوئی ساتھی، کوئی رشتہ دار، کوئی عزیز، کوئی بھائی،

کوئی ماموں، کوئی دوست اس ناگہانی آفت سے آمنہ اور اُس کے شوہر کو نہ بچا سکے گا۔ یہ خیال کبھی بھولے سے بھی آمنہ کے ذہن میں نہیں آیا۔ وہ سردار قریش کی باتوں سے مسرور ہو گئی تھیں۔ حارث نے انہیں امیدوں کے مرغزاروں میں پہنچا دیا تھا۔ خود عبداللہ کے وعدوں نے انہیں اس دنیا سے اٹھا کر کسی حسین دنیا میں جا بٹھایا تھا اور وہ اسی دنیا میں امیدوں، آرزوؤں اور حسین سنہرے خوابوں کے تانے بانے سے اپنے مستقبل کی عمارت بناتی رہیں کہ ایک دن یکایک اسی غیر متوقع دشمن نے حملہ کر دیا۔

عربوں کے شب و روز تلوار کی دھار پر بسر ہوتے تھے۔ اس لئے بیوگی ان کی عورتوں کے لئے کوئی انوکھا تجربہ نہ تھا۔ اکثر عرب عورتیں اپنی زندگی میں کئی دفعہ بیوہ ہوتیں اور پھر سہاگن بن کر بیٹھ جاتیں۔ شوہر کے خاندان میں سے کسی سے بھی شادی ہو سکتی تھی۔ شوہر کا بھائی، بھتیجہ، ماموں، چچا حتیٰ کہ باپ ـــــ اپنے سوتیلے بیٹوں میں سے کوئی ایک یا کوئی جو اُسے قبول کرنے پر تیار ہو۔ اس طرح شوہر کی موت عام عرب عورت کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ عدت کی تھوڑی سی مدت بسر کر لینے کے بعد وہ نیا گھر بساتی، نئی دنیا بناتی اور نئے ماحول میں سمٹ کر بیٹھ جاتی۔

لیکن آمنہ بنت وہب ان سب سے مختلف تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے شدید جذباتی محبت کی تھی۔ انہوں نے اپنے نوجوان ساتھی کے ہر خواب، اُس کی ہر آرزو، اُس کی ہر تمنا کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے عبداللہ ابن عبدالمطلب کی وفات جنگجو قوم کی ایک عام عورت کے شوہر کی موت

نہ تھی۔ یہ آمنہ بنت وہب کے مستقبل کی موت تھی۔ اُن خوابوں پر بیوگی آئی تھی جن کو آمنہ نے رات کی نیندوں اور دن کے قرار کے لہو سے پالا تھا۔ اُن آرزوؤں نے آخری ہچکی لی تھی۔ جو خود آمنہ بنت وہب کی زندگی میں خونِ حیات بن کر دوڑ رہی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ چھوٹے حضور کی موجودگی بھی ذہن کو کسی لمحے یادوں سے خالی نہ ہونے دیتی تھی۔ کیونکہ چھوٹے حضور ہی وہ مرکز تھے۔ جن کے گرد آرزوؤں، خواہشوں، تمناؤں، حسرتوں، امیدوں اور خوابوں کے سنہرے تانے بانے بُنے گئے تھے۔ آپ ہی کی آمد نے ابن عبدالمطلب کو جوانی کے لاابالی پن سے نکال کر ذمہ داریوں کے احساسات سے ہمکنار کر دیا تھا۔ انہیں کے لئے وہ سب کچھ کرنا چاہتے تھے اور انہیں کو بہت کچھ بنانے کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی۔

آج جب کہ برکہ کے چھوٹے حضور نے زندگی کے ۲۱ دن پورے کر لئے تھے۔ آمنہ انہیں خیالات میں گم اپنے کمرے میں چھوٹے حضور کی پیڑھی کے پاس بیٹھی تھیں۔ برکہ نے سورج کی آنکھ کھلنے سے بہت پہلے زم زم کا پانی گرم کر کے چھوٹے حضور کو نہلا دیا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اور بڑے پیار بھرے انداز میں۔ مالکن حضور کے لئے بھی گرم پانی کر لیا گیا تھا اور نہانے کا انتظام کمرے ہی میں کر دیا گیا تھا۔ مالکن حضور نے کمرے میں غسل فرمایا تھا اور برکہ باہر دروازے پر متوحش اور منتظر کھڑی رہی تھیں۔ اس نے لاکھ کہا تھا کہ وہ خود مالکن کو نہلائے گی خوب مل مل کر ــــــ لیکن آمنہ بنت وہب ہر عرب

عورت سے مختلف تھیں ــــــ بہت ہی مختلف ــــــ! عام عورتیں تو سرِ عام
چشموں اور نالابوں میں اتر جاتے ہیں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتیں بلکہ اپنی برہنگیوں
کو عام مردوں کے سامنے اچھال دیتیں۔ اس امید پر کہ شاید کسی شاعر کی نظر پڑ
جائے اور اُن کا حسن شعر بن کر سارے عرب کی زبان پر گونجنے لگے۔ لیکن ان
سب کے برعکس آمنہ بنت وہب، کے انداز نرالے رہتے۔ خود برکہ شب و
روز خدمت میں مصروف رہنے کے باوجود آج تک ٹخنوں سے اُوپر نہ دیکھ
سکی تھی۔ اسے حسرت ہی رہی کہ وہ کسی دن اپنی مالکن کی کلائی یا گردن ہی دیکھ
لے۔

آج بھی یہی ہوا۔ برکہ باہر دروازے پر گوش برآواز کھڑی رہی۔ اس کا
دل دھڑک رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے کی گردان
جیسے اُس کے خون میں ٹھس گئی تھی اور جب مالکن حضور کی دھیمی میٹھی آواز
دروازے کی جھریوں میں سے چھن کر آئی۔

"آؤ برکہ۔"

تو برکہ کی جان میں جان آگئی۔

"حاضر ہوئی۔" اُس نے کہا اور آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھول کر
کمرے میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ مالکن کچھ کہیں برکہ کے ہاتھ مالکن حضور کے
کندھوں پر تھے۔ اُس نے تشویش سے امنڈتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مقدس
سراپا کو دیکھا۔ جو دُھلے ہوئے سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ گیلے لمبے بال ہزار در
ہزار الجھنوں میں ایک دوسرے سے لپٹے چوڑی پشت پر لٹک رہے تھے

جن کے بل کھاتے ہوئے سروں پر سے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ ٹپک ٹپک کر پلنگ پر پڑی ہوئی موٹی سفید چادر میں جذب ہو رہے تھے۔

مالکن حضور کی افسردہ نگاہوں نے کنیز کی متوحش آنکھوں کو دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کوئی ــــ" برکہ نے پھر دیکھا، "کوئی تکلیف تو نہیں حضور کے دشمنوں کو؟"

اور حیرت پیار کی بانہوں میں سمٹ کر کھو گئی۔ مالکن کی آنکھوں میں پیار کے سوتے کھل گئے۔ انہوں نے بڑی نرمی اور آہستگی سے اُس کے ہاتھ اپنے کندھوں پر سے ہٹائے اور پیار بھرے لہجے میں کہا،

"میں اتنی ہی کمزور ہو گئی ہوں۔"

"آپ کے دشمن ہوں گے کمزور ــــ آپ کیوں ہونے لگیں کمزور۔"

اور برکہ نے جھک کر پاپوش اٹھائی اور آگے بڑھا دی۔ سرخ سرخ پیر آہستگی سے بڑھے اور پاپوش نے انہیں اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔ برکہ ان قدموں سے لپٹ جانے کے لئے یکایک بیتاب ہو گئی۔ لیکن اُس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور صرف اُس سراپا کو مبہوت آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ مالکن حضور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی پلنگ کی طرف بڑھیں، ہاتھ اٹھا، کمبل ہٹایا گیا اور کمبل کی سلوٹیں بکھر بکھر گئیں۔ برکہ کے دل کے ارد گرد اطمینان رینگنے لگا اور وہ برتن اٹھانے، پانی نکالنے اور میلے کپڑوں کو بٹورنے میں لگ گئی۔

ان کاموں میں برکہ کو خاصا وقت لگ گیا ہوگا کیونکہ جب وہ ان سب کاموں سے فراغت پاکر ناشتے کا پوچھنے کے لئے مالکن حضور کے پاس گئی، تو مالکن اپنے بال گوندھ چکی تھیں اور اپنے اکلوتے کی پیڑھی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی پیٹھ پلنگ کی پٹی سے لگی تھی۔ ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپٹے ہوئے تھے اور وہ ٹکٹکی لگائے ایک طرف دیکھ رہی تھیں جیسے یہاں نہ ہوں۔

برکہ کے آجانے سے وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے خیالوں سے نکلیں۔ ہاتھ گھٹنوں پر سے ہٹ گئے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رگڑے اور برکہ کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں،

"صاف کردی جگہ ـــــ؟"

"جی ہاں ـــ ناشتہ لاؤں۔"

"ناشتہ ـــــ؟" انہوں نے سوچتی ہوئی سی آنکھوں سے برکہ کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی کیا نہیں ناشتہ۔"

"میں لے آتی ہوں ـــــ!" برکہ نے کہا اور چلی گئی۔ یہ خود فراموشی نئی نہ تھی۔ اس لئے برکہ نے اس پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

آمنہ بنت وہب اپنی جگہ پر سے اٹھیں۔ انہوں نے اچٹتی ہوئی سی نگاہ اپنے لال پر ڈالی جو کتان کی اوڑھنی کی اوٹ میں میٹھی نیند سو رہے تھے۔ آمنہ کے اٹھنے سے اُن کا پیر پیڑھی سے چھو گیا۔ دونوں مٹھیاں یکایک ہوا میں بلند ہوگئیں اور اوڑھنی اٹھ گئی۔ وہ سارے افسردہ خیالات جو مکڑی کے جالوں کی طرح بنت وہب کی زندگی پر تن رہے تھے یکایک کٹ گئے۔ وہ برق

کی سی تیزی سے پھر بیٹھ گئیں۔ کنان کی چادر اٹھا دی گئی اور بنت وہب نے دیکھا ننھا سا نچلا ہونٹ پچک گیا ہے، آنکھیں بند ہیں اور زرد زرد روئیں کھڑے ہیں۔ آمنہ نے اپنا ہاتھ چھوٹے سے سینے پر رکھ دیا۔ ہوا میں لہراتی لرزتی مٹھیاں ان دھیمی دھیمی چھوٹی چھوٹی تھپکیوں کے اثر سے پھر اپنی جگہ پر رکھ دی گئیں۔ پچکا ہوا ہونٹ اُبھر کر ہموار ہو گیا۔ زرد روئیں پھر بیٹھ گئے اور چہرے پر پھر وہی معصومیت کھیلنے لگی۔ بنت وہب نے آہستہ آہستہ اپنا پیر ہٹایا۔ اپنے لال کو محبت سے مخمور آنکھوں سے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئیں۔

یہ ننھا یتیم ——— عبداللہ اور آمنہ کے خوابوں کی یہ حسین تعبیر۔

آمنہ چاہتی تھیں، جھک جائیں اور بھنوؤں کے درمیان موم بتی کے شعلے جیسی سُرخ چمکتی ہوئی لکیر کو چُوم لیں لیکن جگا دینے کے خوف سے انہوں نے اپنے آپ پر جبر کیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے ننھے حضورؐ کے سراپا کا بوسہ لیا اور محبت سے اوڑھنی اڑھا دی۔

وہ آہستہ سے اٹھیں اور پلنگ پر چلی گئیں۔

لیکن وہ جالے جو یک دم کٹ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ پھر بننے لگے ننھے حضورؐ نے چونک کر آمنہ کے خیالات کی پگڈنڈیاں بدل دی تھیں۔ آمنہ ان پگڈنڈیوں پر ہوتی ہوئیں پھر اسی شاہراہ پر آگئیں اور وہی مہین باریک تار جو ریشم سے زیادہ نرم لیکن فولاد سے زیادہ مضبوط تھے۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر بلا کی تیزی اور شدت کے ساتھ ذہن میں آ کر تکلی کی طرح چلنے لگے۔ ابن عبدالمطلب کے سارے خواب چونک کر بیدار ہو گئے۔ خاص طور

پر اپنے اکلوتے کو بنو سعد کی پرداخت میں بھیجنے کی آرزو اژدھے کی طرح پھنکارتی ہوئی اٹھی اور پوری کائنات کو محیط ہوگئی۔

آمنہ کیا کریں ——؟

وہ آیا حضور کو کیسے کہہ دیں کہ وہ ان کے ان یتیم کو بنو سعد کے خیموں میں بھیج دیں ——؟

حارث مدد کریں گے لیکن آمنہ اس مدد کی بھیک کیسے مانگیں ——؟

عبداللہ نے ورثے میں چند بکریاں چھوڑی تھیں اور ایک کنیز اس اثاثے کے ساتھ آمنہ کیسے توقع کر سکتی تھیں کہ وہ بنو سعد والوں کی عورتوں کو خوش کر سکیں گی۔ قریش کے دوسرے گھرانے انہیں سونے چاندی سے مالا مال کر دیا کرتے ہیں۔ ریشمی کپڑوں کے ڈھیر دیتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی اونٹ یا دو چار بکریاں بھی دے دی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ تو ایک قریشی نے اپنا گھوڑا دے دیا تھا۔ ابھی پچھلے ہی سال کی بات ہے بنو سعد کی ایک عورت نے نفیل بن عبدالعزیٰ کے خاندان کے ایک بچے کو پالنے کے عوض پچاس تولے چاندی لی تھی۔

اتنی ناک چڑھی عورتوں کو آمنہ بنت وہب کیا دے کر خوش کریں گی؟ اور اگر محمدؐ بنو سعد کے خیموں میں نہ گئے۔ اگر اُن کی پرورش مکے کی گندی گلیوں میں ہوئی، تو اُن کی صحت، اُن کی زبان، اُن کے کردار میں وہ پختگی کیسے آئے گی۔ جس سے مرنے والے کے خواب پورے ہو سکیں۔ عبداللہ کی زوجہ کیا سوچے گی۔ کیا یہی کہ ادھر میں نے آنکھیں بند کیں اور میری بیوی جو

زندگی میں مجھے محبت کا اتنا یقین دلاتی تھی، مجھے بھول گئی۔ اُسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ میں نے اپنی ننھی سی امانت اُسے دی ہے اور اپنے خواب ورثے میں چھوڑے ہیں۔ میری بیوی نے میرے خوابوں کی تکمیل کے لئے انگلی تک نہ ہلائی۔

مگر کیسے پورے ہوں یہ خواب ـــــ؟ کس طرح تکمیل ہو ان آرزوؤں کی ـــــ؟

آمنہ پلنگ پر بیٹھ نہ سکیں۔ جیسے کسی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر لٹا دیا ہو۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے، بے دست و پائی کے آنسو۔ بیوہ اپنے سہاگ پر نہیں اپنی آرزوؤں کی شکست پر رو رہی تھی۔ اُسے اپنے آپ پر نہیں پوری دنیا پر غصہ آ رہا تھا جس میں پیدا ہونے والا ہر انسان خواب دیکھتا ہے لیکن اُن کی تکمیل کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اگر خوابوں کی تکمیل ناممکن ہے تو خالق عالم نے خواب کیوں بنائے اور انسانی ذہن کی تشکیل اس انداز میں کیوں کی کہ وہ خواب دیکھے اور حقائق سے دست و گریباں ہوتا رہے ـــــ؟

آمنہ اسی گہرے اتھاہ کنوئیں میں جھانک رہی تھیں کہ کمبل ہٹا اور برکہ شوربے میں توڑی ہوئی ٹکی کی روٹیوں کا گرم گرم پیالہ لے کر آ گئی۔

"ناشتہ مالکن حضور۔" برکہ کی آواز آمنہ کے خیالوں کی محرابوں میں گونجی اور محرابیں آنِ واحد میں تحلیل ہو کر رہ گئیں۔

"ہاں ـــــ!" آمنہ نے کہا۔

"ہڈیوں کی یخنی ہے۔ بڑی بیگم کا ارشاد تھا۔ آج آپ یخنی نوش فرمائیں"
بڑی بیگم سردار عبدالمطلب کی تیسری بیوی تھیں۔ جو عبداللہ کی والدہ
نہ ہونے کے باوجود آمنہ سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی
جاتی تھی کہ بڑی بیگم خود بنو کلب سے ہیں۔ انہوں نے خود کبھی اپنے خاندان کا
ذکر نہیں کیا لیکن قریش کی اکثر شاخوں کے مرد اُن کی عزت اس وجہ سے بھی
کیا کرتے تھے کہ وہ سردار قریش کی بیگم ہونے کے ساتھ ساتھ بنو کلب کی
چشم و چراغ ہیں۔

لیکن آمنہ بنت وہب کو اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔

"رکھ دو برکہ ——" انہوں نے فرمایا "کھا لوں گی"

"ٹھنڈا ہو جائے گا" برکہ نے کہا۔

"تم کہہ رہی تھیں بنو سعد کی کچھ عورتیں یہاں مکے میں آئی ہیں"

"جی ہاں —— میں دو ایک سے خود ملی ہوں۔ قریش کے اکثر بچوں کو ان
کے سپرد کیا جا چکا ہے"

"انہیں کسی نے نہیں بتایا کہ سردار عبداللہ ——" اور آمنہ خود بخود
یکایک خاموش ہو گئیں۔ چندے سکوت کے بعد بولیں،

"لاؤ شوربہ برکہ ——"

اگر بنت وہب یہ پہلے کہہ دیتیں تو برکہ کی رگوں میں خوشی کے ترانے
گونج جاتے۔ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ مالکن حضور شوربا کھانا نہیں چاہتیں بلکہ اپنے
غم اور یاس کو اس میں ڈبو دینا چاہتی ہیں۔ لیکن اس نے کوئی بات نہیں کی حرف

پیالہ بڑھادیا۔ آمنہ خاموشی سے پیالے کے کناروں پر انگلی پھیرتی رہیں۔
"اُن میں سے کوئی نہ کوئی ضرور آئے گی۔" برکہ نے بالآخر افسردگی سے کہا۔
"کن میں سے ــــــ؟"
"بنو سعد والیوں میں سے ــــــ!"
"کہاں ــــــ؟"
"یہاں چھوٹے حضور کو لے جانے کے لئے۔"
"لیکن برکہ ــــــ" بنت وہب کہتے کہتے رکیں۔ انہوں نے پیالے کو اٹھاکر اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ جیسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔
"چھوٹے حضور ــــــ یتیم ہیں۔"
"ایسا نہ کہیے مالکن۔"
وہ نہ جانے کیوں جھپاک سے پیڑھی کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ برق کی تیزی سے اٹھے۔ اُس نے کتان کی اوڑھنی اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسی طرح لپیٹے لپٹائے چھوٹے حضور کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ محمدؐ چونک کر بیدار ہو گئے۔ بلند چھوٹی سی پیشانی پر ننھی ننھی سلوٹیں جذب ہو کر رہ گئیں۔
"اوں اوں" کی ہلکی آواز سنائی دی۔ برکہ نے اُن کا منہ چوم لیا۔
"سیپ کا ایک موتی تو سب سے زیادہ قیمت پاتا ہے۔"
آمنہ برکہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
بنو سعد والوں کے پہلے قافلہ کو مکہ میں آئے تین دن گزر چکے تھے اور

اُن کے خیمے منیٰ کی تلہٹی میں نصب تھے۔

یہ جگہ موجودہ نسل کی یادوں سے بہت پہلے ــــــ شاید عظیم قصیٰ کے عہد میں ــــ بنو سعد والوں کے لئے مخصوص سی ہو گئی تھی۔ وہ ہر سال ایک خاص موسم میں آتے اور کچھ دنوں اسی جگہ پر اپنے خیمے نصب کیا کرتے تھے۔ یہ دستور اتنا پُرانا تھا کہ اس جگہ پر بنو سعد والوں کی اجارہ داری سی قائم ہو گئی تھی۔ اور مخصوص مہینے کے مخصوص ایّام میں کوئی دوسرا قافلہ اس جگہ پر نہ اُترتا تھا۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ منیٰ کی تلہٹی عام گزرگاہ کے بالکل قریب ہونے کے علاوہ مکّہ کے قریباً ہر گھر کی کھڑکی کے عین سامنے واقع تھی۔ بوقبیس کی ڈھلوانوں پر بنے ہوئے مکّہ کے مکانات کی ہر کھڑکی اسی طرف کھلتی تھی اور آپ کسی بھی مکان کی کسی کھڑکی میں کھڑے ہو جایئے یہ جگہ آپ کی نگاہوں کی زد میں ہو گی۔ بنو سعد والے قریشی بچوں کی پرداخت کا ذمہ لینے کا کاروبار کرتے تھے اور اس کاروبار کا تقاضا یہ تھا کہ جوں ہی وہ مکّے میں پہنچیں مکّے کے گھر میں اُن کی آمد کی خبر ہو جائے۔ یہ جگہ اس مقصد کو بڑی حد تک پورا کر دیتی تھی۔ جہاں اُن کے خیمے لگے ہر گھر کو پتہ چل گیا کہ بنو سعد والے آ گئے۔

لیکن اس دفعہ بنو سعد کے خیموں میں وہ پہلی سی چہل پہل نہ تھی۔ ان کے دراز گوشوں کی پسلیاں پھولے ہوئے پیٹوں میں سے دکھائی دے رہی تھیں اور ان کی بکریاں ٹیالی ٹیالی اور کمزور سوکھی سڑی نظر آتی تھیں۔ صرف یہی نہیں خود بنو سعد والوں کے چہروں پر بھی وہ رنگت نہ تھی جو بادیہ کی کھلی خشک ہوا اور

سے پیدا ہو جایا کرتی ہے اور جس کی سورج کی تپش میں جلی ہوئی سیاہیوں میں سے سرخیاں چھن چھن کر اور پھوٹ پھوٹ کر دیکھنے والے کی نگاہوں میں چبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس دفعہ ان کے چہرے نسبتاً زیادہ سیاہ تھے ان کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں وہ چمک بہت کم تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اہل مکہ میں امیار خوری سے پیدا ہونے والی فربہی کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

مکی نوجوان اکثر اس تالاب پر جمع ہو جایا کرتے تھے جو تامیٹی ہی میں ذرا فاصلے پر قدرتی چٹانوں سے گھر جانے کی وجہ سے بن گیا تھا اور جس میں برسات کا پانی جمع ہو جایا کرتا تھا۔ بنو سعد کی نوجوان چنچل چھوکریاں خیمے ایستادہ کرنے کے بعد صراحیاں اور مشکیزے کندھوں پر اٹھائے اس تالاب کا شیر گرم اور کچھ کچھ کھاری پانی بھرنے کے لئے آجایا کرتی تھیں۔ ہر مکی نوجوان اس حقیقت سے واقف تھا کہ یہ صحرا زادیاں عصمت و عفت کی دیویاں ہیں اور ان کی طرف نگاہِ غلط ڈالنا یا کسی بھی سفلی جذبے کے ساتھ دیکھنا اپنی موت کو آواز دینا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ اپنے قبیلے کو امداد کے لئے نہیں پکارتیں بلکہ ان کے ہاتھ برق کی سی تیزی کے ساتھ خنجروں سے مسلح ہو جاتے ہیں اور سینوں میں ڈوب کر ابھرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ اس لئے تالاب پر آنے والے کسی مکی نوجوان کے ذہن میں ان صحرا زادیوں کے متعلق کبھی کوئی خوش فہمی پیدا نہیں ہوئی اور وہ کبھی اس غرض سے تالاب پر نہیں آئے۔ اس کے علاوہ ان آنے والیوں میں سے اکثر ان میں کی دودھ بہنیں ہوتی تھیں اور گو اس

انتہائی نازک اور مقدس رشتے کا احترام ان کے نزدیک ضروری نہ تھا لیکن تعلوں میں چھپے ہوئے نیچے اس رشتے کا احترام کروانے میں ہمیشہ بیباک ثابت ہوئے تھے اسلئے اس کا احترام کیا جاتا تھا لیکن پاس پر کئی نوجوان اس تالاب پر جمع ہو جایا کرتے تھے اور نوجوان صحرا زادیوں سے نوک جھونک ہونے لگتی۔ یہ نوجوان بادیہ بنو سعد کی کھلی آزاد ہواؤں میں ڈھلی ہوئی زبان کو اپنے کانوں سے سننا چاہتے تھے چست، حسین اور رنگین فقرے نئے ڈھلے ہوئے سکوں کی طرح کھنکتے اور کئی نوجوان جنہیں شعر و ادب کا چسکا گھٹی میں ملتا تھا اور جو فصاحت اور بلاغت پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر ہمیشہ تیار ہوا کرتے تھے۔ ان نغمات آفریں فقروں کا گھنٹوں مزا لیا کرتے تھے۔

لیکن اس دفعہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ بنو سعد کی ٹکسال کے یہ سکے بھی کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق کئی نوجوانوں کے غول کے غول تالاب پر پہنچے۔ بنو سعد کی کنواری اور بیاہی ہوئی بیبیاں حسب دستور اپنے لچکتے اور ڈھلکتے کندھوں پر چھاگلیں اور مشکیزے لے کر بھی آئیں۔ نوجوانوں نے فقرے بازی کی ابتدا بھی کی اور اس امید پر گوش بر آواز بھی ہوئے کہ ابھی کسی چنچل زبان سے کوئی مچلتا ہوا فقرہ آئے گا اور وہ اسے اپنی نجی محفلوں میں لے جائیں گے کہ مدتوں تک اس سے محظوظ ہوا جائے۔ لیکن ایک افسردہ خاموشی کے سوا ان فقروں کا کوئی جواب نہیں آیا۔ بنات بادیہ پانی بھرنے میں مشغول رہیں اور جب پانی بھر لیا گیا تو چھاگلیں اٹھالی گئیں، مشکیزے کندھے پر لاد لئے گئے اور قدم کنکروں کو روندتے ہوئے چلنے لگے۔

نوجوانوں کو سخت حیرت ہوئی تھی۔ اُن کے ذہن اس توڑ میں لگ گئے تھے اور آخر مکہ کے کوچہ و بازار میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ اس سال بنو سعد میں شدید قحط پڑا ہے جس کی وجہ سے بادیہ نشینوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جنہوں نے ان کی روحوں کو افسردہ کر دیا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ اس قحط کی وجہ سے ان کے دراز گوش اور بکریاں بہت بڑی تعداد میں مر گئیں اور قبیلے کی اقتصادی حالت سخت ابتر ہو گئی ہے۔

یہ خبر سُن کر مکّہ کے نوجوانوں کو تو پژمردہ ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس سال وہ بنو سعد کی ٹکسالی زبان کے نئے نئے فقرے اور لطیفے نہ سُن سکیں گے۔ لیکن اس خبر نے اُن گھرانوں میں بھی تشویش کی لہر دوڑا دی جو اپنے بچّوں کو بنو سعد والوں کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ کئی بچے مہینوں سے اس قلفلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور والدین بنو سعد والوں کی آمد پر بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کے بچّے کو صحیح دودھ، صحیح تربیت اور صحیح آب و ہوا میسر آجائے گی۔ لیکن قحط کی خبر نے اکثر لوگوں کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیا تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اب بنو سعد والے پہلے سے کئی گنا زیادہ معاوضہ مانگیں گے اور قحط کی وجہ سے جو نقصانات انہیں برداشت کرنے پڑے ہیں، بچّوں کے والدین سے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

اور یہ تشویش غلط بھی نہ تھی۔ بنو سعد والوں نے واقعی معاوضہ مانگتے وقت کسی کا لحاظ نہیں کیا تھا۔ اتنی بڑی بڑی رقمیں سنائیں کہ قریشیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دراز گوش اور بکریاں مانگیں۔ سونا مانگا اور درہم و دینار مانگے

کپڑے اور گندم مانگی۔ اتنا کچھ مانگ لیا کہ اگر قریشی یہ سب کچھ دینے پر آمادہ ہو جاتے تو قحط کی ساری بربادیاں بنو سعد کے صحراؤں سے نکل کر چند قریشی گھرانوں میں سمٹ آتیں۔ اس لئے یہ مطالبات نہیں مانے گئے۔ ایک کے بعد دوسری دودھ پلانے والی آئی اور کسی کے ساتھ سودا طے نہ ہو سکا۔ تین دن اسی بیچ میں گزر گئے اور اسی کی وجہ سے بنو سعد والوں کے خیمے پہل پہل تو درکنار زندگی کے معمولی نشانوں تک سے خالی معلوم ہونے لگے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان میں زندہ انسان نہیں کچھ بُت ہیں جو کسی پراسرار کل کی مدد سے گھوم رہے ہیں۔ بچے رونا بھول گئے تھے۔ بکریاں منمناتی تھیں لیکن کتنی بے جان آواز تھی، گویا شکوہ کر رہی ہوں۔

یہاں تک کہ بنو سعد والوں کا الاؤ بڑی جلدی سرد پڑ جاتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ ادھر مکّہ کی طویل لرزتی سرمئی شام رات کی تاریکیوں میں سمٹ کر آسمان سے ہٹی اور بنو سعد کے خیموں کے وسط میں الاؤ جلنے لگا۔ جھڑبیری کی خشک جھاڑیاں اور ببول کی سوکھی شاخیں خیموں کی بلندی سے بھی دو ہاتھ اونچے لپکتے ہوئے شعلوں میں چٹخنے لگیں۔ لمبے لمبے گیت شروع ہوئے اور مکّہ کی ساکن فضاؤں پر نقرئی اور طلائی چادر کی طرح جھوم جھوم کر چھانے لگے قہقہوں کی دلفریب آوازوں سے مکّے کی ساکن راتوں میں زندگی کے فوارے اُچھلنے لگے۔ ناچ ہونے لگے اور مکّے کے جوان ان آزاد سرمستیوں سے لطف اٹھانے کے لئے رات گئے تک ان خیموں کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ کہاں آج یہ عالم تھا کہ خیموں کے وسط میں آگ تو جل رہی تھی لیکن اس کے شعلے اتنے

مدھم، اتنے کمزور تھے کہ ارد گرد بیٹھے ہوئے ان کی گرمی تک کو محسوس نہیں کرتے تھے ——— عورتیں موجود تھیں۔ ان کی گود میں ان کے اپنے بچے خشک چھاتیوں سے آخری قطرہ چوس لینے کے بعد بلک بلک کر سو گئے تھے۔ جوان اور ادھیڑ بھی موجود تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ کوئی بات ہوتی بھی تو دھیمی افسردہ آواز میں جو صرف سُن لی جاتی اور خاصے غور و فکر کے بعد اگر مجبوراً جواب کی ضرورت محسوس بھی ہوتی تو اسے مختصر ترین لفظوں میں یوں اٹکا دیا جاتا گویا لفظوں سے پیچھا چھڑایا جا رہا ہے گویا یہ انتہائی طور پر تکلیف دہ مہمان تھے جنہیں بڑی مشکلوں سے رخصت کیا جا سکا ہے۔

لیکن اس افسردہ خاموشی، گفتار سے اس شعوری اجتناب کی دبیز سیاہ دل کی تہہ میں کتنے شور کتنے ہنگامے پوشیدہ تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر قحط کی زہرہ گدازیوں پر غور کر رہے تھے۔ سب ایک ہی موضوع پر سوچ رہے تھے اور مسلسل تین دن سے ایک ہی موضوع ذہن کی ہر محراب میں ایک قیامت آفریں شور بن کر گونج رہا تھا۔ اگر انہوں نے اپنے مطالبات میں کمی نہ کی اور اگر قریشیوں نے انہیں ماننے سے انکار پر اصرار کیا تو کیا ہو گا ——؟ اس سوال کا جواب ہر شخص کے ذہن میں آتا تھا اور وہ اس جواب سے دل ہی دل میں پناہ مانگ کر فوراً یہ سوچنے لگتا تھا کہ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ مطالبات کو کم کر دیا جائے اور کسی بھی قیمت پر قریشی بچوں کو لے لیا جائے۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے ——!

یہ منطق سبھی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ اسے معقول سمجھ

رہے تھے اور ہر دل کا ایک نہ ایک گوشہ ایسا تھا جو اس خیال کو اپنی پوری قوت سے اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر کے والے اس قحط کا بدلہ انہیں کیوں دیں جو دیوتاؤں کا قہر بن کر ان پر ٹوٹا۔ بادل نہیں آئے، بارش نہیں ہوئی زمین گھاس کے معاملے میں کنجوس بن گئی۔ اس نے اپنے سینے پر کھڑے ہوئے درختوں پر سے پتوں تک کو سبز نہیں ہونے دیا۔ مکّے کے یہودیوں سے زیادہ سنگدل بن گئی۔ ان کی اپنی زمین جو ہر سال مہربان ماں کی طرح ان کی پرورش کیا کرتی تھی اور اپنی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے ان کے سامنے اُگل دیا کرتی تھی

——— ان سب باتوں میں قریشیوں کا کیا قصور تھا ——— !

لیکن یہ ساری باتیں، الفاظ کا یہ بے پایاں سمندر اُگلے کون ——— ؟ کون کہہ دے ان سب باتوں کو اور قبیلے میں نکّو بن جائے۔ آخر یہ معمولی بات نہ تھی قبیلے نے بادیہ بنو سعد سے چلتے وقت یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس دفعہ زیادہ معاوضہ لیا جائے گا۔ اس فیصلے میں سبھی شامل تھے۔ اب اس پر سے پلٹ جانے کی ہمت کون کرے ——— ؟

اس لئے سب اپنے دلوں کے اس عظیم فلک گیر غوغے کو خاموشی اور گفتار سے شعوری اجتناب کے دبیز پردوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور جب کسی زبان سے کوئی سوال اچھل پڑتا تو سب اپنی اپنی جگہ پر سہم جاتے مبادا ان کے دل کے وہ گوشے بے نقاب ہو جائیں جس میں انہوں نے یہ خیالات چھپا رکھے ہیں۔ اس لئے وہ کم سے کم لفظوں میں اپنا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کرتے اور پھر مصنوعی خاموشی کی اوٹ میں دبک جاتے۔

اس طرح کافی وقت گزر گیا اور آخر ایک نے اپنے دل کے طوفانوں کو دبانے کا دوسرا راستہ سوچا۔

"حرث ہوتا تو کچھ لطف رہتا۔"

"ہاں!" دوسرے نے کہا، "دو چار لطیفے ضرور ہو جاتے۔"

"بڑا خوش باش آدمی ہے۔"

"کون نہیں ہے۔" ایک عورت بولی، "قبیلہ بنو سعد کی خوش باشی تو حجاز بھر میں مشہور ہے۔"

"لیکن حرث قبیلے کی ناک ہے۔"

"اسی لئے شاید قحط کا سب سے زیادہ اثر انہی پر ہوا ہے۔"

اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ کیونکہ جس پگڈنڈی کے ذریعہ فرار کی ترکیب سوچی تھی وہ یکایک اسی راستے سے آن ملی تھی جس کے مسافر سب تھے لیکن جس سے سب ڈر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ایک کونے سے ایک دوسری عورت کی آواز تھرائی۔

"حلیمہ بھی تو نہیں آئی۔"

سب ہنس دینا چاہتے تھے لیکن مسکرانے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

"آ کر آ جائیں۔" جواب لڑھکا دیا گیا۔

لیکن با ایں ہمہ سب محسوس کر رہے تھے کہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر بے کھٹکے چلا جا سکتا ہے۔ اس لئے الاؤ کے ارد گرد کچھ زندگی سی دکھائی

دینے لگی۔

"اس کے دراز گوش کی حالت نہیں دیکھی تھی ـــــ بالکل ہڈیوں کا پنجر ہو کر رہ گیا تھا۔"

"قدم اٹھانے مشکل تھے۔"

"حرث بے چارے نے تو کئی دفعہ آنے کا ارادہ کیا تھا۔ دراز گوش ہی کی حالت سفر کے قابل نہ تھی۔"

"مگر وہ رک نہیں سکتے۔ آئیں گے ضرور۔"

"حلیمہ کیسے رہ سکتی ہیں ـــــ وہ ضرور آئیں گی۔"

"اگر رہ جائیں تو کھائیں گے کہاں سے۔"

"میرا خیال ہے حلیمہ کسی نہ کسی طرح چل پڑی ہوں گی۔"

"لیکن اب تک انہیں آجانا چاہیئے تھا۔"

"شاید کل تک آجائیں۔"

"پیدل ہی آنا پڑے گا۔"

"باؤلی ہوئی ہو ـــــ اتنا لمبا سفر اور وہ بھی صحرا کا ـــــ پیدل ہوا ہے کبھی۔"

اور بات دراز گوش پر پلٹ آئی۔ یہ واقعہ تھا حرث نے دراز گوش پر خیمے وغیرہ لادنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن ایک مدت سے صحیح چارہ نہ ملنے کی وجہ سے جانور بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ حرث کی بکریوں پر سب سے زیادہ آفت آئی تھی۔ جتنی اچھی اچھی بکریاں تھیں موت

کا شکار ہو گئیں۔ جو بچیں اُن کے دُودھ سوکھ گئے۔ اور دُودھ آتا بھی کہاں سے گھاس کا ایک ڈنٹھل انہیں میسّر نہیں آ سکا۔

خشک سالی ہی بڑی شدید تھی ۔۔۔۔ قحط ہی بڑا ظالم تھا۔

اور پگڈنڈی پھر اسی خطرناک راستے کی طرف مڑتی محسوس ہوئی۔

"نیند آ گئی"۔ ایک نے اس خطرناک راستے کو دُور سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا اور لمبی جماہی لیتے ہوئے کہا،

سب جانتے تھے کہ نیند نہیں آئی لیکن سب محسوس کر رہے تھے کہ اگر قبیلے کے پہلے فیصلے کو برقرار رکھنا اور اس پر مزید بحث سے بچنا ہے تو مجلس برخواست کرنا ہی ہو گی۔ اس لئے اس فقرے نے گویا جادو کر دیا۔ سب فوراً اٹھ گئے اور نیند کا استقبال کرنے کے لئے اپنے اپنے خیموں کی طرف چل دیئے۔

بنو سعد کے خیموں پر گزشتہ راتوں کی طرح ایک دفعہ پھر ایک ہنگامہ پرور سناٹا چھا گیا۔

لیکن کوئی نہیں سویا۔ سب خیموں کی چھت کی درزوں میں سے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی آنکھ مچولی دیکھتے رہے کہ یکایک "یا معشر بنو سعد" کی پُر زور آواز سنائی دی۔

"حرث ۔۔۔۔" یہ لفظ ہر ایک ہونٹ پر اُبھرا اور چند لمحوں میں خیموں کے پردے بے ترتیبی کے ساتھ اٹھے اور لوگ باہر آ کر دیکھنے لگے۔

دور گہرے اندھیرے میں سائے لرزتے ہوئے سے قریب آ رہے

تھے۔۔۔!

"حرث" ایک نے پکار کر کہا۔

"ہاں!" اندھیرے میں ملفوف سائے نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا اور لوگ بھاگ پڑے خیمے سے کچھ ہی دور ایک دراز گوش ہانپ رہا تھا جس کی تھوتھنی میں سے زبان لٹک رہی تھی گلے کا پٹہ ایک نوجوان کے ہاتھ میں تھا۔

استقبال اور خوش آمدید کا ایک غلغلہ بلند ہوا اور وہ خیمہ گاہ جس پر گہرا سکوت گویا لپیٹ دیا گیا تھا یکایک چہچہانے لگی جیسے جنگل میں صبح کی پہلی کرن در آئی ہو اور اس نے زندگی کو بیدار کر دیا ہو۔

اونگھتے ہوئے الاؤ میں جھڑبیری کی جھاڑیاں پھینکی گئیں جن کی پتلی سوکھی شاخوں پر ننھے شعلے شریر بچوں کی طرح ناچتے ہوئے چڑھنے لگے اور پھر یکایک مل کر ایک بڑے شعلے میں بدل گئے۔ شریر ننھے شعلوں کا ہجوم وحدت بن کر چمک اٹھا۔

سُرخ شعلے گرد آلود چہرے پر ناچنے لگے۔

"حلیمہ کہاں ہے۔۔؟" ایک سوال ہوا اور حرث پیچھے ہٹ گیا۔ سُرخ روشنی ایک تھکے ہوئے مسکراتے چہرے کی بلائیں لینے لگی، جو دراز گوش پر لدے ہوئے پرانے بید مجنوں کے ڈھیر کی اوٹ سے دکھائی دے رہا تھا۔ ایک حسین جوان، تندرست لیکن تھکا ہوا، گرد سے اٹا ہوا، کلفتوں میں دبا ہوا چہرہ جس کی سنجیدہ ملاحتیں گرد، تھکن اور کلفت کے پردے چیر کر ظاہر ہو رہی تھی۔

سوالات کی بوچھاڑ بھادوں کے چھینٹے کی طرح پڑی اور دراز گوش چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ حرث مردوں کی ٹولی میں اپنے سفر کے حالات سنا تا رہا اور اُسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کب اور کس وقت دراز گوش پر سے سامان اتار لیا گیا۔ خیمہ نصب ہو گیا۔ اس کی پھپیاں قمیہ اور انیسہ مزے سے بیٹھ کر ستو کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

حرث کا سفر خاصہ دشوار تھا۔ راستے میں ایک آدھ بار اُسے صحرائی بگولوں نے بھی گھیر لیا تھا۔ لیکن وہ بھربھری چٹانوں کی اوٹ میں بچتا ہوا نکل آیا۔ لیکن اصل دقت دراز گوش کی وجہ سے ہوئی۔ اس سے ایک قدم نہ اٹھتا تھا یوں معلوم ہوتا تھا دراز گوش نہیں کوئی بھاری سل ہے جسے حرث کو ریت پر کھینچنا پڑ رہا ہے۔ حرث کو بڑا افسوس تھا کہ اُس نے کئی دفعہ غصے میں آ کر دراز گوش کو بڑی بے رحمی سے پیٹا ــــــ دراز گوش بیچارے کا کیا قصور۔ اُسے کھانے کو نہ ملے تو وہ چلے کیسے۔ لیکن حرث کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ اُسے مکے میں پہنچنا ہی تھا۔ نہ آتا تو خود کہاں سے کھاتا اور دراز گوش کو کہاں سے کھلاتا۔

قریب قریب یہی تجربہ سب کو ہوا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ ان لوگوں کے دراز گوش حرث سے زیادہ طاقتور تھے۔ اس لئے یہ بھاری سل نہیں بنے جنہیں ریت پر کھینچنا پڑا ہو۔ سفر آسانی سے کٹ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سفر میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے سنایا جاتا اور اس انہماک سے سنا جاتا۔ لیکن حرث کا انداز بیان قبیلہ بنو سعد کے ہر بچے میں مشہور تھا۔ زبان کی پاکیزگی اگر عرب بھر میں قبیلہ بنو سعد کا طغرائے امتیاز تھی تو حرث اور حلیمہ اس لحاظ سے قبیلہ بنو سعد کے

دل و دماغ تھے۔ خاص طور پر حرث ــــ وہ تو ہر بات کو داستان بنا دیتا تھا اور اس خوبصورتی سے بیان کرتا تھا کہ سننے والے مبہوت بیٹھے سنا کرتے۔

یہی حرث آج اپنے سفر کے حالات سنا رہا تھا اور قبیلے والے دم بخود بیٹھے سُن رہے تھے۔ حیرت، سنسنی، مزاح، تذبذب ہر چیز اُس کے بیان میں تھی جادوگر حرث نے روزمرّہ کے تجربوں کو اپنی طلاقتِ زبان سے حیران کُن داستان بنا دیا تھا۔

اور یہ سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہتا کیوں کہ تین دنوں کی موت جیسی خاموشی کے بعد خیموں میں زندگی نے قدم رکھا تھا۔ ایک ہی سمت، ایک ہی انداز اور ایک ہی موضوع پر مسلسل تین دنوں تک سوچ سوچ کر سب لوگ اکتا چکے تھے۔ حرث نے ان اکتاہٹوں کے بند توڑ دیئے۔ اور زندگی پھر اچھلتی کودتی رواں دواں ہو گئی۔ ممکن تھا کسی طرف سے گانے کی فرمائش ہو جاتی لیکن ایک تو آنے والے تھکے ہوئے تھے اور دوسرے حلیمہ نے قبیلے کی عورتوں سے کچھ ایسی باتیں سُن لی تھیں جو کافی پریشان کن تھیں۔ وہ مزید باہر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی اور چاہتی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے خیمے میں چلی آئے۔

"حرث تم تھکے نہیں ــــ" حلیمہ نے بالآخر بیچ میں ٹوکا۔

"بہت ــــ"

"بات ختم ہو لینے دو حلیمہ۔" سننے والوں میں سے ایک نے مزا کرکرا ہوتا دیکھ کر کہا۔

"ان کی باتیں کبھی ختم ہوئی بھی ہیں ــــ اب سو جانا چاہیئے ــــ صبح صبح

نورکے ترٹکے اساف اور نائلہ کے استھان پر طواف کو جاتا ہے۔"

"بس تم چلو ——— میں آیا۔"

اور حرث نے بات پھر سے چھیڑ دی۔ واقعہ کا ربط کچھ کچھ بننے لگا تھا کہ حرث کی نگاہیں حلیمہ پر جا لگیں جو عبداللہ کو گود میں لئے الاؤ کے اس پار کھڑی تھی۔ حرث نے شعلوں کی اوٹ میں حلیمہ کو دیکھا اور بولا "بس ——— یوں" اور جلدی جلدی بات ختم کر دی۔

سفر کا خاتمہ کیونکہ جلدی ہوا تھا اس لئے سننے والے خاصے بدمزہ ہوئے لیکن میاں بیوی کی تھکن کا سب کو احساس تھا اس لئے چپ ہو گئے۔

حلیمہ نے عبداللہ کو احتیاط سے انیسہ اور شمیہ کے پہلو میں لٹا دیا جو خوب پیٹ بھر کر ستو کھا لینے کے بعد پورے سکون کے ساتھ سو گئی تھیں۔

"کچھ سنا ———" اس نے حرث کی طرف دیکھے بغیر کہا جو سر کا رومال اتار کر اس پر سے گرد جھاڑ رہا تھا۔

"کیا ———؟"

"قریشی ہمارے مطالبات نہیں مانتے ——— کہتے ہیں معاوضہ بہت زیادہ ہے۔"

حرث کی بے توجہی ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹی اور وہ سراپا توجہ بن گیا۔

"کیا ہوا ———؟" اس نے پوچھا۔

"قریشی کہتے ہیں کہ بچوں کی پرداخت کا جو معاوضہ بنو سعد والے طلب کر رہے ہیں اتنا ہے کہ اس سے دو دو لونڈیاں خریدی جا سکتی ہیں۔"

"اور بنو سعد کے خیموں کی ہوا بھی ——— اور وہ زبان بھی جو ہم لوگ ان کے حلقوم میں اتارتے اور انہیں سردار بنا دیتے ہیں ——— بڑے احسان ناشناس ہیں یہ قریش۔"

"دینے والا لینے والے کی نظروں میں ہمیشہ احسان ناشناس ہی ہوا کرتا ہے۔"

"کیا مطلب ——؟"

"مطلب یہ کہ باپ دادا کے وقتوں سے جو معاوضہ چلا آرہا ہے آخر اس میں یک دم اتنا اضافہ کون قبول کرے گا۔"

"لیکن باپ دادا کے وقتوں میں ایسا قحط کب آیا تھا۔"

"اس سے قریشیوں کو کیا سروکار ——؟ اپنی خوشی سے کوئی دیدے یہ اور بات ہے۔ ہم مطالبہ تو نہیں کر سکتے۔"

"مگر یہ قبیلے کا فیصلہ ہے ——— معاوضہ وہی ہوگا جو ہم مانگیں گے۔"

"ورنہ ——!"

"ورنہ قریشی بچے بنو سعد کی زبان اور صحت مند آب و ہوا سے محروم کر دیئے جائیں گے۔"

"اور بنو سعد والے؟"

"بنو سعد والوں کی بلا سے۔"

"گویا دوسرا قحط۔"

"مطلب کیا ہے ——— کہنا کیا چاہتی ہو؟"

کھائیں گے کہاں سے ـــــ بہت نہیں تھوڑا سہی کچھ تو ملے گا۔؟"

"پھر وہی بات ـــــ! درازگوش نہیں چل سکتا۔ مگر حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں اسے چلنا ہی ہوگا ورنہ کھائیں گے کہاں سے۔ بہتر پہنچ گئے مکّہ میں۔ قریشی ہمارا مطالبہ نہیں مانتے۔ ان کا کہا ہمیں ماننا ہوگا۔ بہت نہیں تھوڑا سہی۔ الخ۔"

اور حرث کا جوش یک دم ٹوٹ گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا پھر آپ ہی آپ دھیمے انداز میں بولا،

"ٹھیک تو ہے۔ واقعی ـــــ یہ ضد گویا ـــــ دوسرے قحط کو دعوت دینے والی بات ہے ـــــ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں نے کہہ دیا ہے سب کو۔" حلیمہ سعدیہ کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ "بالکل صاف کوئی لے نہ لے ہیں مگر سے بچہ ضرور لے کر جاؤں گی۔ قبیلے والے اگر غلط فیصلے کرتے ہیں تو اُن میں ترمیم بھی ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ہو سکتی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس قسم کے فیصلے نہیں ہونے چاہئیں۔ بہر حال تم نے بہت اچھا کیا جو سب کے کان کھول دیئے۔ صبح اساف اور نائلہ کے استھانوں کا طواف کرنے کے بعد تم چلی جانا۔"

"طواف بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"توبہ کرو ـــــ یعنی واہ ـــــ آپ تو بالکل دیوتاؤں کی منکر ہو گئیں۔ ہوش میں۔ جانتی ہو دونوں اللہ میاں کی بیٹیاں ہیں ـــــ اور بڑی گڑبڑ والی بات ہے انہیں ناراض کرنا۔ صبح سب سے پہلا کام طواف ـــــ اور پھر!"

"بہر حال دیکھا جائے گا۔ اب سو جاؤ۔"

"سو جاؤں ــــ؟"

"ہاں۔"

"سچ ــــ؟"

"نہیں تو کیا ــــ؟"

"لیجئے ــــ سو گئے۔" حرث دونوں بچیوں کے پاس لیٹ گیا۔ اُس نے کمبل ٹھیک کر کے بچیوں پر اوڑھا دیا۔ شفقت سے دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"کتنے ظالم ہوتے ہیں بعض لوگ ــــ" اُس نے دوسرا موضوع چھیڑا۔ "ــــ اپنی چاند سی بچیوں کو کس طرح زندہ گاڑ سکتے ہیں۔"

لیکن حلیمہ کی طرف سے کوئی رسید نہیں ملتی سا اس لئے حرث کو مجبوراً آنکھیں بند کر لینا پڑیں۔

۵

حرث دن بھر مکہ کے بازار میں گھومتا رہا۔

صبح نائلہ اور اساف کے استھانوں پر خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے تو صفا پر چڑھنا پڑا جس کی چوٹی پر اساف کا استھان تھا۔ حرث اور علیمہ کا خیال تھا کہ اس استھان کے طواف میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔ لیکن ان کی توقعات کے برعکس استھان کا کاہن دیوی کے کئی خارق عادت اعمال کے بیان کی ہیچ در پیچ بھول بھلیوں میں ان دونوں کو لے نکلا اور کئی ایسی باتیں سنانے پر اصرار کرتا رہا جو حرث اور علیمہ نے کئی بار سنی تھیں۔ لیکن کاہن کو نہ جانے کیوں ایک عجیب طرح کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو یہ سمجھانے پر مصر معلوم ہوتا تھا کہ اساف دیوی کعبے کی تمام دیویوں سے زیادہ طاقتور ہے۔ یہاں تک کہ ہبل دیوتا بھی اس کا کہا رد نہیں کرتے اور اساف باقاعدہ ہبل کی محبوبہ کا درجہ رکھتی ہے۔

حلیمہ دل ہی دل میں سخت پیچ وتاب کھا رہی تھیں۔ انہیں یہ کھٹکا رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ قبیلے کی دوسری عورتیں جو اُن سے تین دن قبل مکہ میں آچکی تھیں اور --- ان دونوں دیویوں کے استھانوں پر چڑھاوے چڑھا کر اپنے آپ کو مکہ میں چلنے پھرنے اور تجارت کرنے کا اہل بنا چکی تھیں اب یہاں موجود نہ تھیں بلکہ آبادی میں بچوں کی تلاش میں جا چکی تھیں۔ ایسا نہ ہو کہ حلیمہ یہیں اساف کے معبد میں بیٹھی بھجن گاتی رہیں اور قبیلے کی دوسری عورتیں سارے بچوں کو بٹور لیں۔ اس لئے حلیمہ بار بار حرث کی طرف پریشان سوالیہ نگاہوں سے دیکھتیں۔ حرث مصنوعی خضوع وخشوع کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی کاہن کی آنکھ بچا کر کنکھیوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا اور ہلکے سے کندھا جھٹک کر ظاہر کر دیتا کہ بے چین وہ بھی ہے لیکن مجبور ہے۔

اور کاہن ان زائرین کی ان تمام مجبوریوں اور اکتاہٹوں سے بے نیاز اساف دیوی کے گن گاتا رہا اور ان دونوں پر یہ بات واضح کرتا رہا کہ اساف کے بعد بس ہبل ہی ہیں جو اللہ کے مقرب خاص ہیں اور جس طرح محبوبہ کا کہا کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس طرح اساف کا کہا ہبل رد نہیں کر سکتے۔ اس لئے اساف کو زیادہ سے زیادہ نذرانہ پیش ہونا چاہیئے۔

اور جب یہ ساری تقریر کئی گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ختم ہوئی تو حلیمہ اور حرث نے بڑے عجز و نیاز کے ساتھ جھڑبیریوں کے کچھ بیر جو وہ آتی دفعہ راستے میں سے توڑ لائے تھے اور چند خشک کھجوریں نذر کر دیں۔ اس حقیر نذرانے کو دیکھ کر کاہن کو بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس نے

فوراً ہی اپنی تقریر ختم کر دی اور ایک خشک مصنوعی مسکراہٹ جو اس کے پیٹنے کا سبب سے بڑا نشان تھی ہونٹوں پر لا کر انہیں رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

دونوں جلدی سے استھان میں سے نکلے۔

"کاہن کی ساری محنت ضائع گئی" باہر نکلتے ہی حرث نے ہنس کر کہا ــــــ "رگیں پھلا کر بولتے بولتے بیچارے کا منہ سرخ ہو گیا تھا"

"مگر مجھے اب شہر میں جانا چاہئے" حلیمہ نے کہا "قبیلے کی ساری عورتیں جا چکی ہیں"

"اور نائلہ ــــــ"

"وہ پھر سہی کسی وقت"

"ایسا غضب نہ کر بیٹھنا کہیں" حرث سچ مچ ڈر گیا تھا "ان دیوی دیوتاؤں کا کچھ ٹھیک نہیں، پل بھر میں روٹھ جاتے ہیں اور منائے نہیں مانتے"

"ــــــ آؤ" اس نے حلیمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مگر بڑی دیر ہو گئی ہے" حلیمہ بادل ناخواستہ چل دیں۔

دونوں تیزی سے مروہ کی گھاٹیوں پر دوڑ کر چڑھنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں نائلہ کے استھان پر پہنچ گئے۔

حلیمہ نے زیر لب اپنے شوہر سے کہا،

"یہاں بھی خاصہ وقت لگے گا"

"تم آؤ تو ــــــ" حرث نے کہا۔

اور دونوں استھان کے اردگرد رکھے ہوئے پتھروں پر چڑھ گئے۔

نائلہ کا بے ڈول بُت بھُربھرے پتھر کے ایک چھوٹے سے چبوترے پر رکھا تھا۔ حلیمہ اور حرث نے بیک وقت دیکھ لیا کاہن موجود نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف سمجھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔

لیکن ابھی وہ پوری طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ رعد کی کڑک جیسی ایک آواز سنائی دی اور نائلہ کا پجاری بلند کڑکتی ہوئی آواز میں نائلہ کی تعریف میں شعر پڑھتا ہوا بُت کے عقب میں سے نکل آیا۔

حلیمہ نے گھبرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ اب نائلہ کی توصیف کے پل باندھے جائیں گے۔ یہاں تک کہ سورج نصف النہار تک آ جائے گا۔

حرث حلیمہ کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے جھٹ اپنے جھول میں ہاتھ ڈالا۔ جھڑبیریوں کے بیروں کی ایک مٹھی استھان پر رکھ دی۔ خشک کھجوروں کے چار چھ دانے رکھے اور ہاتھ جوڑ کر بڑی لجاجت سے کہا،

"نائلہ دیوی ــــــ تو جانتی ہے ہمارے ریگستان کو خشک سالی اور قحط نے برباد کر دیا ہے۔ ہم اس سے زیادہ تیرے حضور میں کچھ نذر نہیں کر سکتے۔"

اور دونوں نے محسوس کیا پجاری کی آواز میں گرجتی ہوئی رعد جو ابھی ابھی اُن کے سروں پر گرج رہی تھی یکایک دور چلی گئی ہے۔ اب یہ آواز جیسے اُفق

پر سے سنائی دے رہی تھی۔ پجاری نے جلدی جلدی ایک بھجن پڑھا۔ نذرانے کی قبولیت کا مژدہ سنایا اور زائرین کو جانے کی اجازت دے دی۔

دونوں تیزی سے چلتے ہوئے نیچے اترے۔ حرث نے استھان سے نکلتے ہی حلیمہ سے اپنی ذکاوت و ذہانت کی داد وصول کر لی تھی کہ اس نے کس طرح نائلہ کے پجاری کو مختصر تقریر کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ حلیمہ نے یہ داد بخش کر دی تھی اور دونوں تیزی سے مروہ سے اترے، صفا پر آئے اور پھر اس کی گھاٹیوں پر سے اترتے ہوئے حرم پاک کے قریب پہنچ گئے۔

یہاں سے دونوں کے راستے مختلف تھے۔ حرث کو بازار میں گھومنے کے لیئے جانا تھا اور حلیمہ کو ان قریشی گھروں کا پتہ کرنا تھا جن میں بچے ہوئے ہیں اور جو بنو سعد میں تربیت پانے کے لیئے بنو سعد والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیئے دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ حلیمہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دن ڈھلتے ہی خیموں میں واپس آ جائیں گی۔ انہیں امید تھی کہ کوئی نہ کوئی بچہ ضرور مل جائے گا اور شام کو اچھے کھانے میسر آئیں گے۔

چنانچہ حرث دن بھر مکہ کے بازاروں میں گھومتا رہا۔ اس کے اس گھومنے کو بالکل بے مقصد نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تقریباً ہر دکان پر کھڑا ہوا اور اس نے اکثر اشیاء کو نکلوایا، الٹ پلٹ کر دیکھا، خوب اچھی طرح سے پرکھا ان کے بھاؤ پوچھے، کم کرانے کی کوشش کی۔ اکثر اوقات کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن پھر ناک بھوں چڑھا کر یوں ظاہر کیا کہ اسے مال سرے سے پسند ہی نہیں ہے اور دکان پر سے ہٹ گیا۔ لیکن اس نے ان میں سے اکثر چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ

کر لیا تھا۔ ان کے بھاؤ بھی یاد کر لئے تھے۔ اور اپنے آپ سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ آج جب حلیمہ کسی قریشی بچے کو اپنی رضاعت میں لے کر آئے گی اور اپنے ساتھ درہم و دینار کی تھیلیاں لائے گی تو وہ ان چیزوں کو ضرور خریدیگا شیمہ اور انیسہ کے لئے اوڑھنیاں ——— شام کی بنی ہوئی اوڑھنیاں جو شفق کی طرح باریک شفاف اور رنگین تھیں۔ عبداللہ کے لئے کمبل، اپنے لئے سر کا رومال اور ریشمی رسی ——— ان سب چیزوں کی حرث کو سخت ضرورت تھی۔ حلیمہ کے لئے تو پورا لباس چاہیئے تھا کیونکہ اس کا لباس پرانا ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس پر ٹکلیاں لگاتے لگاتے حلیمہ عاجز آگئی تھی۔ حرث کو ابو کحافہ کی دکان پر ایک بڑا ہی خوبصورت کپڑا دکھائی دیا تھا۔ گو یہ ریشمی نہ تھا لیکن ریشم کی طرح ملائم اور بو قبیس کی بھربھری چٹانوں کی طرح خستہ لیکن مضبوط تھا۔ سائے میں سرمے کی طرح سیاہ لیکن دھوپ میں نیلے، لال اور زرد رنگ کی قوس قزح معلوم ہوتا تھا، جو بارش کے بعد آسمان کی محرابوں کو محیط ہو جاتی ہے۔ یہ جب ہلتا ہو تو اس میں سے عجیب طرح کی سرسراتی موسیقی پیدا ہوتی تھی اور حرث کے تصور نے ایک ہی جست میں اس لباس کو حلیمہ کے جسم پر دیکھ لیا۔ جب حلیمہ اسے پہن کر چلے گی تو اس کے پیروں کی جھانجھنوں کی آواز کے ساتھ یہ سرسراتی موسیقی مل کر بادیہ بنو سعد کی آزاد ہواؤں میں رنگ و نغمہ کی کیسی کیسی بہاریں بکھیر دے گی۔ حرث کو یوں معلوم ہونے لگا کہ حلیمہ نغمہ و نور کے سانچوں میں ڈھلا ہوا شعر بن کر اس کے تصور کے پردوں پر محو خرام ہو گئی ہیں۔

اس لیے اس کپڑے کے مول تول میں حرث نے پہلے سے کہیں زیادہ وقت صرف کیا۔ وہ چاہتا تو شاید اسی طرح ناک چڑھا کر اور اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر کے دکان پر سے چلا جاتا لیکن اس دفعہ وہ یہ اظہار نہ کر سکا۔ اُس نے ابو کحافہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس وقت اُس کے پاس دام نہیں ہیں لیکن آج اُس کی بیوی قریشی گھرانوں میں گئی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی گا ——— وہ ضرور یہ کپڑا لے گا۔ اور ادھیڑ عمر ابو کحافہ نے اپنے نوعمر لڑکے ابو بکر سے کہا تھا کہ وہ اس کپڑے کو کل تک کے لیے بادیہ نشین کی امانت کے طور پر رکھ لے۔

جب حرث اس دکان سے چلا ہے تو ابو کحافہ کی آواز اُس کے کانوں میں جھانجوں کی طرح بج رہی تھی اور وہ ان الفاظ کی موسیقی میں جھومتا ہوا کئی دکانیں طے کر گیا تھا ——— پھلوں کی دکانیں جن پر بڑے بڑے تربوز رکھے تھے، سبزیوں کی دکانیں، روغنوں کی دکانیں اور انواع و اقسام کی مٹھائیوں کی دکانیں ——— جو قدم قدم پر سجی ہوئی تھیں۔ اور یکایک حرث نے اپنے آپ کو یہ سوچتا ہوا پایا کہ حجاز جیسے سنگلاخ اور بے آب و گیاہ صحرا میں یہ چھوٹا سا شہر، جو برسات میں پہاڑوں پر سے بلا کی تیزی کے ساتھ بہنے والے بارانی پانی کی زد میں آجاتا ہے۔ جہاں پینے کا پانی بمشکل میسر آتا ہے۔ جہاں دور دور سبزی کا نشان دکھائی نہیں دیتا یہ طرح طرح کی نعمتیں کیسے جمع ہو جاتی ہیں ———؟ اور پھر وہ خود ہی اپنے اس خیال پر ہنس دیا۔ یہ سوال ہر سال اس کے ذہن میں آتا اور وہ خود ہی طرح طرح کی تاویلوں میں اس سوال کا جواب دے دیا کرتا۔ کیوں نہ آج وہ

کسی بکّی سے پوچھ لے اور ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا،

"رضاعی بھائی ——— رضاعی بھائی۔"

حرث نے پلٹ کر دیکھا۔ دور سے ایک لبادہ تیز چمکتی دھوپ میں لہراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ لبادے کے دونوں بازو کھلے تھے۔ چہرہ اور سر رومال کے سایوں میں دھندلا سا ہو کر اپنی جزئیات کھو بیٹھا تھا۔ حرث نے غور سے دیکھا، یادوں پر کچھ دھندلے دھندلے نقوش ابھرے اور یکایک اُسے یاد آگیا۔ اس کی دونوں باہیں پھیل گئیں۔ "یا اخی" کا نعرہ بلند ہوا اور مکّے کے بازار کے عین وسط میں دو نوجوان گلے سے مل گئے۔ راہ چلتے کمہار نے بہت کوشش کی کہ اپنے گدھے کو روک لے لیکن وہ پھر بھی حرث کو چھوتا ہوا نکل گیا۔

گرمجوشی اور تپاک کی وہی باتیں ہوئیں جو اکثر ہوتی ہیں اور نوآمد قریشی نے فوراً حرث کو اپنی مہمانی قبول کرنے کی دعوت دے دی۔ اس پر اصرار کیا اور انکار کی ساری کوششوں کو اپنے اصرار کی شدت سے دبا دینے کے لئے حرث کا ہاتھ پکڑا اور ایک دکان کی طرف کھینچ کر لے گیا، جہاں اونٹ کے تکّے بھونے جا رہے تھے۔

حرث بالعموم تکلف کا عادی نہ تھا۔ اگر اُسے بھوک ہوتی تو وہ کبھی انکار نہ کرتا لیکن وہ ابھی ابھی تربوز سے پیاس اور بھوک مٹا چکا تھا اس لئے انکار کرتا رہا۔ وہ تو قریشی کی ہٹ تھی جو اُسے دکان تک لے گئی۔ یہی وجہ تھی کہ ان تکّوں کا اُسے کچھ ایسا لطف نہیں آیا تاہم اُسے معلوم تھا کہ اس دکان کا

شہرہ صرف مکّے ہی میں نہیں نواح کی بستیوں تک میں گونجتا ہے۔ خاص طور پر اس کے قومی کلال خانے کی مصالحہ دار شراب ان نکّوں کے ساتھ مل کر جو لطف دیتی تھی وہ دُور دُور تک مشہور ہو گیا تھا اور لوگ اس لطف کو اپنے کام و دہن میں سمیٹ لینے کے لئے دُور دُور سے آیا کرتے تھے۔ اس لئے حرث نے یہاں بھی اپنے دل سے عہد کیا کہ وہ حلیمہ کو یہ نکّے ضرور کھلائے گا انیسہ اور شمیہ کو بھی ——!

اور اسی طرح پورا دن گزر گیا۔ یہاں تک کہ بوقبیس کے بڑھتے سایوں نے مکّہ کو اپنی ٹھنڈک کوں بھری آغوش میں سمیٹنا شروع کر دیا۔

حرث کو یقین تھا کہ حلیمہ اب خیمہ گاہ میں آ چکی ہو گی۔ کہیں نہ کہیں کوئی کام مل ہی گیا ہو گا اُسے۔ اور اس کا محنتانہ اگر بہت ہی کم ملے گا تو کم از کم —— خیر —— کچھ نہ کچھ تو طے ہو گا۔ چار چھ برس نہ سہی ایک دو موسم تو اطمینان اور فراغت کے سائے گزر جائیں گے۔ پھر کوئی نہ کوئی اور سبب پیدا ہو جائے گا بارش بھی شاید ہو جائے۔ بادیہ کی خشک پہاڑیوں پر گھاس اُگے گی۔ بکریاں تر و تازہ ہو جائیں گے اور دُودھ کی نہریں بہہ نکلیں گی۔ پھر انہیں کسی قسم کی احتیاج نہ ہو گی۔ دُودھ، گوشت، اُون —— اگر حرث کو یہ سب چیزیں حسبِ ضرورت مل جائیں تو وہ کسی بات کو خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ پھر اُسے مکّے میں آنے اور قریشی بچّوں کو اپنے یہاں لے جا کر اپنے بچّوں کے دُودھ میں شریک کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

حرث انہیں خیالات میں جھومتا خیمہ گاہ کی طرف تیزی سے بڑھتا

چلا گیا اور ابھی غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری گرد آلود کرنیں پوتھیس کی چوٹیوں پر مہتابیاں چھوڑ رہی تھیں کہ وہ خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔

او معبود ــــ !

کتنی رونق تھی خیمہ گاہ میں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کوئی میلہ سا لگا ہوا ہے خیموں کے آگے بندھی ہوئی بکریاں اپنی چھوٹی چھوٹی دُمیں ہلا کر تازہ گھاس لُو نخلستانوں سے لائی ہوئی سبز ٹہنیوں پر سے پتے کُترا رہی تھیں۔ تقریباً ہر خیمے میں سے کسی ننھے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پورے خیمہ گاہ میں بچوں کے رونے اور بڑوں کے زور زور سے بھرپور پھیپھڑوں کے ساتھ خوشی سے بولنے کی آوازیں شہنائیوں کی طرح بجتی معلوم ہوتی تھیں۔ حرث کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی خیمہ گاہ میں نہیں آیا۔ یہاں تو آج سورج کے نکلنے کے بہت بعد تک موت کی سی مردنی مسلط تھی۔ اس کے ہر خیمے کے دروازے پر بندھی ہوئی دس دس پانچ پانچ بکریاں بھوک کی سہمی ہوئی آوازوں میں ممنا رہی تھیں اور آنے جانے والوں کو یوں دیکھ رہی تھیں گویا اُن کی آنکھیں نہیں بھیک کے کشکول ہیں جنہیں خیرات کے لئے انہوں نے کھول کر پھیلا رکھا ہے دراز گوش گردن زمین تک کھینچے خشک ٹہنیوں کو سونگھ اور چاٹ رہے تھے۔ اور خیموں کے بچے جیسے دم بخود ہو گئے ہوں۔ اور اب یہاں کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ زندگی کا ایک سیلاب تھا جو یکدم سارے بند توڑ کر بہ نکلا تھا۔

یہ وہ خیمہ گاہ کیسے ہو سکتی ہے ــ ؟

لیکن حرث کو یقین تھا کہ یہ انہیں کی خیمہ گاہ ہے۔ بلند آواز سے فلاں

چیز لاؤ ـــــ فلاں رکھو، فلاں اٹھاؤ" کا حکم سنانے والی آوازیں اُس کی جانی پہچانی تھیں۔ اس لیئے یہ خیمہ گاہ اسی کی ہو سکتی ہے اور اُسے یقین تھا کہ اُس کا اپنا خیمہ اس زندگی سے بھرپور خیمہ گاہ کا سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ زندہ حصّہ ہوگا ـــــ!

وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا، دوسرے خیموں سے بچتا، طنابوں پر چھلانگتا ـــــ دراز گوشوں اور بکریوں کو ہٹاتا، کتراتا، بچتا، پچھلی قطار کی طرف چلا اور سامنے کا خیمہ گزر کر یکایک اپنے خیمے کے سامنے آکر دم بخود رک گیا۔

کتنی مختلف، کتنی ناقابل یقین اور کتنی عجیب تھی اس کے خیمے کی فضا ـــــ! حرث اپنی آنکھیں بند کر لینا چاہتا تھا تاکہ وہ اس فضا کو نہ دیکھے۔ وہ اپنے کان بند کر لینا چاہتا تھا کہ یہ آوازیں اُس کے کانوں میں نہ آئیں۔

اس کی بکریاں خیمے کے باہر بندھی تھیں۔ اُن کے پیٹ اسی طرح ٹھکے ہوئے تھے اور اُن کی پسلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دراز گوش اسی طرح مسکین صورت بنائے مٹر مٹر اپنی میلی گندی آنکھیں جھپک رہا تھا۔ البتہ فرق اتنا تھا کہ بکریاں صبح سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ منمنا رہی تھیں اور رسیاں تڑا کر اُن خیموں کی طرف بھاگ جانا چاہتی تھیں جہاں سے انہیں ہری گھاس اور سبز پتّوں کی سوندھی سوندھی جاں نواز خوشبو آ رہی تھی۔ سُمیہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لکڑی کا جھنجھنا تھا جسے وہ بار بار بجا کر عبداللہ کو بہکانے اور بہلانے کی کوشش کر رہی تھی جو بُری طرح رو رہا تھا۔

"ابا" شمیہ نے حرث کو دیکھا۔ اُس کے ہونٹ ہنسنے کے لئے کھلے لیکن اُس کے منہ سے چیخ سی نکلی اور معصوم ہونٹ اور پورا چہرہ فرطِ گریہ کو دبانے کے لئے دبا، سکڑا، بھنچا اور پھر بھرپور آنسوؤں میں پگھل گیا۔ شمیہ بے حال ہو کر رونے لگی۔

حرث بڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑھ نہیں سکتا تھا۔ یہاں سے الٹا گھوم کر اس دلخراش منظر سے منزلوں دور چلا جانا چاہتا تھا لیکن نہ جا سکا۔ وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا، زمین میں گڑ جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ان سب خواہشوں میں سے کوئی ایک خواہش بھی پوری نہ کر سکا اور وہیں جیسے گڑ کر رہ گیا۔ شمیہ اور عبداللہ کے رونے کی آواز اُسے کسی کنوئیں میں سے سنائی دے رہی تھی۔

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک اُس کے ذہن پر حاوی نہ رہ سکی۔ انیسہ نے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ کر جیسے اس کے خون میں برقی رویں دوڑا دی تھیں۔ وہ تیزی سے جھکا۔ انیسہ اُس کی گود میں تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے عبداللہ کو لے لیا۔ تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا اور شمیہ اُس سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ چاہتا تھا کہ کچھ تو کہہ دے۔ شمیہ کو، عبداللہ کو، انیسہ کو، حلیمہ کو، اپنے آپ کو، گالی دے دے، کچھ کہنے کے لئے ـــــ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اور آہستہ آہستہ اُس کی قوتیں سمٹنے لگیں، جیسے ٹوٹے ٹکڑے آپس میں جڑتے ہیں۔ شمیہ کا رونا ہلکا ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف ناک کے راستے رو رہی

تھی۔ عبداللہ نہ جانے کیوں چپ ہو گیا تھا۔

حرث کی روح کے یہ سارے ٹکڑے ایک ایک کر کے جڑتے گئے اور خاصی دیر کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک ثابت اور مکمل رُوح کا مالک ہے۔

"کیا ہوا پگلی۔۔؟" اُس نے بالآخر اپنے آپ کو کہتے سنا۔ "رو کیوں رہی ہے۔۔؟"

"اماں نہیں آئی۔ ہم سب کو بھوک لگی ہے۔" یہ الفاظ شمیہ نے کہے تھے لیکن حرث کو شک تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ یہ الفاظ خود اُس نے کہے ہیں جیسے اُس کی رُوح اب پہلی دفعہ بولی ہے۔

"واہ!" اُس نے جیسے اپنے آپ کو جواب دیا۔ "اس میں کون سی بات ہے۔ لیجئے ابھی ہو جاتا ہے بھوک کا علاج۔ چلو خیمے میں۔"

اور تینوں خیمے میں آ گئے۔

ستوؤں کا تھیلا بانس کے ساتھ بندھا تھا۔ حرث نے اُسے اتارا، اُسے جھاڑا۔ چار چٹکی ستو ہر کونے اور ہر پردے کو جھاڑنے کے بعد نکلے۔ حرث کو اپنے پیٹ پر غصہ آنے لگا۔ اُس میں تربوز بھی تھے اور اونٹ کے گوشت کے تکے بھی۔ شراب بھی تھی اور جھڑ بیریوں کے بیر اور کھجوریں بھی اور اس کے نیچے ۔۔۔!

وہ زیادہ دیر تک اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دے سکا۔ اُس نے جلدی سے چھاگل اٹھائی۔

"یہ تو رہے ستو" اور اُس نے اپنے تھیلے میں ہاتھ مارا۔ اُسے امید تھی اس میں سے کچھ نہ کچھ کھجوریں ضرور نکلیں گی جو دونوں بیویوں اور خود اس کی اپنی دست برد سے بچ رہی ہوں گی اور اُس کی امید غلط ثابت نہیں ہوئی۔ گہرے بھورے رنگ کی چمکتی ہوئی چکنی چکنی کئی کھجوریں تھیلے میں سے نکل پڑیں۔

"اور یہ رہیں کھجوریں۔ دودھ بھی آیا جاتا ہے۔ آپ لوگ بس یہاں میرا انتظار کریں۔ عبداللہ کو میں یہاں لٹا دوں۔"

اُس نے عبداللہ کو لٹایا اور ایک چھلانگ میں خیمے سے باہر نکل گیا۔

حرث جانتا تھا مسلسل کئی دنوں کی بھوک پیاس کی وجہ سے بکریوں کے تھن خشک ہو گئے ہیں اور اُن سے دودھ کی توقع غلط ہے لیکن وہ پھر بھی محض اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے باہر نکل آیا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری بکری کو بہلایا، پھسلایا، زبردستی روکا، دودھ اتارنے کی کوشش کی، مارا، کھینچا، گالیاں دیں، سبھی کچھ کیا اور یہ بات غلط نہیں، بڑی محنت کے بعد اس نے تھوڑا سا دودھ حاصل بھی کر لیا۔ یہ بکری کے بچوں کا حصہ تھا، حرث خوب جانتا تھا لیکن بکری کے بچے ٹھہر نہیں سکتے کیا؟

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ تاریکیوں میں سمٹنے لگے تھے۔ جب حرث کے بچوں نے آسمان تک پر چمکنے والے پہلے ستارے کی نظریں بچا کر پورا دن فاقہ کرنے کے بعد دودھ میں بھگوئے ہوئے ستو کھائے اور پھر ماں کا انتظار کرنے لگے۔

اور جب آسمان پر ستاروں کی بھرپور فصل اُگ آئی۔ بنو سعد کے خیموں

کا وہ مشہور الاؤ جو چند دنوں سے کچھ دھیما پڑ گیا تھا خیموں سے اونچے اٹھتے ہوئے شعلوں کے ذریعہ مکّی نوجوانوں کو دعوت دینے لگا تو حرث نے یکایک دیکھا حلیمہ سعدیہ اندھیرے سے اُبھر کر شعلوں کی سُرخ ناچتی ہوئی روشنی میں آئی ہے، تیزی سے بڑھی ہے اور خیمے کی اوٹ میں ہو گئی ہے۔

خیمے کی عورتیں اپنے مردوں کو شراب تقسیم کر رہی تھیں۔ آگ پر گوشت بھُونا جا رہا تھا۔ قہقہے، اشعار اور چُست فقرے ساون بھادوں کی جھڑی کی طرح برس رہے تھے۔

حرث ان سب کو چھوڑ کر اپنے خیمے کی طرف لپکا۔ دوسری طرف سے حلیمہ آ رہی تھی۔ حرث نے دیکھا اور اُسے اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا حلیمہ کے قدم سستی سے اٹھ رہے تھے۔ وہ ایسی تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی گویا بادِ صرصر کا مقابلہ کر کے آ رہی ہو۔ نگے بیر دل کی دھول نے جھانجوں کی آواز کو مدھم کر دیا تھا۔

سارے سوال جیسے حرث کے ذہن پر سے کسی نے پونچھ دیئے اب ان کے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ حلیمہ نے بھی کچھ نہیں کہا۔ گویا اُس نے حرث کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ اُسی طرح تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ حرث بھی خیمے میں داخل ہو گیا۔ حلیمہ بیٹھ گئی، کہنی گھٹنوں پر اور ہاتھ ماتھے پر رکھ لیا۔ حرث خیمے کے بانس کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ باہر سے گانے، فحش مذاق اور بلند آہنگ قہقہوں کی آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے دور بو قبیس کے اُس طرف سے آ رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد حلیمہ نے اپنا ہاتھ ماتھے پر سے

ہٹایا اور پیر پر کی گرد ہاتھوں سے جھاڑتے ہوئے تھکی ہوئی نحیف آواز میں بولیں۔

"بچوں نے کچھ کھا لیا؟"

"ہاں ـــــ" حرث نے کہا، "کچھ ستو تھیلے میں سے جھاڑ لئے تھے

ـــــ اور تم نے ـــــ؟"

"ہاں ـــــ"

"کہاں سے؟"

"جہاں سے مل گیا ـــــ!"

"کیا مل گیا تھا ـــــ؟" حرث حلیمہ کے پاس بیٹھ گیا۔

"کھانے کو ـــــ!"

"مگر کیا ـــــ؟"

"اونٹنی کا دودھ۔"

حرث خاموش ہو گیا۔ پھر یکایک اٹھا اور پانی پینے کے لئے چھاگل کی طرف بڑھا لیکن رک گیا۔

"اور تم ـــــ؟" حلیمہ نے پوچھا۔

"وہ مل گئے تھے ـــــ رضاعی بھائی!"

"پھر ـــــ؟"

"خوب سیر ہو کر کھایا ـــــ اونہہ ـــــ!" اس نے ہاتھ جھٹک دیا

ـــــ "کہہ رہا تھا دیوی کو ناراض مت کرو۔"

"میں نے کیا کہہ دیا تمہاری دیوی کو؟"

"کہنے کی کیا حاجت ہے، وہ تو دلوں کے حال جان جاتی ہیں۔"

"اُونہہ ـــــ کاہنوں کی باتیں۔"

"پھر وہی۔"

"جان جاتیں تو آج بچے بھوکے سوتے۔ تم بھوکے ہوتے، میں بھوکی ہوتی۔ دلوں کی باتیں جانیں گے یہ بے ڈول پتھر۔" اور حلیمہ نے حقارت سے تھوک دیا۔

"مگر اور تو سب کو مل گیا ہے کام۔"

"وہی ہوا ہے جس سے میں ڈرتی تھی ـــ تم دیوی جی کے قدموں سے لپٹے رہے اور اُدھر جتنے بچے تھے سب کے یہاں یہ سب پہنچ گئیں۔ میں جہاں بھی گئی سودا ہو چکا تھا ـــــ"

"پھر ـــــ؟"

"پھر جاؤ اپنی اساف اور نائلہ سے کہو یا کرو اس کاہن کے پیروں پر ناک جس کی تقریر ہی ختم نہیں ہوتی تھی۔"

"مگر اب ہوگا کیا ـــــ؟"

"فاقہ ـــــ اور کیا ـــــ؟ بڑے آئے تھے دیوی کے سگے بن کر۔"

"لیکن کوئی تو بچہ ہوگا۔"

"کوئی نہیں ہے ـــــ!"

"ایک بھی ـــــ؟"

"ہمیں کیا دس بیس چاہییں ——!"

"میرا مطلب ہے۔ ایسا بھی کیا غضب ہو گیا ہے۔ ہمارے بچّے کہاں جائیں گے؟"

"ایک ہے بچّہ ——!"

"سچ!"

"ہاں"

"کون ——؟"

"محمدؐ ——!"

"محمدؐ —— ؟" حرث کے ذہن میں قریشیوں کا پورا شجرہ پھر گیا۔ —— "عجیب نام ہے۔"

"ہاں عجیب ہی ہے۔ وہ مل سکتا ہے اگر چاہو تو ——؟"

"لیکن ہے کون ——؟"

"سردارِ قریش عبدالمطلب کا پوتا۔ مکّہ کے سب سے بڑے تاجر حارث بن عبدالمطلب کا بھتیجہ۔ جس کے پیدا ہونے کی خوشی میں اُس کے بڑے چچا نے ایک کنیز آزاد کر دی تھی۔"

"ارے واہ ——" حرث یکدم خوشی سے چہکنے لگا۔ جیسے اُسے یہ نعمت عظمیٰ مل ہی تو گئی تھی "تو لے کیوں نہیں آئیں، اس سے زیادہ تمہیں اور چاہیے کیا تھا حلیمہ۔ قریشیوں کا سردار تمہارے خیمے میں آ جاتا۔ اس سے بڑھ کر ہماری خوش قسمتی اور کیا تھی۔"

"بکتے جاؤ ــــ اور کچھ کہہ لو"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ـــ تم نے کیوں نہ لیا۔ کچھ بھی کر لیتیں۔"

"تمہارا خیال ہے حلیمہ سعدیہ کے سوا بنو سعد کی سب عورتیں احمق ہیں۔"

"یعنی ــــ یعنی مطلب۔"

"مطلب یہ کہ یہ مجھ سے پہلے پہنچی تھیں۔ یہ کیوں نہ لے آئیں۔"

"تو کیا سردار ــــ کیا نام لیا بھلا سا۔ بہر حال سردارِ قریش گھر میں پرورش کریں گے پوتے کی۔"

"نہیں۔"

"تو پھر ــــ پہیلیاں کیوں بُجھا رہی ہو جی۔"

"محمد یتیم ہے ــــــ!"

"کیا ــــ؟" حرث یکدم چیخ پڑا۔ "یتیم ــــــ!"

"ہاں۔" حلیمہ نے نرم آواز میں کہا۔ "ولادت سے پہلے یتیم ہو گئے تھے۔"

"ارے ارے۔" حرث یکدم خاموش ہو گیا۔ جیسے اُس کی رگوں سے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔ پھر چند لمحوں کے بعد بولا،

"پھر اب ــــ؟"

"بتا تو دیا ــــ فاقہ۔"

"میرا مطلب ہے تم سردارِ قریش سے ملی تو ہو گی۔"

"کیا فائدہ تھا۔"

"تو تم اُن کے گھر نہیں گئیں؟"

"اونہوں ـــــ کیا فائدہ تھا۔"

"میرا مطلب تھا اتنے بڑے دادا کا پوتا اور اتنے بڑے چچا کا بھتیجا ہے، مل لینے میں کیا حرج تھا۔"

"ورثے میں کچھ بکریاں اور ایک کنیز ملی ہے اتنے بڑے دادا کے پوتے کو۔"

"بس!"

"اور کیا ـــــ بالکل نو عمر تھے عبداللہ۔"

"عبداللہ کون ـــــ؟"

"اُن کے والد ـــــ۔"

"اوہ اچھا۔" حرث پھر خاموش ہو گیا اور چند سکوت کے بعد بولا، "تم تو گویا گئی ہی نہیں سرے سے۔ بالکل ہی نہیں گئیں۔ قطعاً جسے کہتے ہیں۔"

"نہیں بابا ـــــ سو جاؤ اب۔"

"ہاں ـــــ ٹھیک ہے ـــــ"

کمبل سر پر لیے اور دونوں لیٹ گئے۔ باہر اُبلتے ہوئے نغموں میں مدہوشی گھلتی جا رہی تھی۔

"اب لڑائی ہو گی۔" حرث نے کہا۔

"ضرور ہو گی۔"

"پیٹ بھر کھانے کے بعد لڑائی تو گویا لازمۂ حیات ہے۔"

"اپنی فکر کرو۔"

"کر رہا ہوں۔"

"خاموشی سے۔"

"بہتر۔"

چند سے پھر خاموشی رہی۔ حلیمہ نے کروٹ لی۔ حرث نے سر اٹھا کر دیکھا

"حلیمہ ــــــ!"

"ہوں۔"

"نیند آگئی؟"

"کہاں آتی ہے نیند ــــــ یہ نیند آنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔"

"تو ناراض کیوں ہوتی ہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔"

اور باہر کسی نے بلند آواز میں ایک انتہائی فحش گیت گایا۔ چاروں طرف سے ہاؤ ہو کی صدائیں بلند ہوئیں۔

"تو یہ،" حلیمہ نے کہا، "ہم لوگوں کو بھوک ہی راس آتی ہے۔ پیٹ بھر کھانے کو ملے تو ہم مشیت کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔"

لیکن حرث نے شاید یہ بات نہ سنی تھی۔ اس نے اپنے پہلے ہی انداز میں کہا:

"میں کہتا ہوں ــــــ سن رہی ہو۔"

"بہری تو نہیں ہوں۔"

"اللہ میرے ــــ!"

"اب کچھ کہو گے بھی۔"

"کچھ نہیں بابا۔"

"دیکھو ــــ اگر مجھ سے نخرے کئے تو میں رو دوں گی۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ تو یتیم ہیں۔"

"ہاں ــــ!"

"یہی سوچ رہا تھا ــــ کہ محمدؐ یتیم ہیں۔"

"پھر کیا کروں۔"

"کچھ بھی نہیں۔ کرنا کیا ہے، وہ یتیم ہیں۔"

"لے آؤں۔"

"نہیں میرا مطلب تھا ــــ یہ تم بہتر سمجھتی ہو۔ قبیلے والے کہیں گے حلیمہ ــــ اور پھر ملے گا بھی کیا۔"

"تو پھر کہہ کیا رہے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں، سوچ رہا تھا، تم تو بات بات پر بگڑ رہی ہو۔"

"اچھا سو جاؤ ــــ!"

"جی ہاں ــــ یہ سب نیند لانے ہی کی باتیں تو کر رہی ہو۔ لوری سنا رہی ہو ہمیں۔"

حلیمہ ہنس دیں۔ حرث اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں کہتا ہوں —— تم جاؤ تو ایک دفعہ۔"

"تو نکل کر کیوں نہیں کہتے جو بھی ہاتھ لگ جائے لے آؤ۔"

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کچھ نہ ہونے سے کچھ تو بہتر ہے۔"

"تو پھر لے آؤں۔"

"یوں دھما دھم بھی ٹھیک نہیں —— مگر —— میرا مطلب ہے ستّو ختم، دودھ ختم، کھجور ختم۔"

"گویا دھما دھم بھی ٹھیک ہی ہے۔"

"ارے بھئی —— نیند آرہی ہے ہمیں تو۔"

حلیمہ مسکرا دیں۔ نہ جانے کیوں وہ محسوس کر رہی تھیں کہ وہ حرث کے فقرے پر نہیں مسکرائیں کیونکہ اس میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔

شاید —— !

شاید اُن کا دل کچھ ہلکا سا محسوس ہونے لگا تھا اور وہ مسکرائی تھیں تاکہ محسوس کر سکیں کہ مسکرانا انہیں خود اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے۔

اور حلیمہ نے محسوس کیا تھا کہ یہ مسکراہٹ خاصی تابناک ہے جیسے یکایک دل کے انجانے محرابوں میں اعتماد جاگ اٹھا ہو اور وہ اس لئے جذبے کو محسوس کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے بے قرار ہو گئی ہوں۔ انہوں نے یہ بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس جذبے کے ابھر آنے کی وجہ معلوم کر لیں۔

۶

اور دوسرے دن صبح جب کہ سورج ابھی بوقبیس کی بلندیوں تک بھی نہ پہنچ سکا تھا، آمنہ بنت وہب کے کانوں نے اپنے کمرے کی سرمئی فضاؤں میں ان الفاظ کو تیرتے سُنا۔

"میرا نام حلیمہ سعدیہ ہے۔ میں بنو سعد سے ہوں اور میرے خیموں کے پردے بادیہ بنو سعد کی ہواؤں میں رقص کرتے ہیں۔ ہمارا قبیلہ کبھی حجاز کی سرحدوں کو عبور کرکے باہر نہیں گیا۔ اور ہمارے بادیہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو غیر ملکیوں کی دلچسپی کا باعث ہو اور وہ ہمارے بادیہ کی معصوم دوشیزگی میں مداخلت کر سکیں۔ اس لئے قریش کی معزز بیگم یقین فرمالیں کہ ہماری زبان پر گونگوں کا اثر نہیں ہوا اور نہ ہی ہماری ہواؤں پر شہر کی گندگی اور غلاظت کا اثر ہے۔ بادِ سموم اپنی گرم لپٹوں سے ہمارے خیموں کو دھوتی، صاف کرتی اور نکھارتی ہے۔ بچوں کے ساتھ ہماری محبت قریش بھر میں مشہور ہے اور ہم بنو سعد والیاں جانتی

ہیں کہ روتے بچوں کو کس طرح ہنسایا جاتا ہے اور کمزور جسم والوں کو کن ترکیبوں سے توانا اور مضبوط کیا جاتا ہے۔"

حلیمہ نے یہ سب کچھ خالص کاروباری انداز میں کہا تھا اور آمنہ بنت وہب ان الفاظ سے بے خبر نہ تھیں۔ ان کی سماعت ان الفاظ کو سننے کے لئے مدت سے بے قرار ہو رہی تھی۔ آمنہ بنت وہب کو خوش ہونا چاہیے تھا اور برکہ نے جب ابھی ابھی دروازے کی آواز سن کر کنڈی کھولی تھی اور حلیمہ کے کپڑوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ آنے والی بنت بادیہ ہے تو اُس کے خون کی گردشیں تیز ہو گئی تھیں اور اُس کے انگ انگ نے ناچ ناچ کر اور گا گا کر کہا تھا کہ یہ بنو سعد کی عورت ہے۔ اب مالکن کے خواب پورے ہوں گے۔ وہ اپنے لال کو بنو سعد کی کفالت میں دے کر خوش ہو جائیں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ برکہ کو یوں بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس عورت کی انگلیاں جیسے اُس کے سینے میں ڈوبتی جا رہی ہیں اور وہ اپنی انگلیوں سے اُس کے دل کے اردگرد لکیریں سی بنا رہی ہے۔ یہ آئی ہے محمدؐ کو لے جانے کے لئے۔ اب پھر گھر میں اداسی چھا جائے گی۔ برکہ کو خاصی تکلیف ہو گی۔ وہ کوشش کے باوجود محمدؐ کی محبت کو دل سے فراموش نہ کر سکے گی اور جب محمدؐ بادیہ بنو سعد میں ہوں گے تو برکہ یقیناً اداس رہے گی لیکن اُس نے اپنے دل کے اردگرد لکیریں بناتی ہوئی انگلیوں کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ مالکن حضور کے خواب بڑے قیمتی ہیں۔ انہیں کسی بھی قیمت پر پورا ہونا چاہیے۔ اس لئے برکہ خوش تھی اور چاہتی تھی کہ مالکن ان الفاظ کو سن کر خوش ہو

جائیں گی۔

لیکن بنت وہب نے ان الفاظ کو سن کر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ پژمردہ معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے حلیمہ کو بیٹھنے کے لئے کہا ــــ کتنی دل گرفتگی تھی اس آواز میں ــــ!

حلیمہ فرش پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر مؤدب بیٹھ گئی۔ برکہ منتظر کھڑی تھی ــــ

"محمدؐ کے گھر آج پہلا مہمان آیا ہے برکہ" بنت وہب نے بالآخر اپنی افسردہ نگاہیں اٹھا کر برکہ کو دیکھا "اس کی کیا خاطر ہوگی؟"

"اس پر برکہ کی جان تک نچھاور کر دی جائے گی مالکن حضور ــــ!" برکہ نے جھوم کر کہا "محمدؐ کے مہمان کا ہر قدم برکہ کی آنکھوں اور اس کے دل پر ہے۔"

"تو جاؤ ــــ گھر میں جو کچھ ہے مہمان کے لئے لے آؤ۔"

برکہ پلٹی، دروازے کی طرف چل پڑی۔ حلیمہ سعدیہ نے اپنے چہرے کی حسین ترین مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر پیدا کی اور کہا،

"سرداروں کے گھر میں کس بات کی کمی ہے بیگم۔ محمدؐ عرب کے شریف ترین گھرانے میں تشریف لائے ہیں۔ شریف ابن شریف ابن شریف ابن شریف۔ سردار قصیٰ سے لے کر سردار عبدالمطلب تک اس گھرانے کا ہر فرد عرب کا روشن ترین ستارہ ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا سعدیہ ــــ!" بنت وہب نے کہا "میرے

بچے کی شرافت و نجابت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن شاید تم نے سن لیا ہو ـــــ محمد یتیم پیدا ہوئے ہیں۔"

"میں سُن چکی ہوں بیگم۔"

حلیمہ کو خیال تھا کہ محمدؐ کی ماں بھی دوسری قریشی عورتوں کی طرح تحریر انداز میں امارت اور سرداری کا رُعب جمانے کے لئے ایک طویل تقریر کریں گی۔ جس میں نخوت ہوگی۔ قبیلہ بنو سعد کی ذلت ہوگی اور قریشی بیگم یہ ثابت کریں گی کہ وہ بہت بلند ہیں اور حلیمہ سعدیہ بالکل پست۔ وہ اپنے بچے کو حلیمہ کے سپرد کرکے گویا اس پر احسان کر رہی ہیں۔ اور یہی وہ کمزوری تھی جس پر حلیمہ حملہ کرنے کے لئے پر تول کر آئی تھی۔ وہ اسی نخوت اور غرور کو ہوا دے کر زیادہ سے زیادہ معاوضہ طلب کر سکتی تھی اور قریش کو سارے عرب سے زیادہ امیر اور مالدار ثابت کرکے ان عورتوں کو اپنی بساط سے بڑھ کر دے ڈالنے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن یہاں مضمون ہی الٹا تھا۔ اس نے جو کچھ دوسرے لوگوں کی زبان سے سنا تھا وہی کچھ ایک سنجیدہ ہموار آواز میں اُسے یہاں کہا جا رہا تھا۔ اس لئے حلیمہ کے حربے کند ہوتے معلوم ہوئے لیکن یہ پہلا وار تھا۔ اُس نے فوراً اپنے آپ کو سمیٹا اور کہا،

"شہر بھر میں اس کا شہرہ ہے کہ محمدؐ گو یتیم پیدا ہوئے ہیں لیکن ان کے دادا قریش کے دودمان عالی کے سربراہ ہیں۔ ان کے چچا مکہ کے متمول ترین رئیس ہیں اور میں نے اس لونڈی کی خبر بھی سن لی ہے جو ننھے حضور کی ولادت کی خوشی میں آزاد کی گئی تھی۔"

"تم نے غلط نہیں سنا" وہی سنجیدہ ہموار آواز سنائی دی "سردار عبدالمطلب کو اپنے یتیم پوتے سے بڑی محبت ہے۔ ان کے چچا حارث نے بھی میری دلجوئی میں کسر نہیں چھوڑی۔ سبھی مہربان ہیں۔ سبھی نے میرا غم بانٹ لینا چاہا ہے لیکن سعدیہ ——— میں چاہتی ہوں میرا بچہ اپنی زندگی کا پہلا قدم صرف اپنے باپ کے سہارے پر اٹھائے ——— اور اس کا باپ مر چکا ہے۔"

بعض اوقات لفظوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ لیکن جس انداز میں انہیں ادا کیا جاتا ہے وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ حلیمہ سعدیہ کو بھی بنت وہب کے الفاظ نے نہیں بلکہ اس انداز نے چونکا دیا جن میں یہ کہے گئے تھے، کتنا خلوص کتنا اعتماد تھا ان الفاظ میں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ طویل رنگین شام کے لرزتے گلال کے سائے میں پھیلتی اور سمٹتی ہوئی صحرا کی لامحدود اور پُرشکوہ وسعتیں ان الفاظ کے قالب میں ڈھل گئی ہیں اور حلیمہ ان کے سامنے بے بس ہو گئی ہے۔

"لیکن سردار آقا تو ———" حلیمہ کہتے کہتے رک گئی۔ کاروباری گفتگو میں ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں جس سے گاہک کے دل کو تکلیف ہو۔

"چند بکریاں اور ایک کنیز کے سوا کوئی دوسرا ورثہ چھوڑ کر فوت نہیں ہوئے۔"

یہ قریشی خاتون جو حلیمہ کے سامنے پلنگ پر بیٹھی تھیں کیسی عجیب تھیں۔ سچائی اور صاف گوئی کی قوتوں سے وہ کس طرح حلیمہ کو ہر انداز میں مرعوب کئے جا رہی تھیں۔

"لیکن بتانے والوں نے تمہیں ایک اور بات نہیں بتائی سعدیہ۔ سردار عبداللہ ایک بہت بڑا خزانہ ورثے میں چھوڑ گئے ہیں۔ جس کا میرے سوا اور کسی

کو علم نہیں۔"

حلیمہ کی نبضیں دھڑکنے لگیں۔

"میں گوش بر آواز ہوں۔" اُس نے یکایک مؤدب ہو جانا ضروری سمجھا۔

"محمدؐ ——" وہی سنجیدہ، باوقار ہموار آواز سنائی دی —— "یہ دولت مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے سعدیہ۔ محمدؐ صرف عبداللہ کی امانت ہی نہیں ان کے خوابوں کی متشکل صورت ہے۔ میں شاید تمہیں سمجھا نہ سکوں۔ اگر تم نے محمدؐ کی غریبی کو قبول کر لیا تو تم مایوس نہ ہو گی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں لیکن نہ جانے کیوں کس طرح مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تم اس یتیم کو دنیا کے سارے خزانوں سے زیادہ نفع بخش پاؤ گی۔"

حلیمہ سعدیہ یہ سمجھ سکتی تھیں کہ ان الفاظ کے پردے میں ایک مجبور، بے کس، بے سہارا بیوہ ماں بول رہی ہے۔ لیکن وہ ایسا سمجھنے کی کوشش کے باوجود ایسا نہ سمجھ سکیں۔ وہ عجیب و غریب اعتماد، وہ تازہ ڈھلے ہوئے سکوں کی کھنک سے مشابہ آواز، وہ عجیب آفاقی ترنم جو دیوتاؤں کے کاہن بڑی محنت سے اپنی آواز میں پیدا کرتے تھے لیکن جو کوشش کے باوجود مصنوعی معلوم ہوتا تھا اس آواز میں خودرو گلاب کی طرح پھیلا اور بڑھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ حلیمہ اس کی غیر محسوس خوشبوؤں میں نہا نہا گئیں۔ اُن کے قلب و رُوح کی دھندلی محرابیں بھی اس یقین سے گونجنے لگیں جس کا اظہار اُمِ محمدؐ اپنے الفاظ میں نہ کر سکی تھیں۔

لیکن وہ اس گونج کو دبا دینا چاہتی تھی۔ شدّت کی تیزی اور بلا کی تندہی

سے اُبھرتے ہوئے اس یقین کا خاتمہ کر دینا چاہتی تھی کیونکہ یہ یقین اُن کے کاروبار کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔ اگر کہیں یہ یقین ابھر آیا۔ اگر کہیں اس کے اعصاب پر مستولی ہو گیا تو وہ کم سے کم قیمت پر بھی رضامند ہو جائے گی۔ اس لئے اُس نے آخری بار دل کڑا کر کے فیصلہ کر لیا۔ وہ محمدؐ کو قبول نہیں کرے گی اور چلی جائے گی۔ کوئی کام نہیں ملتا نہ سہی۔ کام کر کے کچھ نہ لینا اور فاقوں مرنا کام نہ کر کے فاقوں مرنے سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی عقلمند یہ نہیں کر سکتا کہ کام بھی کرے اور مزدوری کی امید بھی نہ رکھے۔ قریشی بیگم نے اس سے کوئی چیز نہ چھپائی تھی۔ یہ اُن کی عظمت تھی۔ لیکن کیا حلیمہ محض اس جذباتی عظمت پر اپنی زندگی قربان کر دے گی ــــ؟ اپنے بچوں کی زندگی ــــ؟ شیمہؓ، انیسہؓ، عبداللہؓ، یہ سب اُسے کیا کہیں گے۔ جب وہ بھوک سے بلک رہے ہونگے تو وہ انہیں کیا کہہ کر چپ کرائے گی ــــ؟ کیا اس بات سے اُن کی بھوک مٹ سکتی ہے کہ قریشی بیگم نے سچ سچ سب کچھ کہہ دیا تھا اور اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ کچھ نہیں دے سکتیں ــــ؟ ان باتوں سے بھوک اور افلاس کا عفریت تو خاموش نہ ہو گا۔

یہ سب کچھ حلیمہ کے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپک گیا اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اُمّ محمدؐ کا شکریہ ادا کر کے چلی جانا چاہتی تھی۔ یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ کسی اور جگہ قسمت آزمائے گی۔ ممکن ہے کوئی منفعت بخش کام اُسے مل جائے اور اُسے یقین تھا اُمّ محمدؐ اس کا راستہ نہیں روکیں گی۔ اُن کا خلوص، اُن کی سچائی، اُن کی ہمدردی سے حلیمہ کو یقین تھا کہ وہ کبھی حلیمہ کو مجبور کرنے کی

کوشش نہیں کریں گی۔ لیکن جب حلیمہ نے زبان کھولی تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ اپنے ارادے کے مطابق اپنے چلے جانے اور اس بات کو یہیں پر ختم کر دینے کا اعلان کرنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو یہ کہتے سنا۔

"اگر اجازت ہو تو ننھے حضور کو دیکھ لوں ذرا۔"

"ضرور ــــــ" فوراً جواب آیا، "اس خزانے کو میں زیادہ دیر تک چھپا نہ سکوں گی۔"

اور حلیمہ اپنے آپ پر متحیر، اپنی ناطاقتی اور بے بسی پر حیران کھنچی ہوئی سی پلنگ کی طرف چلی گئی۔

کتان کی بادامی رنگ کی اوڑھنی میں ہاشمی خون کی سرخیاں ملی جلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جو کمرے میں پھیلے ہوئے سرمئی دھندلکوں سے مغلوب نہ ہو سکی تھیں۔ حلیمہ نے پوری احتیاط سے اوڑھنی اٹھائی اور محمدؐ اس کی نگاہوں میں سماتے چلے گئے۔ وہی ستواں ناک، ناک کے اوپر ملی ہوئی بھنویں، بلند پیشانی چھوٹے چھوٹے ریشمی بال۔ بھنچی ہوئی ننھی ننھی مٹھیاں جو سر کے دائیں بائیں پڑی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹانگیں جو گھٹنوں تک سمٹ گئی تھیں اور گھٹنے جو مٹھیوں کی عین سیدھ میں پڑے تھے۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ ہر بچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ حلیمہ نے ایک نہیں کئی بچے دیکھے تھے، اپنے بھی اور دوسروں کے بھی۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں ـــــ!

لیکن اس بچے میں عجیب کشش تھی۔ حلیمہ کو یوں معلوم ہوا جیسے محمدؐ نے ہاتھ بڑھا کر اس کا دل پکڑ لیا ہے اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔

"بہت خوبصورت ہیں ننھے حضور!" حلیمہ اس سے زیادہ الفاظ نہ ڈھونڈ سکی۔ وہ اپنے جذبے کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو اس پر قادر نہ پاتی تھی اور اظہار محبت پر یہ عدم قدرت ایک غلجان بن کر حلیمہ کے ذہن میں ہلچل مچانے لگی۔ وہ جھکی اور اُس نے ماتھے کے درمیان اُبھری ہوئی حسین سُرخ لکیر کو چوم لیا۔ سینے کا غلجان یک دم موقوف ہو گیا اور حلیمہ کو یوں محسوس ہونے لگا گویا اُس نے اپنے دل میں اُبھرتے ہوئے ہر جذبے کو اس ایک بوسے میں پوری طرح سے ظاہر کر دیا ہے۔

اُمّ محمدؐ پاس بیٹھی مسکراتی رہیں۔

اتنے میں برکہ ایک بڑا طبق لئے ہوئے دروازے پر ظاہر ہوئی۔ اُس نے حلیمہ کو ننھے حضور پر جھکے ہوئے دیکھا اور اس کی رُوح خوشی سے جھوم گئی۔ ایک وہی نہیں پوری دنیا اُس کے چھوٹے حضور پر محبت اور عقیدت کے بوسے نچھاور کرنے کے لئے بے چین تھی۔ یہاں تک کہ بدوی عورت جیسی اجنبی کو بھی ننھے حضور نے رام کر لیا تھا۔ وہ لہک کر بولی،

"محمدؐ کے مہمان کے لئے ماحضر لائی ہوں۔"

اُمّ محمدؐ نے مسکرا کر برکہ کی طرف دیکھا اور پھر حلیمہ کی طرف متوجہ ہوئیں جو ابھی تک چھوٹے حضورؐ کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ کھا لو سعدیہ ——!"

حلیمہ سعدیہ نے اپنی نگاہوں کو حسین بشرے پر سے توڑ کر ہٹانے سے پہلے اس نور کو ہلکے بادامی رنگ کے کتانی پردے سے ڈھانپ دینا ضروری

سمجھا۔ بڑی محبت، بڑی آہستگی اور بڑی احتیاط سے اُس نے اوڑھنی اڑھا دی۔

"مجھے بھوک تو نہ تھی۔" اُس نے کہا، اور وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا اس کا پیٹ ہی نہیں آنکھیں بھی بھر گئی ہیں۔

"مگر ہاشمی گھرانے کا نمک چکھے بغیر چلے جانا بڑی بدقسمتی ہو گی۔" اُس نے اپنی بات ختم کی اور چٹائی پر بیٹھ گئی۔

طبق میں کیا کچھ نہ تھا۔ بھُنا ہوا گوشت جو گھی میں بھُونا گیا اور جس کے بہترین مصالحوں کی خوشبو پورے کمرے کو محیط ہو گئی۔ شوربا، خمیری روٹیاں، کھجوریں، انگور اور آلوچے، اتنا کچھ کہ حلیمہ سعدیہ کی بھوک تڑپ کر اُٹھی اور بھڑک کر پیدا ہو گئی۔ جیسے کسی نے سوتے میں اس کی کمر پر دُرّہ مار کر اُسے چونکا کر بیدار کر دیا ہو اور وہ فراواں اشتہار کے ساتھ کھانوں پر پل پڑی۔

"میرے میزبان نے بڑا تکلف کیا ہے۔" اُس نے پہلا لقمہ توڑا۔

"ہاشمی تکلف نہیں کیا کرتے جو تھا حاضر ہے۔" امّ محمدؐ نے حلیمہ سعدیہ کے میزبان کی طرف سے جواب دیا۔

برکہ کپڑا پکڑ کر پاس کھڑی ہو گئی اور جھلنے لگی۔ شاید کوئی بھولی بھٹکی مکھی اودھر آ نکلے۔ ویسے تو اس کمرے کی صفائی کا یہ عالم تھا کہ مکھی تو ایک طرف ریت کے باریک ذرّے جو جھریوں سے ہو کر اندر آ جاتے اور ہر گھر کی ہر چیز پر چپکا کرتے تھے یہاں بار نہیں پا سکتے تھے۔

حلیمہ نے دو تین نوالے توڑے ہوں گے کہ لذیذ کھانے اس کے حلق میں اٹکنے لگے۔ بھوکی شیمہ اور انیسہ کی صورتیں سعدیہ کی آنکھوں تلے

پھرنے لگیں۔ بڑھتے ہوئے ہاتھ ٹھٹھک کر رہ گئے۔ وہ سوچنے لگی میں کھا رہی ہوں اور میری انیسہ، میری شمیمہ ــــــ!

اور اُمِ محمدؐ نے جیسے حلیمہ کے دل کی گہرائیوں سے اٹھتے ہوئے ہر لفظ کو سُن لیا۔

"تمہارے کتنے بچے ہیں سعدیہ ــــــ؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی تین ــــــ دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ بڑی کا نام شمیمہ ہے، چھوٹی کا انیسہ ــــــ اور لڑکے کا نام عبداللہ ہے۔"

"عبداللہ ہوں گے میرے محمدؐ کے دودھ بھائی۔" برکہ ٹپ سے بول پڑی۔

حلیمہ نے کنیز کی طرف گھبرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی نئی آبادی کے کنارے پر کھڑی سوچ رہی ہو اور اُس کی نگاہیں کھانے پر گئیں۔

"ہاں ــــــ" بالآخر حلیمہ نے کہہ دیا "تمہارے محمدؐ کے دودھ بھائی عبداللہ ہوں گے۔"

"اور تمہارے خاوند؟" اُمِ محمدؐ نے پوچھا "وہ بھی تو آئے ہوں گے۔"

"جی ہاں حارث ــــــ وہ بھی میرے ساتھ ہے۔"

"آج یہ سب محمدؐ کے مہمان ہیں۔" اُمِ محمدؐ نے آواز کی کسی بھی تبدیلی کے بغیر فرمایا۔ "برکہ مہمان نوازی ہاشمیوں کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔"

اور حلیمہ کے خون میں جھانجیں سی بجنے لگیں۔

پکوان کی بڑی بڑی سینیاں دو غلاموں کے سر پر رکھی ہوئی تھیں۔ برکہ نے کپڑوں کی سینی اٹھا رکھی تھی اور ان دونوں کے آگے آگے بڑے غرور سے قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ برکہ سے آگے حلیمہ سعدیہ تھیں جن کی دونوں باہوں میں محمدؐ لیٹے ہوئے تھے اور اپنی ساکن خاموش نگاہوں سے نیلے آسمان کو دیکھتے حلیمہ کی چال کے ہلکوروں سے ہلتے چلے جا رہے تھے۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ بنو سعد کے خیموں میں جا پہنچا۔

حلیمہ کا سر غرور سے اونچا ہو گیا تھا۔ وہ غلاموں اور کنیز کے سر پر رکھے ہوئے بڑے بڑے تین طشت ایسی ہی معمولی بات نہ تھی جو ان خیموں میں روز ہوتی ہو۔ کل قریش کے دوسرے بچے بھی آئے تھے لیکن ان کے آنے کی یہ شان نہ تھی۔ ان کے ساتھ بھی غلام تھے، طشت تھے۔ شرابیں اور کچا گوشت تھا۔ کپڑے اور درہم دینار تھے، سبھی کچھ تھا۔ کل سب کو اپنی فکر تھی۔ بچوں کی بھوک ماؤں کو ستا رہی تھی۔ اور جانوروں کی بھوک کے خیال سے مرد بے حال تھے۔ اس لئے بچوں کا آنا کچھ ایسا جا نہیں۔ جلدی جلدی آئے خیمے میں رکھ دیئے گئے اور پکوان چولہوں پر چڑھنے لگے۔ لینا پکڑنا کی آوازوں سے خیمہ گونج گیا۔ ہر کوئی اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

لیکن آج خیمے والوں کے پیٹ بھرے ہوئے تھے۔ بکریاں اور دراز گوشیں چارا کھانے کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھی جگالی میں مصروف تھیں۔ اس مطمئن ماحول میں حلیمہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ آئی۔ خیمے والوں کو یوں معلوم ہوا کہ اس کی دونوں باہوں میں کائنات سمٹی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے برکہ جس

کے چہرے کی ہر درد بد نکھرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ـــــ آنکھیں تنی ہوئی سینہ ابھرا ہوا۔ وہ سیدھی چل رہی تھی گویا کسی فوج کی جرنیل ہو۔ اس کے پیچھے حبشی غلام اپنے کالے کالے چہروں پر سنجیدگی کے برقعے اوڑھے آرہے تھے اور خیمے والے ٹوٹ پڑے۔

ایک ہنگامہ، ایک شور، حلیمہ کی خوش قسمتی کو دیکھ کر اکثر قبیلے والیوں کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ وہ محمدؐ کو اس لئے چھوڑ آئی تھیں کہ وہ یتیم تھے اور انہیں زیادہ کی توقع نہ تھی۔ لیکن کتنا غلط سمجھا تھا انہوں نے۔ حلیمہ کے تو سارے دلدر دور ہو گئے تھے۔

آوازیں بلندی سے پستی کی طرف آئیں اور پھر بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئیں لیکن برکہ کی تیز سماعت ان میں سے ہر بات سن رہی تھی۔ اس نے اپنی مالکن کی تعریف ہر زبان سے سنی۔ اُن کا سگھڑاپا ہر زبان کا ورد تھا۔ بیوگی میں یہ ٹھاٹھ، آمنہ بنت وہب ہی دکھا سکی تھیں۔

لیکن ان سب باتوں کا حلیمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے خیمے کی طرف بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ بعض عورتوں نے انہیں روک کر بچے کو دیکھا اور اس کی تعریف کرنے میں دیر بھی کرنا چاہی لیکن حلیمہ کو بڑی جلدی لگی ہوئی تھی۔ وہ دکھاتے ہی چل پڑتیں۔

اور وجہ ظاہر تھی۔ حلیمہ کا دل جیسے خون ہو رہا تھا۔ بکریوں کے تھنوں میں دودھ کی بوند نہ تھی۔ گھر میں ستوؤں کی ایک چٹکی نہ تھی۔ عیر مآل اندیش حرث نے کل ساری کھجوریں بچوں کو کھلا دی تھیں۔ اور اب سردار عبدالمطلب کے

کے گھر میں اس نے جتنی جلدی جائی اتنی ہی دیر ہوتی گئی۔ گو برکہ بھاگ کر حارث کے غلام بلوا لائی تھی اور انہوں نے کھانا پکانے میں برکہ کی خاصی مدد بھی کی تھی لیکن اس کے باوجود دیر ہو گئی۔ کھانے ہاشمی مہمان نوازی کے ثبوت کے طور پر پکنے تھے اس لئے قدرتاً دیر ہو گئی۔

اس کے علاوہ سردار عبدالمطلب کے ساتھ باتوں میں خاصہ وقت گزر گیا۔ سردار نے حلیمہ کے سارے بچوں کی صحت کے متعلق تفصیل پوچھی انیسہ اور شیمہ کی بیماریوں کے متعلق پوچھا اور جب حلیمہ نے بڑے ناز سے سر اٹھا کر کہا کہ ابھی تک اس کی بچیاں ہر بیماری سے محفوظ رہی ہیں تو سردار قریش نے بڑے تعجب کا اظہار فرمایا اور چھان پھٹک شروع ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی بیماریوں کی چھوٹی چھوٹی علامتیں سردار نے گنوا دیں اور پوچھا کبھی ایسا تو نہیں ہوا کبھی یوں تو نہیں ہوا۔ اور جب حلیمہ نے ہر بات کا جواب نفی میں دیا تو پھر خود اس کی باری آ گئی۔ دو چار سال ہوئے حلیمہ کو آشوب چشم ہو گیا تھا۔ سردار نے اس پر بڑی تشویش کا اظہار کیا۔ خود حلیمہ کی آنکھوں کو کھول کھول کر اس کے ڈورے دیکھے اور کئی قسم کی ہزاروں دوائیاں بتائیں۔ نیم کے پانی سے آنکھوں کو ہر روز دھونے کی تاکید کی اور آخر دم تک حلیمہ کو یاد دلاتے رہے کہ وہ نیم کے پانی سے آنکھیں دھونی چاہئیں۔ پھر حرث اور ان کے بعد دوسرے قبیلے والوں کی باری آئی۔ حلیمہ اس سوال در سوال سے گھبرا گئی اکتا گئی تھی لیکن کیا کرتی سردار قریش کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی۔ ادب کے ساتھ جواب عرض کرنے کے سوا اس کے پاس چارہ نہ تھا۔

اور حلیمہ کی رُوح جھوم اٹھی۔ جب ان سارے سوالات کے بعد سردار

نے تبسم کیا اور کہا،

"تم گھبرا تو گئی ہو گی سعدیہ ــــ لیکن ہم اپنا سب کچھ آج تمہارے

پاس امانت رکھنے والے ہیں۔ اگر میرے محمدؐ کو کوئی تکلیف ہو گئی تو میں بو قبیس

کی جڑیں کھوکھلی کر دوں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اُن کے ہاتھ بادل کی طرح برسنے لگے۔ سردار

قریش نے اپنے پوتے کی آیا کو بہت کچھ دیا۔ پھر حارث نے اپنی طرف سے

درہم دیئے اور پھر آمنہ کی باری تھی۔

آمنہؓ نے اپنے پاس رکھے ہوئے اپنے بہترین جوڑے اپنے بیٹے

کی آیا کو بخش دیئے یہاں تک کہ وہ انگوٹھی بھی دے ڈالی جو اُن کی انگلی میں

تھی۔ داد و دہش کی اس فراوانی نے حلیمہ سعدیہ کو چکرا دیا تھا۔ وہ سلام کرتے

کرتے اور شکریہ ادا کرتے کرتے تھک گئی۔ یہاں تک کہ روانگی کا وقت آ

گیا۔

حلیمہ کو معلوم تھا ہر گھر میں یہ وقت عجیب ہوتا ہے۔ ماؤں کے ہونٹ

مسکراتے لیکن آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ باپ چہرے کو سنجیدہ بنائے پاس کھڑے

ہوتے ہیں اور اکثر ان کے ہاتھ تلوار کے دستوں پر کسی معروف گیت کی دھن

بجانے میں مصروف ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ وقت عجیب طریقے سے آیا

تھا۔ دادا نے اپنے پوتے کو سینے سے لگایا اور لرزتی ہوئی سی آواز میں کہا

"حلیمہ ــــ! میں اپنی طویل زندگی کی سب سے بڑی کمائی تمہارے

ہاتھوں میں دے رہا ہوں۔ یہ میری امانت ہے۔ اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ اگر اس میں کوئی خیانت ہو گئی تو قصیٰ کا خاندان تمہیں معاف نہیں کرے گا۔"

اور اتنی بڑی ذمہ داری کا احساس کر کے حلیمہ سہم گئی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا تھا۔ سر جھکایا تھا اور دھیمی آواز میں کہا تھا،

"سردار قریش ——— میں مقدور بھر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کروں گی۔ دعا کیجئے عرب کے دیوتا میری مدد فرمائیں۔"

اس وقت اُمّ محمدؐ موجود نہ تھیں۔ حلیمہ کو حیرت ہوئی تھی۔ لیکن برکہ کے پوچھنے پر اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ اُمّ محمدؐ اپنے کمرے میں تشریف لے گئی ہیں اور اپنے لال کو نہیں دیکھنا چاہتیں۔

ان باتوں میں سہ پہر ہونے کو آگئی تھی۔ حلیمہ کو ڈر تھا کہ بچے رو رہے ہوں گے اور حرث حلیمہ پر سخت ناراض ہوگا۔

لیکن حلیمہ ابھی سامنے والی قطار کے آخری خیمے پر ہی تھی کہ اس کی رگیں جھنجھنا کر رہ گئیں۔ حرث کی بلند آواز پر شور فضا کا سینہ چیرتی ہوئی پوری خیمہ گاہ پر مسلّط ہو رہی تھی۔ حلیمہ کے ذہن میں یکایک وہ سماں عود کر آیا جب حرث سبزے کی فراوانی کے دنوں میں بکریاں چراگاہ سے ہانک کر لایا کرتا تھا۔ خوشی، اطمینان اور بھرپور سرور اس کے صحت مند خون میں مل کر حرث کو ایسی ہی تیز اور بلند آواز میں گانے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ یہ گانا اور یہ آواز بکریوں کے بھرے ہوئے پیٹ اور دودھ کی فراوانی کا اظہار کیا کرتی تھی۔

لیکن آج یہ آواز حرث کے حلقوم سے کیسے ابل پڑی ــــ؟ آج ــــ جبکہ
بکریاں کئی دنوں کی بھوک کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھیں اور ان کے تھنوں
میں دودھ کی ایک بوند نہ تھی۔

حلیمہ لپک کر آگے بڑھی اتنی تیزی اور خود فراموشی کے ساتھ کہ خیمے
کی طنابیں اس کے پاؤں سے الجھتے الجھتے بچ گئیں۔ وہ سر نہوڑا کر رسیوں
کے نیچے سے تیزی سے گزری اور یکایک مڑ گئی۔

حرث کی پیٹھ اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ بکری نیند سے بوجھل آنکھیں
جھپک، جھپک کر جگالی کر رہی تھی۔ حرث اکڑوں اس کے تھنوں کے پاس
بیٹھا تھا اور بکری کی پیٹھ تھوڑا سا خم کھا کر اوپر کو اٹھ آئی تھی۔

حلیمہ نے دو چار قدم اور تیزی سے آگے بڑھائے۔ دودھ کی
دھاروں کی مسلسل ہموار اور رجاں نواز آواز اس کے کانوں میں نوید بن کر آئی
یہ آواز حرث کی آواز کی بلندی کے باوجود حلیمہ کی سماعت تک پہنچنے میں
کامیاب ہوگئی تھی اور اس کی روح کی گہرائیوں میں شہنائیوں کی طرح بجنے
لگی تھی۔

حلیمہ لپک کر حرث کے سر پر پہنچ گئی۔ بہ رکہ بھی تیز قدم اٹھانا چاہتی
تھی لیکن اس نے اپنے وقار کو چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور نپے تلے قدموں
سے چلتی ہوئی ان دونوں کے قریب آگئی۔

حلیمہ کے لئے یہ نظارہ ناقابلِ یقین تھا۔ وہ بکری جو اب سے چند گھنٹے
پہلے ایک بوند دودھ دینے کے قابل نہ تھی۔ کس معجزے کے زیر اثر یکایک

ایسی سیراب ہوگئی کہ اس کے تھنوں سے سفید، خوشبودار دودھ کی نہر سی بہنے لگی تھی۔ چھاگل لبالب بھری ہوئی تھی اور اس پر موتی سفید آہستہ آہستہ سرسراتی ہوئی جھاگ کناروں سے باہر چھلکی پڑتی تھی۔

حرث "حلیمہ نے حیرت سے کہا" یہ کیا"

حرث لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے خاموش ہوگیا۔ اس نے گھوم کر تشکر بھری آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ جواب دیئے بغیر مسکرایا اور پھر جھوم جھوم کر گانے اور دوہنے میں مصروف ہوگیا۔

برکہ حلیمہ کے قریب آچکی تھی اور دونوں غلام برکہ کے پاس تھے۔

خیمہ گاہ کے بچے، عورتیں اور مرد ہجوم کرکے قریب آگئے تھے۔ حلیمہ نے اچٹتی نگاہوں سے عورتوں، مردوں اور بچوں کو دیکھا۔ دودھ سے بھرتی اور چھلکتی چھاگل پر نظر کی اور حرث کو گاتا چھوڑ کر خیمے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے پر پڑا ہوا موٹا کمبل اٹھایا اور کہا،

"خوش آمدید برکہ ــــــ آؤ"

اور برکہ ایک مخصوص وقار اور شان کے ساتھ سر پر سے سینیاں اتروا کر خیمے میں داخل ہوگئی۔ بنو سعد کے خیموں والے حیران ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ایک بڑھیا نے بڑھ کر بکریوں کے آگے پڑی ہوئی بیری کی شاخیں اٹھائیں، انہیں دیکھا، سونگھا، چکھا اور پھینک کر ہاتھ جھاڑے۔ اس کے چہرے پر بھی لاعلمی کے بادل گھرے ہوئے تھے جو اس کے شدید استعجاب سے دست و گریباں تھے۔

حرث کی آواز اب بھی اسی تیزی سے گونج رہی تھی اور وہ دودھ دوہ رہا تھا۔

حلیمہ نے خیمے میں برکہ اور غلاموں کو عزت سے اونٹ کے موٹے کمبلوں پر بٹھایا۔ چھوٹے حضور کو عبداللہ کے ساتھ لٹا دیا جو گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی باچھوں پر ابھی تک تازہ بکری کے دودھ کی سفید جھاگ لگی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر حلیمہ کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا۔

"یہ میرا عبداللہ ہے۔" اُس نے چھوٹے حضورؐ کو قریب لٹاتے ہوئے کہا، "اور یہ میرے محمدؐ ——— میری دو آنکھیں۔"

برکہ مسکرا دی۔

"معلوم ہوتا ہے انیسہ اور شیمہ دودھ پی کر کہیں کھیلنے چلی گئی ہیں ———"

"دودھ تو کافی ہے آپ کے خیمے میں ——— ایک چھاگل وہ بھری رکھی ہے۔" برکہ نے کونے میں رکھی ہوئی چھاگل کی طرف اشارہ کیا اور حلیمہ کی نگاہیں چکا چوند میں آ گئیں۔

یہ کیا ہوا ہے معبود ———! ایسا تو کبھی فراوانی کے دنوں میں بھی نہیں ہوا تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" حلیمہ نے بالآخر اپنی حیرت کو الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ "ابھی آج صبح حرث نے دودھ دوہنے کی کوشش کی تھی بکریاں اس کی صورت دیکھ کر بھاگنے لگی تھیں۔ اب جانے یکایک ——— کچھ عجیب ہی سی بات ہے۔"

"آج تمہارا کنبہ محمدؐ کا مہمان ہے حلیمہ ــــــ تم نے ہماری مالکن کی بات نہیں سُنی تھی؟"

اور حلیمہ حیران ہو کر کنیز کا منہ تکنے لگی۔

"محمدؐ کا مہمان"۔ ہاں ــــ! اُسے یاد تھے یہ الفاظ لیکن ــــ!

یکا یک کمبل اٹھا۔ حرث اندر آیا۔ دُودھ سے لبالب بھری ہوئی چھاگل اُس کی ہاتھوں میں تھی۔ وہ اسی طرح گاتا، بیوی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور مسکراتا ہوا اندر آیا تھا۔ اُسے گویا خیمے میں دوسرے لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔ برکہ اور غلام گویا اس کے نزدیک خیمے میں موجود نہ تھے۔ وہ اسی انداز میں آیا اور سب سے بے پروا کونے کی طرف چل پڑا۔

لیکن چھوٹے حضورؐ کے قریب سے گزرتے وقت یکا یک ٹھٹک گیا۔

"اچھا ــــ" اُس نے چھوٹے حضورؐ کی طرف تمسخر کے انداز میں گردن موڑا کر دیکھتے ہوئے کہا "تو آپ تشریف لائے ہیں"

"محمدؐ" حلیمہ کی آواز میں ترنم کروٹیں لے رہا تھا "محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب"

"محمدؐ ــــ!" حرث نے دہرایا۔ اس کے انداز میں تمسخر یکا یک غائب ہو گیا تھا۔ اُس نے جھک کر چھوٹے حضورؐ کو دیکھا۔ پھر اپنی موٹی بھدی انگلی پر دُودھ کے کچھ قطرے اٹھائے۔ چھاگل ایک طرف رکھی۔ گھٹنوں کے بل جھکا اور محمدؐ کے ہونٹوں سے انگلی لگا دی"

محمدؐ کے دونوں ہاتھ چونک کر اٹھ گئے۔ بلند پیشانی کی محرابوں میں تھی

سلوٹیں بوڑھے ہوئیں۔ سر دائیں بائیں ہلا۔ تیز کالی آنکھوں نے غور سے حرث کو دیکھا اور حرث ہنس پڑا۔

"تمہارا حصّہ سردارِ قریش ـــــ آپ نے سب کو سیراب کیا ہے اپنا حصّہ بھی لیجئے۔"

اور برکہ کی رُوح جھوم اٹھی جیسے اسے ساری کائنات کی کنجیاں مل گئی ہوں۔

حرث نے جھک کر برکہ کے ننھے حضورؐ کو اپنے مضبوط ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سینے سے لگا لیا۔

"محمّد" اُس نے نیم بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ سنجیدگی سے کہا، "تمہارے قدم مبارک ہیں بیٹا۔ تم نے ہم بوریہ نشینوں کو سیراب کر دیا ہے۔"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ حرث وہ پہلا حرث نہیں یکدم بدل گیا ہے۔"

برکہ نے ارادہ کر لیا تھا وہ سردار قریش کو جا کر بتائے گی کہ چھوٹے حضورؐ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ انہوں نے برکہ کی توقع کے مطابق حلیمہ سعدیہ کے خیمے میں پوری فتح حاصل کی ہے۔

"میں اب چلتی ہوں۔"

"کہاں ـــــ؟" حرث نے محمدؐ کے کندھے پر سے برکہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"گھر ـــــ مالکن حضور انتظار کرتی ہوں گی۔"

"ہماری بکریوں کا دودھ نہ پیو گی ـــــ اتنا تو حقیر نہ کرو ہمیں۔"

"دودھ پی لو برکہ ـــ تم بھی مہمانی قبول کرو اپنے ننھے آقا کی۔"

اور برکہ انکار نہ کر سکی۔

مٹی کے پیالے میں دودھ انڈیلا گیا۔ برکہ نے منہ سے لگایا۔ دودھ میں جیسے شہد گھول دی گئی تھی۔ حرث کے اصرار پر غلاموں نے بھی خوب پیٹ بھر کے دودھ پیا۔ اور جب برکہ جانے لگی حرث نے کہا،

"برکہ ـــ بیگم حضور کو میرا اسلام دینا۔ اور اُن سے کہنا، حرث کے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے کہ قریش کا کوئی گھرانا کسی کو کبھی نہ دے سکا تھا۔"

اور حرث کا ہاتھ غیر شعوری طور پر محمدؐ کی پشت پر لگ گیا۔ اُس نے چھوٹے حضورؐ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جو اس کے کندھے پر گال رکھے بے خبر سو رہے تھے۔

برکہ کی نگاہیں بڑی تیز تھیں ورنہ شاید وہ نہ سمجھ سکتی کہ حرث کا ہر لفظ سچائی سے لبریز ہے۔ قریشیوں کا کوئی گھرانہ کسی دودھ پلانے والی کو "محمدؐ" نہیں دے سکتا تھا۔

۷

حلیمہ کی خوش قسمتی سہ پہر سے شام اور شام سے صبح تک بنوسعد کے پورے ڈیرے کا موضوعِ سخن بنی رہی۔ عبداللہ کی بیوہ نے اپنے اکلوتے کی آیا کو اتنا کچھ دے ڈالا تھا کہ قبیلے والیاں حیران رہ گئی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات بکریوں کا بے اندازہ دودھ تھا، جو ان کے تھنوں میں تعجب انگیز فراوانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

پہلے سب کا متفقہ خیال یہ تھا کہ اتفاق سے کوئی جڑی بوٹی حرث کے ہاتھ لگ گئی جسے کھا کر بکریاں اس طرح دودھ دینے لگی ہیں۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت حرث سے اُلٹے پلٹے سوال کر کے پوچھا گیا کہ اُس نے اپنی بکریوں کو کیا کھلا دیا ہے۔ اور جب حرث نے بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ بتا دیا کہ حلیمہ کے جانے کے بعد وہ کلہاڑی لے کر نکلا تھا۔ یثرب کو جانے والی سڑک پہ چلتا ہوا ابوقبیس پر چڑھ گیا تھا۔ ایک ٹلکی ہوئی چٹان

کے پہلو میں اس نے بیری کا گھنا درخت دیکھا۔ جس پر شہد کا بہت بڑا چھتہ
لگا ہوا تھا۔ حرث پہلے تو ڈرا لیکن پھر اُسے کھڑا ہونے کے لئے ایک محفوظ
جگہ مل گئی۔ اس نے وہاں سے چار چھ موٹی موٹی ٹہنیاں کاٹ لیں۔ چھتے میں
ہل چل ہوئی۔ دو چار مکھیاں اڑ کر مداخلت کی وجہ دریافت کرنے کے لئے
ادھر اُدھر اڑیں بھی لیکن حرث نے انہیں ناراض کئے بغیر اپنا کام ختم کر لیا اور
پھر ٹہنیوں کو گھسیٹتا ہوا یہاں تک لے آیا۔

سارے قبیلے والے اس خیال سے چونک گئے۔ اور ہر شخص دوسرے
سے چھپا کر کلہاڑیاں لئے اس بیری کی تلاش میں نکل گیا۔ بیری ڈھونڈ لی گئی
اور وہاں پہنچ کر سب کو یہ علم ہو گیا کہ وہ اپنے راز کو راز رکھنے میں ناکام رہے
ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ایک دوسرے سے جھپٹ ہو جاتی اور کلہاڑیاں
بیری پر استعمال ہونے کی بجائے ایک دوسرے کا خون بہانے کے لئے
استعمال ہونے لگتیں۔ کیونکہ اُن میں سے ہر شخص زیادہ سے زیادہ ٹہنیاں کاٹنے
کا حقدار بن رہا تھا اور بلند آواز سے چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ وہ پہلے آیا ہے
اس لئے زیادہ ٹہنیاں کاٹنے کا حق اُسے پہنچتا ہے لیکن خاص بحث و تکرار
کے بعد سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ دو چار نوجوان شہد کی مکھیوں سے
بچنے کے لئے اپنے جسموں پر کپڑے لپیٹ کر درخت پر چڑھ جائیں اور
آسانی کے ساتھ جتنی شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں کاٹ کر آپس میں برابر تقسیم کر
لی جائیں۔

اس سمجھوتے کا نتیجہ یہ تھا کہ شام کو غروب ہوتے ہوئے سورج

نے دیکھا بیری جو کافی پھیلی ہوئی اور بڑی وسیع دکھائی دے رہی تھی، ایک ٹنڈ کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ بنو سعد کے بہادروں نے چھتے کا شہد اور موم تک آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔

لیکن اس بیری نے بھی وہ معجزہ نہیں دکھایا۔ بکریوں نے اُسے کھایا بڑے شوق سے لیکن دودھ کی وہ فراوانی جو حرث کی بکریوں کو نصیب ہوئی تھی نہ مل سکی۔

یکایک خیالات کے دھارے بدل گئے اور بنو سعد میں یہ خیال ایک زبان سے دوسری سماعت اور دوسری زبان سے تیسری سماعت میں منتقل ہونے لگا کہ جھڑبیریوں کے بیر اور کھجوروں کے حلوان نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ خیموں میں یہ روایت پیدا ہونے لگی کہ حلیمہ سعدیہ اور اس کے خاوند حرث نے سب سے پہلے اساف دیوی کو جھڑبیریوں کے بیر اور کھجوروں کے کچھ دانے نذر کئے تھے۔ اور اس کے بعد نائلہ کے استھان پر بھی حلوان پیش کیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، یہ دونوں چیزیں ان دیویوں کی مرغوب ترین اشیا ہیں۔ بدو ذہن نے فوراً ان دونوں دیویوں کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لیں۔ انہیں صحرا کی ملکہ قرار دیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ صحرا میں کھجوروں اور جھڑبیریوں کے بیروں کے سوا اور کیا ملتا ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں صحرائی دیویاں انہیں کھانوں کو عزیز سمجھیں گی۔ مکہ والے ان کے سامنے طرح طرح کے پکوان پیش کرتے ہیں، کپڑے ڈھیر کرتے ہیں، بکریاں اور اونٹ ذبح کرتے ہیں لیکن جھڑبیریوں کے بیر اور کھجوریں کوئی نہیں دیتا ـــــ یہ حقیر چیزیں مکہ

کے امیر تاجر کیوں پیش کرنے لگے تھے اور انہیں معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا کہ صحرازادیاں صحرائی چیزوں کو ہی پسند کریں گی۔

بنو سعد کا ڈیرا دیویوں کے اس اندرونی راز کو پا کر چہک اٹھا اور اساف اور نائلہ کے استھان پر جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

لیکن حلیمہ کی مصروفیات ان سب سے مختلف تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ حلیمہ اور حرث کو اپنے ساتھیوں کی مصروفیات کا کچھ علم ہی نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس کے متعلق غور کرنے اور اس کا پتہ چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

حلیمہ صبح تاروں کی چھاؤں میں اُٹھی تھی اور جوہڑ پر پانی لانے کے لئے چلی گئی تھی۔ جوہڑ کی ساکن سطح پر ستارے جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کا ایک ٹکڑا مکہ کی اس اکھڑی اکھڑی زمین پر پیوند کی طرح لگا دیا گیا ہے۔ حلیمہ جوہڑ کے کنارے کھڑی خاصی دیر تک اس پُرسکون ماحول کو اپنی نگاہوں کے راستے پیتی رہی۔ کتنا سکون اور کتنی خاموشی ـــــ! ایک عظیم سکون اور سناٹا۔ حلیمہ کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک آباد بستی کے قلب میں کھڑی ہو کر پرسکون منظر کو نہیں بلکہ مکہ کی تصویر کو دیکھ رہی ہے۔

اور اس طرح چند سے کھڑے رہنے کے بعد وہ پوری آہستگی سے پھونک پھونک کر قدم دھرتی ہوئی آگے بڑھی اور جوہڑ کے کنارے پر بیٹھ

گئی۔ اُس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنی چھاگل جوہڑ کی سطح سے مس کی، گویا چھاگل کو شیشے کی کسی سطح سے چھو رہی ہو۔ اور اُسے خطرہ ہو کہ یہ حسین شیشہ اس کی چھاگل کی ضرب سے ٹوٹ جائے گا۔

اُس نے جوہڑ پر جمی ہوئی گرد کو ہٹانے کے لئے چھاگل کے پہلوؤں کو پانی کی سطح پر پھیرایا اور جوہڑ کی تصویر میں جان آگئی۔ ستارے اچھل اچھل کر ڈبکیاں لگانے لگے جیسے نورانی بچے ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوں اور جوہڑ میں ڈبکیاں لگا کر نہانے لگے ہوں۔ اس منظر میں کچھ ایسا کیف ــــ کچھ ایسا روحانی نشہ تھا کہ حلیمہ اس میں کھو گئی۔ وہ شعوری طور پر نہیں بلکہ ذہن کے کسی انجانے کونے کے ذریعہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اسے اپنی چھاگل کو ساکن نہیں کرنا چاہیئے ورنہ یہ نورانی بچے اپنا پُر لطف کھیل ختم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جوہڑ پھر ساکن تصویر بن جائے گا۔ اور نور کے یہ پتلے پھر اداس آنکھوں سے دیکھنے لگیں گے۔ اس احساس کے زیر اثر وہ میکانکی انداز میں چھاگل پھراتی رہی۔ گویا پنگھوڑا ہلا رہی ہو۔

اور نورانی بچے ڈبکیاں لگاتے رہے ــــ ہنستے رہے ــــ کھیلتے رہے۔

حلیمہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کتنی دیر تک ان فلک زادوں کو اس طرح لوریاں دیتی رہی ہے کہ یکایک حرث کی ہنسی نے اس کے ان کانچ سے زیادہ نازک اور کسی مصوّر کے شاہکار سے زیادہ حسین تخیل کو چکنا چور کر دیا۔ وہ پلٹی، صبح کاذب کے بعد چھانے والے مٹیالے دھندلکوں میں حرث کھڑا تھا

—— اور وہ ہنس رہا تھا۔

"بچے کھیل رہی ہیں پانی سے۔" اُس نے کہا اور پھر زور سے ہنس دیا۔

"معلوم ہوتا ہے میرے بچوں کی ماں بوڑھی ہو چلی ہے۔ لوگ کہتے ہیں بڑھاپے میں ایک دفعہ پھر بچپن آجاتا ہے آدمی پر —!"

اور حلیمہ نے اپنے ذہن کو دُور دُور سے سمیٹا۔ آسمان کے بسیط خلاؤں سے بھی دور پھیلے ہوئے تھے اس کے ذہن کے بعض گوشے —— اُسے شعوری طور پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کی پہنچ اتنی دور تک کیسے ہو گئی کہ اُس نے جیسے پلٹ کر ایک دم ان گوشوں کو سمیٹ لیا اور حرث کی تیز آنکھوں سے بچا کر انہیں اپنی رُوح کی کسی پوشیدہ گپھا میں چھپا لیا۔ صرف حرث کی آنکھوں سے ہی نہیں خود اپنی بھی آنکھوں سے پرے اور ہنس کر کہا ——،

"ہم تو سوچ رہے تھے۔"

"اچھا جی —" حلیمہ کی آواز میں جوانی کی البیلی ترنگ نے حرث کے دل کے اردگرد گدگدی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔

"کیا سوچ رہی تھی میری حلیمہ —"

"یہی —— کہ —!" وہ رُک گئی۔ اُس نے اپنے گھٹنے کے گرد اپنے دونوں ہاتھ لپیٹ لئے اور جھومتے ہوئے کہا: "تم نہ سمجھ سکو گے ابو عبداللہ۔"

"کسی کاہن کی بولی میں بات کرو گی کیا —؟"

"نہیں —— لیکن ہاں —— شاید۔"

"یہ سعدیہ عورت بول رہی ہے۔" حرث نے حلیمہ کی زبان آوری پر چوٹ کی۔

"لیکن آج بنو سعد کی زبان بھی اس خیال کے بیان سے معذور معلوم ہو رہی ہے۔"

"کیا نائلہ دیوی نے کچھ کان میں پھونک دیا ہے۔" حرث کا انداز ابھی تک مزاحیہ تھا ــــ

"اونہوں ــــ"

"تو پھر ــــ آخر کیا سوچ رہی تھیں۔"

"وہی تو کہہ رہی ہوں ــــ تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

"مگر کچھ کہو تو ــــ"

"چھوڑو ــــ" حلیمہ اپنے پیروں پر بیٹھ گئی۔ اس نے چھاگل کو جوہڑ کے پانی میں غوطہ دیا۔ پانی غرغراتا ہوا چھاگل کی پتلی گردن میں داخل ہونے لگا۔

اور معبود ــــ !

اس کے ساتھ ستارے بھی، ہزار در ہزار، قطار اندر قطار، یوں معلوم ہوتا تھا کہ نورانی بچے نور کے حلقے بنا کر اس کی چھاگل کی گردن کے ارد گرد منڈلانے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کو کہنیوں سے دھکیل رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنے پیروں تلے کچل کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی چھوٹی سی چھاگل کی پہنائیوں میں سمٹ آئیں ــــ پورا آسمان اس چھاگل میں در آنا چاہتا تھا۔

اور حلیمہ سعدیہ حیرت سے آسمان کی اس ناشکور کوشش کو دیکھ رہی تھی
آخر اُس کی چھاگل میں اتنی گنجائش ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اس میں کہاں سے
اتنی جگہ آجائے گی کہ وہ آسمان کی ساری وسعتوں کو سمیٹ لے۔
اور جب چھاگل بھر گئی تو آسمان کے نورانی بچے ادھر اُدھر تڑپنے
لگے۔ حلیمہ محسوس کر رہی تھی کہ باقی بچ جانے والے سخت کرب میں مبتلا ہو
گئے ہیں۔ یقیناً اسی لئے کہ وہ حلیمہ کی چھاگل میں نہیں آ سکے تھے ـــــ انہیں
یقیناً ان فلک زادوں پر رشک آ رہا تھا جو اس کی محدود وسعتوں میں گم
ہونے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔
"اب نکال بھی چکو ـــــ کیا سوچ رہی ہو۔" حرث کی آواز نے پھر
چور کر دیا اُس کے تخیل کو ـــــ
"ہیں ـــــ" وہ جیسے نیند میں بولی، "ہاں ـــــ"
اور بڑی احتیاط، بڑی آہستگی سے اُس نے چھاگل پانی میں سے نکالی
وہ نہیں چاہتی تھی کہ نور پاروں کو زیادہ تکلیف دے۔ لیکن اس احتیاط اور
اس آہستگی کے باوجود جوہڑ نے ایک عجیب اندوہناک سسکی لی۔ ہزار در ہزار
نور پارے چھاگل پر ہاتھ پیر مارتے محسوس ہوئے۔ واپس جوہڑ میں گرنے
والوں نے تڑپ تڑپ کر حلیمہ کو پکارا اور پورا آسمان بیقرار ہو گیا۔
لیکن حلیمہ انہیں دیکھنے کے سوا ـــــ ایک دردمندانہ نگاہ سے
دیکھنے کے سوا ـــــ اور کسی طرح ان کی مدد نہ کر سکی۔ وہ اس چھوٹی سی چھاگل
میں پورے آسمان کو کیسے سمیٹ لے۔ اُس نے چھاگل کندھے پر رکھی اور

خاموشی سے چل دی۔ حرث اس کے ذہن سے یکسر محو ہو چکے تھے۔

حرث کو اس بے خودی پر حیرت تھی ——— شدید حیرت ——— اتنی کہ وہ حلیمہ سے پوچھ کر اسے مٹانے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکا تھا۔ وہ خاموشی سے حلیمہ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

خیمہ گاہ میں پہنچ کر حرث نے پوچھا،

"آخر تم کیا سوچ رہی ہو حلیمہ ——— کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"مجھے ——— ؟" حلیمہ نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر چل دیں، "کچھ بھی تو نہیں۔"

"تمہارے چہرے پر عجیب روشنی ہے۔" حرث نے پہلی دفعہ پریشان سا ہو کر کہا، "کوئی بہت بڑی بات سوچ رہی ہو گیا۔"

"ہاں ——— شاید بہت بڑی بات ہے یہ۔"

"کیا ——— " حلیمہ اپنے خیمے میں داخل ہو چکی تھیں۔ حرث نے خیمے کے دروازے میں داخل ہونے کے لیے جھکتے ہوئے کہا،

"تم نہ سمجھ سکو گے۔"

"پھر بھی ——— کچھ کہو تو سمجھوں ——— آخر تم کوئی آسمانی بات تو نہ کہو گی۔ ہو گی تو اس زمین ہی کی بات۔"

"لیکن حرث ——— " حلیمہ نے چھاگل زمین پر رکھ کر حرث کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ——— "تم واقعی نہیں سمجھ سکو گے ——— کیوں کہ ——— کیونکہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔"

حرث زور سے ہنس پڑا۔

"دیوتاؤں کا نام بلند ہو——" اُس نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا "حلیمہ سعدیہ آج سے کاہنہ بنتی ہیں۔"

"میں تم سے سچ کہتی ہوں——" حلیمہ سعدیہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا، "آج تک میرے ذہن میں کبھی ایسے خیال نہیں آئے تھے میں ایک نہیں ہزار مرتبہ اس جوہڑ پر پانی بھرنے کے لئے گئی ہوں—— ابھی کل اسی وقت گئی تھی۔"

"کیا کوئی چھلاوہ دیکھ بھاگی ہو۔"

"ارے نہیں——" حلیمہ نے حرث کی گویا بدمذاقی سے گویا عاجز آکر کہا، "تم ہنسو گے۔"

"لیجئے ہم ہنسیں گے——! ارے جی ہم روویں گے——بس——اب تو بتادو۔"

"میں نے محسوس کیا——سوچا نہیں سمجھے——محسوس کیا۔"

"ارے ہاں ہاں کچھ کہو تو۔"

"میں نے محسوس کیا کہ—— تم ہنسو گے حرث ——دیکھو تمہارے ہونٹوں پر ہنسی کانپ رہی ہے—— میں رودوں گی سچ کہتی ہوں۔"

"نہیں تمہاری قسم نہیں ہنسیں گے——بتادو ہماری اچھی۔"

حلیمہ نے سوچتی ہوئی سی آنکھوں کے ساتھ حرث کے چہرے کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو مطمئن محسوس کرنے لگی۔

"میں سوچ رہی تھی ــــــ"

"نہیں ــــ" حارث نے بات کاٹی، "تم نے محسوس کیا ــــ!"

"دیکھا ــــ اڑانے لگے مذاق ــــ؟ جاؤ نہیں بتاتے۔"

"تمہاری قسم ــــ ہم نہیں ہنس رہے ہیں ــــ تمہاری قسم ہم بڑی تشویش میں مبتلا ہیں۔ بتا دو ــــ"

"میں محسوس کر رہی تھی کہ آسمان کے سارے ستارے میری چھاگل میں اتر آنا چاہتے ہیں لیکن اس میں جگہ نہیں ــــ اس لئے بے قرار ہو رہے ہیں۔"

حارث نے تیز مسکراتی آنکھوں سے علیمہ کو دیکھا۔

"ہنسنے لگے ــــ؟" علیمہ نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

"اوہنوں ــــ میں تو خوش ہو رہا ہوں۔"

"کیوں ــــ؟" علیمہ نے پوچھا، "اس میں خوشی کی کیا بات ہے۔"

"تم کیوں پوچھتی ہو۔"

"کیوں کہ میرا دل بھی بے انتہا مسرور ہوا تھا اور میں اس دیوانی مسرت کے معنی نہیں سمجھ سکی ہوں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں ــــ؟"

"کیا ــــ؟"

"اُمّ عبداللہ شاعرہ بن رہی ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔

"لوں وعدے نباہتے ہیں ــــ؟" علیمہ نے سنجیدگی سے ناراض ہوتے

ہوئے کہا۔

"بھئی تم نے بات ہی ایسی کہی ہے۔ اس پر تو امراءالقیس کے کسی شعر کا گمان ہوتا ہے جیسے عکاظ کے میلے میں اسے کہیں سنا ہو۔"

حلیمہ سوچنے لگی۔ حرث نے شاید غلط نہیں کہا تھا۔ عکاظ کے میلے میں شعر و شاعری کے طوفان مچا ہی کرتے ہیں۔ امراءالقیس تو خیر نہیں ——— شاید کسی اور شاعر کا ہو یہ خیال۔ ہو سکتا ہے ——— آخر یہ کیوں ممکن نہیں۔ اکثر شعر ذہن کے کسی گوشے میں سو جاتے ہیں اور پھر کسی خاص تحریک کے زیر اثر جاگتے اور ذہن کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں ——— ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو ———

لیکن ——— نہیں ——— !

حلیمہ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جانے کے باوجود سوچ رہی تھی۔ یہ خیال شعر نہیں ہو سکتا ——— اس نے یہ خیال کہیں نہیں سنا۔

آج صبح بھی بکریوں نے گزشتہ شام کی طرح بے اندازہ دودھ دیا تھا۔ اس دفعہ بھی بچوں نے خوب پیٹ بھر کر دودھ پیا تھا۔ حلیمہ رزق کی اس فراوانی سے بے انتہا خوش تھی اس کے باوجود وہ اس سوچ سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکی تھیں۔

ایک خیال

ایک تصوّر

ہزار ایسے تصوّر دل میں آتے ہیں اور اُن کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا

گویا پانی کی لہروں پر کوئی چل کر دُور افق کے بسیط خلاؤں میں گم ہو گیا ہو لیکن یہ خیال اپنا مصدر ڈھونڈ رہا تھا ــــ کیوں ــــ؟

اور گھر کے دوسرے جھمیلوں سے فارغ ہونے کے بعد جب حلیمہ نے آمنہ کے لال کو نہلانے کے لئے شمیہ کی گود سے لیا۔ ان کے جسم پر سے کپڑے اتارے اور انہیں احتیاط سے اپنے پاؤں کی گھروبخی پر لٹا کر اس چھوٹے سے جسم پر اسی چھاگل سے پانی انڈیلا تو حلیمہ کے ذہن پہ کے سارے پردے یک لخت ہٹ گئے۔

"حرث ــــ" اُس نے پکارا۔

حرث تو جیسے پاس ہی تھا فوراً آ گیا۔

"کیا بات ہے ــــ"

"دیکھ رہے ہو۔"

"کیا ــــ؟ کہاں ــــ؟" حرث نے اپنے اردگرد خیمے پر نگاہ ڈالی

"ادھر ــــ"

"لیکن کدھر ادھر۔"

"میرے ہاتھوں میں۔"

"ہاں ــــ چھاگل ــــ تو کیا ہے۔"

"میں محمدؐ کو ستاروں سے غسل دے رہی ہوں حرث۔"

حرث شاید پھر ہنستا لیکن حلیمہ کے چہرے پر ایک ملکوتی سنجیدگی مرتسم ہو گئی تھی۔

"یہ کسی امراؤالقیس کا شعر نہیں تھا حرث ـــــ میں سچ مچ چھاگل کو ستاروں سے بھر کر لائی تھی۔ آج محمدؐ ہمارے خیمے میں پہلا غسل لے رہے ہیں اور میں انہیں ستاروں سے غسل دے رہی ہوں۔"

حرث کی سمجھ میں نہیں آیا ـــــ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔

لیکن وہ حلیمہ کے اس خیال پر ہنس بھی نہیں سکا تھا۔ وہ اس خیال کا مذاق نہیں اڑا سکا۔ وہ اُسے کسی شاعر کی لفاظی نہیں کہہ سکا۔ وہ اسے کاہن کی ہرزہ سرائی سے بھی تعبیر نہیں کر سکا۔

وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکا اس کی بیوی کیا کہہ رہی ہے۔

اور حلیمہ آمنہ کے لال کو ستاروں سے غسل کراتی رہیں۔ اب اُن کی سمجھ میں آگیا تھا کہ فلک زادے اُن کی چھاگل میں سمٹ آنے کے لئے کیوں اتنے بیقرار تھے ـــــ آسمان اپنی لامحدود وسعتوں کو اُس کی چھاگل میں کیوں سمو دینا چاہتا تھا۔

دوسری طرف اساف دیوی کے مندر میں بادیہ بنو سعد کے مرد اور عورتیں جھرمٹ کر کے جمع ہو گئے تھے۔ کاہن کو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ آج خلاف توقع اور بے وقت معتقدین کا یہ ہجوم جمع ہوا ہے۔ لیکن قیامت یہ تھی کہ ہر آنے والے کے ہاتھ میں سونا چاندی اور دوسرے قیمتی حلوان نہ تھے بلکہ ان کی جگہ جنگلی جھڑبیریوں کے بیر اور سوکھی یا تازہ کھجوریں تھیں جن کے ڈھیر دیوی کے استھان پر لگ رہے تھے۔ بادیہ نشین سنجیدگی کے پیکر بنے

عقیدت سے سر جھکائے آگے بڑھتے نہایت خلوص اور خشوع سے دیوی کے حضور میں سجدہ گزارتے اور جھڑبیریوں کے بیر اور کھجوریں استھان پر رکھ دیتے۔

کاہن دو چار کو تو برداشت کر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج کون سا دن پڑا ہے جب اُسے صرف جھڑبیریوں کے بیر مل رہے ہیں۔ آخر جب اُس نے محسوس کیا کہ ہر عقیدت مند یہی ایک حلوان لے کر آیا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ پہلے اُس نے گرج کر کہا،

"اساف دیوی کی جے ہو——"

اور بنو سعد کے ہر مرد اور عورت کی زبان ایک بلند آہنگ کے ساتھ چیخ اٹھی۔

"اساف دیوی کی جے ہو——"

کاہن نے محسوس کر لیا کہ پجاریوں کی عقیدت میں کوئی فرق نہیں ہے پھر یہ عجیب و غریب مضحکہ خیز حلوان کیوں——؟

دوبارہ گرجا،

"آج اساف دیوی بڑی پژمردہ خاطر ہیں۔ انہیں اپنے عقیدت مندوں سے شکایت ہے۔"

اور کاہن نے بنو سعد والوں کے چہروں کو خشمگیں کے سرخ رنگوں میں ڈوبی ہوئی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اُن کے چہروں پر معصوم حیرت کو صاف دیکھ رہا تھا۔

"آج اساف دیوی کے پجاری دیوی کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔"
"کیسے ــــ؟ کیوں ــــ؟" سوال ایک غلغلے کی صورت میں بلند ہوئے
"اساف دیوی اتنی حقیر نہ تھی کہ جھڑبیری کے بیروں سے خوش ہو جاتی۔"
صحرازادوں نے ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا ــــ
اُن کی داڑھیوں میں معنی خیز مسکراہٹیں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اساف دیوی کا پجاری بھی اساف دیوی کی افتادِ طبع کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ شہری ہے نا یہ پجاری ــــ یہ صحرازادی کی طبیعت کو کیا سمجھے ــــ؟ اس لئے انہوں نے پجاری کی باتوں کی طرف دھیان دینا ضروری نہ سمجھا اور اساف دیوی کی تعریف میں وہ منتر بلند آواز سے گانے لگے جو اُن کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے تھے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ اُن کی پر اسرار زبان کو کاہنوں کے سوا کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

عقیدت کا وہی مظاہرہ ہونے لگا۔ وہی سجدے اور جھڑبیریوں کے بیروں اور کھجوروں کی وہی پیش کش۔

پجاری آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ اس کے جسم پر رعشہ آگیا۔ اور اُس نے گرج کر کہا،
"یہ حلوان دیوی کو قبول نہیں ہے۔"
بنو سعد کے ایک بوڑھے نے بڑھ کر کہا،
"یہی حلوان اساف دیوی کو پسند ہے مقدس کاہن آپ نہیں جانتے اساف دیوی کی پرورش صحرا میں ہوئی تھی اس لئے صحرا ہی میں پیدا ہونے

والی غذائیں اساف کو پسند ہو سکتی ہیں:"
یہ عجیب منطق ــــــ کاہن کو اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی دکھائی دی۔ اگر یہ منطق مکّہ اور اس کے نواح میں عام ہو گئی۔ تو اُسے زندگی بھر جھڑبیریوں کے بیروں اور کھجوروں پر بسر کرنی ہو گی۔ اس خیال نے کاہن کے ذہن کو ایک دھچکے کے ساتھ چونکا دیا حشیش کا نشہ کم ہونے لگا اور بنو سعد کے مرد اور وہاں کی عورتیں جو دھندلی دھندلی بہتی ہوئی تصویروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں نشے کے دھندلکوں سے نکلنے لگیں۔ وہ اپنی روز مرہ کی خوراک کی حفاظت کرنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ اُس نے گرج کر کہا،
"اساف دیوی صحرازادی سہی لیکن صحرائی غذائیں اسے مرغوب نہیں۔ سونا پیش کرو۔ اساف دیوی سونے سے کم میں راضی نہ ہو گی۔"
پجاری نے اس خیال کو بڑی پیچیدہ اور مقفّٰی عبارت میں پیش کیا تھا اس کے گلے کی رگیں بانسریوں کی طرح پھول گئی تھیں۔ اس کا چہرہ، سیاہ داڑھی میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچے کوئلوں کے درمیان جلتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔ لیکن بنو سعد والوں پر اس کی طویل تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ چیختا رہا اور بنو سعد والے اپنی دھیمی گونجتی آواز میں بھجن گاتے رہے۔ اساف دیوی کے استھان پر بیروں اور کھجوروں کے ڈھیر لگتے رہے۔ حرث اور حلیمہ کا تجربہ ایک عملی بات تھی۔ ایک ایسا جادو جو ان کے خیموں میں بلند ترین آواز سے بول رہا تھا اور اس کے مقابلے میں پجاری کی چیخ و پکار محض لفظ تھے جن کو نہیں سنا گیا۔ جن کی کھنک کانوں کے پردوں سے ٹکرانے کے باوجود

شعور میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے پجاری بولتا گیا اور بنو سعد والے اپنے کام میں مصروف رہے۔

اس بے توجہی نے پجاری کو آپے سے باہر کر دیا۔ اس کی تقریر گالیوں کی صورت اختیار کرنے لگی۔ بددعاؤں کا سیلاب اس کے منہ سے اُبلنے لگا۔ اساف دیوی کے قہر و غضب کا نقشہ ایسے الفاظ میں کھینچنے لگا جن میں رعد کی گرج اور پُر جوش سمندر کی پھنکاریں سمو دی گئی تھیں۔

لیکن یہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ پجاری حیران تھا۔ آج اُس کی کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہو رہا۔ نہ دیوی کے عقیدت مندوں پر نہ ہی خود دیوی پر۔ کیسی عجیب بات تھی۔ آج زندگی میں پہلی دفعہ دیوی بے جان، بے رُوح اور بے حس و حرکت نظر آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ بلند اور عالی مرتبت اساف دیوی نہیں جس کے نام سے دُور دُور تک پھیلے ہوئے قبیلے کانپتے تھے بلکہ ایک پتھر ہے جو لڑھکا دیا جا سکتا ہے جسے توڑ دیا جا سکتا ہے! اساف دیوی کے پجاری کو خود اساف دیوی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا پتھر کے اس مہیب ٹکڑے کو اٹھا کر پھینک دے اور اس کی توہین کرنے والوں کو اس کی مزدوں سے کچل دے۔

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا۔

وہ جھکا اور استھان کے ارد گرد پھیلے ہوئے پتھر اُس کے ہاتھوں میں آ گئے۔ اگر اساف دیوی اس کی مدد پر آمادہ نہیں تو وہ خود اپنی مدد کرے گا اور اس نے پوری قوت سے بنو سعد والوں پر پتھروں کی بارش شروع کر

دی اور مندر سے نکل جانے کے احکام موسلا دھار برسا دیئے۔

بھجنوں کی آواز یک لخت رک گئی۔

بنو سعد والوں نے پہلے حیرت سے پجاری کی طرف دیکھا اور ایک دو کے زخمی ہو جانے کے بعد سب پہلے آہستہ اور پھر تیزی سے استھان سے باہر نکلنے لگے۔

پتھر اور پجاری کی گالیاں اور بددعائیں دور تک ان کا تعاقب کرتی رہیں اور وہ تیزی سے ڈھلوان راستے پر سے اترتے رہے۔ راستے میں بکھرے ہوئے پتھروں نے اُن میں سے کئی ایک کے پیر زخمی کر دیئے تھے۔

اُن میں سے کئی زخمی تھے لیکن سب دل میں خوشی محسوس کر رہے تھے کہ خیموں میں پہنچتے ہی وہ عجیب منظر دیکھیں گے۔ ان کی بکریوں کے تھن دُودھ سے بھرے ہوں گے۔

دودھ سے لبالب بھرتی ہوئی چھاگلیں ــــــ!

بچوں کے قہقہے ــــــ!

لیکن خیمہ گاہ میں پہنچنے کے بعد جب وہ خوشی اور کامیابی کے اضطراری جوش سے دُودھ دوہنے لگے ــــــ!

جب مادی آنکھوں سے امید کی تکمیل دیکھنے کا وقت آیا ــــــ!

تو انہیں ایک گونہ مایوسی ہوئی۔ اساف دیوی اس حلوان سے بھی خوش نہیں ہوئی تھیں۔ قبیلے والے سوچنے کے باوجود یہ نہ سمجھ سکے کہ حرث

اور حلیمہ نے اساف دیوی کو کونسا بھجن سنایا ہے کہ وہ جھڑبیریوں کے بیروں
اور کھجوروں سے خوش ہو گئی ہے۔

سب کے زخم پہلے سے کہیں زیادہ درد کرنے لگے تھے اور ان
میں سے اکثر کو پجاری کی وہ بددعائیں یاد آنے لگی تھیں، جو کانوں کے پردوں
سے ٹکرانے کے باوجود شعور میں کوئی بھی ارتعاش پیدا نہ کر سکی تھیں۔

اور اس کے پورے تین دن بعد قافلہ بنو سعد کے صحراؤں کی طرف
کوچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

برکہ ہر روز مالکن حضور سے اجازت لے کر آتی اور چھوٹے حضورؐ
کو گھنٹوں گود میں لے کر کھلایا کرتی تھی۔ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ دیر
کر دینے کی وجہ سے مالکن حضور کچھ اوپرے سے انداز میں ناراض بھی ہوتیں
اور برکہ کو ڈانٹنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن ہوشیار برکہ ایسے موقع پر محمدؐ کی کوئی
ایسی بات سنا دیتی کہ مالکن حضور اس پر سوال کرنے لگتیں۔ مثلاً کل ہی کی بات
ہے برکہ دوپہر کی گئی شام کو لوٹی تھی۔ برتن بھانڈے اسی طرح پھیلے پڑے
تھے۔ برکہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ بس ننھے حضورؐ کو ایک نظر دیکھ کر آجائے گی
اور یوں چٹکی بجاتے میں برتن وغیرہ صاف کر دے گی، لیکن بنت وہب
کو شام تک اس شریر کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے
وسوسے آئے تھے۔ وہ بے چین ہو ہو کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کئی بار
دور سے بنو سعد کے خیموں کو دیکھا تھا جو مکہ کی چلچلاتی دھوپ میں چمکتے دکھائی

دیتے تھے۔ انہوں نے وقت گزارنے اور انتظار ختم کرنے کے لیے خود برتن صاف کرنے کا ارادہ کئی دفعہ کیا۔ لیکن اس خیال سے کہ اگر سردار عبدالمطلب کو پتہ چل گیا۔ یا وہ اطلاع دیئے بغیر آ گئے اور انہوں نے دیکھ لیا تو برکہ کی کھال ہی اتار دیں گے۔ وہ رکتی رہیں لیکن انتظار سے تنگ آ کر آخر انہوں نے خالی گھر کی در و دیوار سے آنکھیں بچا کر برتن صاف کر ہی دیئے۔ انہیں اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر کھڑکی میں آ گئیں۔ ابو قبیس کے طویل سایوں نے ان کی نگاہوں کے سامنے بنو سعد کے خیموں کو اپنی آغوش میں سمیٹا۔

لیکن برکہ نہیں آئی ——!

اور جب آئی اس وقت شمع جلانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

مالکن حضور نے برتنوں کا بہانہ رکھ کر برکہ کو ڈانٹنے کی کوشش کی لیکن برکہ نے پٹ سے کہہ دیا تھا۔

"چھوٹے آقا نے آنے نہیں دیا مالکن حضور —— میں تو بہتیرا کہتی تھی لیکن انہوں نے ایک نہیں سُنی۔ فرمایا۔ دم لو چلی جانا"

اور بنت وہب مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔ برکہ کے اس شفاف جھوٹ میں کتنا پیار تھا۔ ماں کا سینہ بکھر گیا اور وہ بولیں،

"مکّار کہیں کی ——"

"میں سچ عرض کر رہی ہوں۔ آپ کو سلام کہا ہے"

"دھوپ بہت تھی —— خیموں میں گرمی ہوتی ہوگی" ڈانٹنے کا جذبہ نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔

"گرمی تو تھی میرے تو پسینے نکل رہے تھے۔"

"کسی سائے والی جگہ لٹا یا تھا محمدؐ کو۔ حلیمہ سے کہا ہوتا۔"

"محمدؐ تو اس خیمے کے سردار معلوم ہوتے ہیں مالکن حضور، حلیمہ اپنے سردار کو ہتھیلیوں کی چھاؤں میں رکھے گی۔"

"پیار کرتی ہیں نا حلیمہ اُن سے۔"

"آپ اندازہ نہیں فرما سکتیں ۔۔۔۔ اور کون نہیں کرے گا محمدؐ سے پیار ۔۔۔۔ محمدؐ تو دل مانگتے نہیں مالکن حضور، یوں چھین لیتے ہیں۔" برکہ نے ہنس کر ہاتھ لہرا دیا تھا۔

اور آج محمدؐ بادیہ بنو سعد کی طرف کوچ فرمانے والے تھے۔

برکہ ابھی ابھی تحائف کی تیسری قسط دے کر آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ حلیمہ محمدؐ کو مالکن حضور سے ملانے کے لئے لانے والی تھی کہ برکہ پہنچ گئی۔ اُس نے حلیمہ کو مالکن حضور کے سارے پیغامات پہنچا دیئے تھے۔

"پھر کیا بولی حلیمہ ۔۔۔۔!"

"چُپ ہو گئیں ۔۔۔۔!"

"سوچتی ہوں گی عجیب ماں ہے جو جاتے وقت بھی بچے کو نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میں نے بتا دیا تھا مالکن حضور محمدؐ کی پیٹھ نہیں دیکھیں گی۔"

"پھر کیا بولیں ۔۔۔۔"

"بس چُپ ہو گئیں ۔۔۔۔ کہنے لگیں ۔۔۔۔ اور تحفوں کی کیا ضرورت تھی

— ہمیں محمدؐ بس تھے۔"

بنتِ وہب چپ ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ اٹھیں۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلیں جہاں وہ سویا کرتی تھیں۔

برکہ کو سخت حیرت تھی۔ ابھی شام بوقبیس کی چوٹیوں پر لرز رہی تھی مالکن حضور اتنی جلدی تو آرام نہیں فرمایا کرتیں — آج کیوں —؟

لیکن اسے پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شمعدان لے کر اندر گئی تو مالکن نے پوچھا،

"بنو سعد والوں کا قافلہ کس وقت جائے گا برکہ؟"

"جب ریت ٹھنڈی ہو جائے گی مالکن حضور —" اور پھر تھوڑا سا انتظار کرنے کے بعد وہ بولی،

"اگر اجازت ہو تو میں دیکھ آؤں محمدؐ کو — ابھی آ جاؤں گی۔"

"نہیں برکہ —" مالکن کے حکم میں ایک قطعیت تھی جو برکہ کو انوکھی سی محسوس ہوئی۔

"آقا سردار بھی تشریف لے گئے ہیں۔ حارث آقا بھی وہیں ہیں اور سردار ابی طالب بھی بھتیجے کو الوداع کہنے کے لئے گئے ہیں۔"

"تم — تم نہیں جاؤ گی برکہ — کھڑکی میں رہو — اور مجھے بھی بتاتی رہو۔ میں محمدؐ کے جانے کا منظر نہیں دیکھوں گی — لیکن سنوں گی ضرور —"

اور برکہ ایک ایک تفصیل سے مالکن حضور کو آگاہ کرتی رہیں۔

خیمے لد رہے تھے۔

شمعیں جل رہی تھیں۔

قافلہ چلا تھا۔

ہدی خوانوں کی مانوس آوازیں سنائی دی تھیں۔

اور پھر صحن کعبہ میں بھجن گونجنے لگے تھے۔ بچوں کے والدین اپنے بچوں کی خیریت کی دعائیں مانگنے کے لیے صحن کعبہ میں جمع ہو گئے تھے سردار عبدالمطلب بھی ہوں گے ان میں۔ برکہ کو یقین تھا۔

اور پھر قافلہ بوقبیس کی پسلی پر چڑھنے لگا تھا۔

بنت وہب نے ڈپٹ کر برکہ کو حکم دیا تھا کہ وہ چپ ہو جائے برکہ چپ ہو گئی۔ اسے اس ڈانٹ کا ملال نہیں تھا۔ وہ نہیں سوچ رہی تھی کہ مالکن نے اُسے کیوں بلا وجہ ڈانٹا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا تھا ــــ وہ رونا چاہتی تھی لیکن وہ کھڑکی پر سے ہٹ آئی۔ وہ نہیں روئے گی ــــ وہ نہیں روئے گی ــــ!

بھجنوں کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونے لگیں۔ ہدی خوانوں کی آواز اس بلند آہنگ شور کے ارد گرد ایک ہلکے سے غیر محسوس حاشیے کی طرح سنائی دینے لگی اور پھر گم ہو گئی۔

"قافلہ بوقبیس کی دوسری طرف اتر گیا ہے۔" برکہ نے بلا وجہ جیسے اپنے آپ کو بلند آواز میں اطلاع دی اور پھر سہم کر چپ ہو گئی۔

مالکن کو پھر ناراض ہونا چاہیے تھا۔

لیکن برکہ کو حیرت تھی کہ مالکن ناراض نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنے کمرے

سے نکلیں اور کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئیں۔

کعبہ کی چوکور عمارت بنت وہب کے آنسوؤں پر تھرتھرائی ان کی شخصیت کا کوئی جانا پہچانا حصہ چاہتا تھا کہ وہ ان بھجنوں میں شریک ہوں۔ کعبہ میں جا کر نہ سہی یہیں کھڑکی میں کھڑے کھڑے وہ کعبہ میں رکھے ہوئے دیوتاؤں کو پکاریں اور محمدؐ کو ان کی حفاظت میں دے دیں۔

لیکن آج عجیب بات یہ تھی کہ ان کی شخصیت کے دو حصے ہو چکے ہیں اور دوسرا حصہ پوری شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ کعبہ کے دیوتاؤں میں کوئی طاقت نہیں ـــــ اور اگر کوئی ہے تو محمدؐ کو اس طاقت کی ضرورت نہیں۔

صحن کعبہ میں گونجتے ہوئے بھجن بے معنی ہیں۔

عبداللہ کو کعبہ کے دیوتاؤں کی حفاظت میں دیا گیا تھا۔ کیا کر لیا تھا ان دیوتاؤں نے ـــــ؟ آمنہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے پر مصر تھیں کہ اس وقت ان بھجنوں اور دعاؤں سے ان کی یہ لاتعلقی اسی منطق کی پیداوار ہے لیکن ان کی شخصیت کا وہ دوسرا حصہ ـــــ وہ غیر مرئی لیکن انتہائی واضح حصہ ـــــ اس منطق کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہی کہہ رہا تھا ـــــ میں جانتا ہوں محمدؐ کو پتھر کے ان دیوتاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔ اور نہ ان جانا ـــــ نیا ـــــ اجنبی حصہ جیت گیا۔ شخصیت کے جانے پہچانے منطقی حصے کی ہر دلیل نے شکست قبول کر لی اور آمنہ تیزی سے پھر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وہ چارپائی کے قریب بیٹھ گئیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس کو مخاطب کر کے کن الفاظ میں دعا کریں۔

لیکن کچھ نہ سمجھنے کے باوجود وہ محسوس کر رہی تھیں کہ وہ کسی سے مخاطب ہیں ـــــ اپنے بچے کی سلامتی کی دعائیں کر رہی ہیں اور یہ دعائیں انہیں مطمئن کر رہی ہیں جیسے کوئی انجانی، ان دیکھی، غیر محسوس طاقت ـــــ ان کی اپنی شخصیت کے کسی بعید گوشے سے ابھری اور ساری کائنات پر چھا گئی ـــــ اور اس عظیم ـــــ بسیط، ناقابلِ ادراک طاقت نے انہیں کہہ دیا،

"ہم خود اپنی امانت کی حفاظت کریں گے۔

آمنہ کو یقین ہو گیا ـــــ!

اُن کا دل ـــــ اطمینان سے لبالب بھر گیا ـــــ اُسی چھاگل کی طرح جس کا ذکر برکہ نے کیا تھا، جو بنو سعد کے خیموں میں صاف شفاف اور پاک دودھ سے لبالب بھر گئی تھی۔

بادیہ بنو سعد میں

به سفر رفتنت مُبارک باد
به سلامت روی و باز آئی

۱

مکّہ سے بادیہ بنو سعد کو جانے والا راستہ خاصہ طویل اور صبر آزما تھا
تھکی ہوئی بھُربھُری چٹانیں قدم قدم پر آتی تھیں۔ جن سے بچ کر جانے کے لئے
طویل چکر کاٹنے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ راستے میں جتنے کنوئیں اور
باغ تھے۔ وہ اکثر یہودیوں کی ملکیت تھے۔ جنہیں قریش اور قریش کے حلیف
قبیلوں سے خدا واسطے کا بیر تھا اور ان سے کسی قسم کی پناہ یا مدد کا ملنا ممکن
نہ تھا۔ اس وجہ سے بھی قبیلے کو ان باغات سے ہٹ کر اپنے خیمے گاڑنے
پڑتے تھے اور اس بات کی بڑی شدت سے حفاظت کرنی پڑتی تھی کہ
اُن کی کوئی بکری یا دراز گوش کھجور کے ان بڑے بڑے باغوں میں نہ چلا جائے
ورنہ عام رسم کے مطابق دوسرے کے باغ میں چرنے والی بکری یا دراز
گوش باغ کے مالک کی ملکیت بن جائے گا۔

بنو سعد والے ان تمام پیچ و خم اور راستے کی ان ساری صعوبتوں سے

آگاہ تھے۔ اس لئے اُن کے میرِ کارواں نے جسے مکّہ سے روانہ ہوتے وقت بڑی احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض پورا کیا اور بنو سعد کا قافلہ تین دن کے بعد صبح صادق کی پاک اور صاف دودھیا روشنی میں اس بلند ٹیلے پر کھڑا تھا جسے بنو سعد کا ٹیلہ کہا جاتا تھا۔

عجیب منظر تھا یہ — !

ٹیلے کے نیچے دوُر دوُر تک پھیلے ہوئے ریگستان کے درمیان کھجوروں کا ایک چھوٹا سا باغ — باغ کے کنارے کنارے خیموں کی قطاریں جو ہلالی قوس کی صورت بنا رہی تھیں — یہ خیمے صبح صادق کے دوُدھ میں نہاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حُدی خوان ساری رات صحرا کو اپنی زمزمہ باری سے جگاتے آئے تھے۔ گیدڑ ان کی آوازوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے اپنے بھٹوں کو بھاگ گئے تھے۔ اور شب بیدار اُلّو جو صحرا نشینوں کے بزرگوں کی روحوں کی پکار سنانے کے لئے مشہور تھے، ان کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔

ٹیلے پر پہنچ کر حدی خوانوں کا نغمہ بدل گیا۔

اب اس نغمے میں صحرا کو جگانے کی کیفیت نہ تھی۔ بلکہ حدی خوانوں کی بلند بھرپور آواز اپنے خیمے والوں کو پکار رہی تھی — ایک اٹھلاتی ہوئی ندی جو ساری رات ایک ہموار روانی کے ساتھ بہتی رہی تھی — یکدم بنو سعد کے ٹیلے پر سے آبشار کی طرح گرنے لگی تھی۔ اس میں آبشار کا جلال اور دبدبہ تھا۔

ان آوازوں نے خیموں کی ہلالی قوس میں زندگی کی لہریں پیدا کر دیں خیموں کے پردے اٹھے۔ بوڑھی عورتیں اور جوان کنواری لڑکیاں اور بچے باہر نکل آئے۔ ان سب کے چہروں پر فاقے مرتسم تھے لیکن ہولناک قحط کی زہرہ گدازیوں کے باوجود آج وہ بے انتہا مسرور تھے۔ جوان کنواری لڑکیوں کے ہاتھوں میں دفیں تھیں۔

ہدی خوانوں کے بلند آہنگ گانے کے جواب میں جوان لڑکیوں کی میٹھی آواز استقبال کے شعر گانے لگی۔

اپنے قبیلے کے نوجوانوں کا استقبال۔

اپنے والدین کا استقبال

ان بچوں کا استقبال جو آج سے بنو سعد کے خیموں میں مہمان ہوں گے۔

اور بنو سعد کا قافلہ گاتی گنگناتی فضا کے ہموار سایوں میں اپنے خیموں کی طرف بڑھنے لگا۔

اس سفر میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہوا تھا جسے بنو سعد والے اپنے خیموں میں بیٹھ کر سناتے لیکن اس کے باوجود مکے سے آنے والوں نے اپنے خیموں میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ حلیمہ اور حرث کی خوش قسمتی عام گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔

مکہ میں تو پُر اسرار بوتیوں اور اساف اور نائلہ کے متعلق توہمات نے بادیہ نشینوں کی تسکین کا سامان کر دیا تھا لیکن جب ان دونوں چیزوں کی آزمائش

کر لینے کے بعد ان کی اصلیت فاش ہو گئی تو حرث اور حلیمہ کی خوش قسمتی حسد اور رشک کی وجہ بن گئی۔ کمزور فطرت انسان ان سے جلنے لگے۔

حرث اور حلیمہ نے اس رشک کا علاج بڑی فراخدلی کے اظہار سے کر دیا تھا۔ بکریوں کا دودھ بڑی دریا دلی سے قبیلے میں تقسیم کیا جاتا تیز رو دراز گوش پر بچوں کو سیر کرائی جاتی۔ اس طرح رشک کا جذبہ آہستہ آہستہ دب کر نیم دلانہ محبت کی شکل اختیار کر گیا۔ صحرا کے سفر نے اس محبت کو جلا دی اور بادیہ بنو سعد تک پہنچتے پہنچتے یہ لوگ حلیمہ کی خوش قسمتی کو قبیلے کی مشترکہ خوش قسمتی سمجھنے لگے۔

بادیہ میں آنے کے بعد دو چار دن تک تو لوگ اپنے اپنے جھمیلوں میں لگے رہے اور جب آہستہ آہستہ مکّے سے لائی ہوئی داستانیں پرانی ہونے لگیں تو حلیمہ کی خوش قسمتی پھر ابھر آئی۔ اور قبیلے میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اس عظیم الشان خوشی کو پوری شان و شوکت اور بدوی رسم و رواج کے ساتھ منایا جائے۔ یہ خیال آہستہ آہستہ قبیلے کے بڑے چھوٹوں کے اصرار کی صورت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ حرث کے کہنے سننے پر حلیمہ بھی لٹکی ہوئی چٹان والے معبد پر قربانی چڑھانے کے لئے تیار ہو گئی۔

قبیلے والوں میں سے چند پرجوش نوجوان حلیمہ سے کہے بغیر عرف کے پجاری سے مل کر بات چیت پکی کر آئے اور مقررہ دن حلیمہ حرث اور بچوں کو لے کر معبد کی طرف روانہ ہو گئی۔

معبد کے اردگرد چھوٹے بڑے پتھروں کی ایک باڑ سی بنا لی گئی تھی اور

اس جگہ کو کعبے کی طرح حرم سمجھا جاتا تھا۔ کاہن کا قول تھا کہ عوف دیوی بھی کعبے کے دیوتاؤں کی برادری میں سے ہے۔ اس لئے جس طرح کعبے کے دیوتاؤں کی تکریم و تعظیم ہر عربی النسل آدمی کا فرض ہے اسی طرح عوف کے سامنے سجدہ کرنا اور عوف کے گرد طواف بھی باعث برکت ہے۔

عوف دیوی کے متعلق ہزاروں روائیتیں اس کاہن نے مشہور کر رکھی تھیں اور بادیہ نشینوں میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان باتوں پر یقین نہ رکھتے ہوں لیکن اس یقین میں بادیہ نشینوں کی طبعی آزادی عجیب عجیب طریقوں سے اپنا اظہار کرتی تھی۔ وہ اس دیوتا کی الوہیت پر یقین رکھتے ہوئے بھی اس سے بے پروا تھے۔ اس کے گرد طواف ضرور کرتے تھے لیکن مذہبی فریضہ سمجھ کر نہیں محض طواف کی سنسنی کا لطف اٹھانے کی غرض سے۔

آج بھی بنو سعد کا یہ قافلہ خوشی کے ترانے گاتا ہوا اسی سنسنی کو محسوس کرنے اور اس سے حظ اندوز ہونے کے لئے چٹان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بوڑھے کاہن نے زائرین کے اس جلوس کو دور سے آتا دیکھ لیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عوف دیوی کی شہرت کاہن کی شاعری اور فصاحت و بلاغت کے پروں پر اڑ کر وسیع ریگستان کے دور دراز گوشوں تک پہنچ چکی تھی اس لئے زائرین کی خاصی تعداد مہینے میں ایک آدھ مرتبہ عوف کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے آجایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے کاہن کی مالی حالت اس کے اردگرد بسنے والے بادیہ نشینوں سے کہیں زیادہ اچھی تھی لیکن اس کے باوجود عقیدت کیشوں کے اس نئے جلوس کو دیکھ کر اس کی باچھیں

کھلی پڑتی تھیں۔

آج اس نے صبح ہی سے اپنا پرانا لبادہ پہن لیا تھا جس پر ریگستان کے بھوتوں اور چھلاووں کی عجیب و غریب تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ کاہن کے جن نے اپنے سردار کو ایک دن شراب میں بے خود پا کر یہ لبادہ اڑا لیا تھا۔ اس لبادے میں بڑی بڑی برکتیں بیان کی جاتی تھیں۔۔۔ صحرا کے بدوی جب کبھی اکٹھے ہوتے اور ان کے ذہن روحانیت کی طرف مائل ہوتے تو اس لبادے کا اکثر ذکر چھیڑ دیا جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ اس لبادے کو مردے پر ڈال دیا جائے۔ تو مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔ بیمار کو اوڑھا دیا جائے تو اسے صحت ہو جاتی ہے۔ گو یہ درست ہے کہ لبادے کی مسیحائی کا چشم دید گواہ کوئی نہ تھا۔ لیکن سب نے اس کی ان عظیم الشان فتوحات کے متعلق بڑے موثق ذرائع سے معلومات حاصل کی تھیں اور ان معلومات کو پوری سنجیدگی اور روایت گوئی کی ایماندارانہ ذمہ داری کے ساتھ دوسروں تک پہنچا دیا تھا۔ کاہن کو بھی قبیلے والوں کے ان خیالات کا علم تھا۔ اس لئے وہ بھی اپنے کاروباری ہتھیاروں سے پوری طرح سج کر قبیلے والوں کے سامنے آنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج وہ لوگ آ رہے ہیں جن کے گھروں میں مکہ کے متمول رئیسوں اور سرداروں کی دولت سمٹ کر جمع ہو جاتی ہے۔

اسی خیال کے زیر اثر عوف دیوتا کو بھی آج غسل دیا گیا تھا۔ اس کے سامنے پھیلے ہوئے پتھر کو خوب رگڑ رگڑ کر اور دھو دھو کر صاف کر

دیا گیا تھا۔ خوشبودار جڑی بوٹیاں جنہیں بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد شام کی منڈی سے حاصل کیا جاتا تھا جلائی جا رہی تھیں۔ جن کی وجہ سے معبد کا کونہ کونہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔

آخر زائرین کی دور سے آنے والی آوازیں قریب آ پہنچیں۔ بھجنوں کی آواز سے ٹکی ہوئی چٹان کے اردگرد پھیلی ہوئی ہوا گونج اٹھی۔ کاہن کا دل بیتاب ہوا جاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے وہ آگے بڑھے اور لپک کر جو کچھ بھی ان لوگوں کے پاس ہے لے لے۔۔۔۔ اُچک لے کسی طرح سے تاکہ طواف، عبادت اور قربانی کی طویل رسمیں ختم ہونے سے پہلے ہی زائرین کے لائے ہوئے تحفے تحائف اس کے پاس پہنچ جائیں لیکن اُس کا یہ کاروبار نیا نہ تھا۔ کئی سال کے تجربے نے اُسے بتا دیا تھا کہ کاہن لینے میں جتنی بے اعتنائی اور لاپروائی کا اظہار کرے عقیدتمند دینے میں اتنی ہی جلدی اور دریا دلی سے کام لیتا ہے۔ اس پرانے تجربے کی بنا پر اُس نے آج بھی اپنے دل کی بے قراریوں پر بے اعتنائی کا پردہ ڈال دیا تھا۔ جونہی حلیمہ کے قبیلے والوں نے معبد کے دروازے کا رُخ کیا، کاہن آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور آنکھیں اس طرح موند لیں جیسے اُسے دنیا میں کسی کا کچھ علم ہی نہیں۔ جیسے اُس کا ماحول، اُس کی دنیا پگھل کر ایک ایسے سمندر میں تحلیل ہو گئی جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔

اور پھر جب زائرین کے عقیدت بھرے ترانے معبد کی فضا میں گونج اٹھے تو کاہن کے چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کے دھیان

کو پریشان کر دیا گیا ہے۔ اُس نے لال لال آنکھوں کو غصے سے گھما کر پوچھا،
"یہ کیا شور ہے جو عوف دیوی کی معزز و محترم عبادت گاہ کو پریشان کر رہا ہے۔ کون ہے جو اس کے مقدس اور معظم سکوت کو درہم برہم کر رہا ہے؟"

اور قبیلے والوں کی آوازیں یکدم خاموشی میں ڈوب گئیں۔ معبد کی فضاؤں میں تیرتی ہوئی خوشبوئیں، صاف ستھرا بُت، دھلی دھلائی دیواریں اور شام کے دھندلکوں کی طرح سرمئی سی تاریکی میں ٹمٹماتے ہوئے چھوٹے چھوٹے چراغ، کھلی فضاؤں میں پڑھنے والے بدوؤں کی قوتِ واہمہ کو اسیر کر لینے کے لئے کافی تھے۔ اس پر ان لوگوں کے دماغوں پر کاہن کی شخصیت، اس کا بوسیدہ لبادہ جس پر بھوتوں اور چھلاوؤں کی بیسیوں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر کاہن کی انگاروں کی طرح سُرخ آنکھیں اور اس کی فصیح و بلیغ مقفیٰ اور مسجع زبان۔ ان سب باتوں نے مل کر سادہ لوح بدوؤں کو عقیدت اور روحانیت کے رُعب سے ساکت کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ سب مجرم ہوں۔ جیسے انہوں نے من حیث القوم کسی سنگین گناہ کا ارتکاب کیا ہو۔

"تم لوگ کون ہو؟" رعد کی کڑک فضا کی زخمی پشت پر کوڑا بن کر پڑی،
"اور کیوں ہماری آنکھوں کے سامنے ذلیل اور گندی دنیا کے دروازے کھولنے کے لئے آئے ہو۔ ہم دنیا کو چھوڑ چکے، جگ والوں سے منہ موڑ چکے۔ دنیا کی ہر لذت اور زندگی کی ہر خوشی کو تیاگ کر ہم نے آسمان پر رہنے

والے اللہ کی اس عزیز ترین بیٹی کے قدموں میں پناہ لی ہے۔ یہاں بھی تم ہمیں چین نہیں لینے دیتے۔ یہاں بھی آکر ستاتے ہو۔ چلے جاؤ۔ تمہیں عوف کی عزت کی قسم چلے جاؤ۔ ہمیں پریشان نہ کرو۔"

قبیلے کے مرد و زن سناٹے میں آگئے۔ کیا کہیں؟ یہ کاہن آسمان پر بیٹھے ہوئے اللہ کی پیاری بیٹی کا یہ برگزیدہ رازداں اُن سے ناراض تو نہیں ہو گیا کہیں؟ یہی ایک سوال تھا جو ہر ایک کے ذہن میں چل رہا تھا۔

"مکرم و مقدس کاہن!" آخر ایک نے جرأت کی، "ہم اللہ کی پیاری بیٹی کی خدمت میں قربانی پیش کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔"

"خاموش گستاخ!" کاہن اس طرح تڑپ کر کھڑا ہو گیا جیسے زخمی ناگن کو چیونٹیوں نے کاٹ لیا ہو۔ "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کی پیاری بیٹی کو تمہاری قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے ہاتھوں سے کاٹے ہوئے اونٹوں کے گوشت پر خدا کی مقدس بیٹی کا گزارہ چلتا ہے۔ تمہارا سونا چاندی، تمہارے لائے ہوئے کھجور اور ستو خدا کی بیٹی کو خرید سکتے ہیں۔"

"لیکن ہمارا یہ مطلب تو نہیں۔"

"تو پھر —— کیوں آئے ہو —— کیا لائے ہو؟"

"میرا بھتیجا حرث ——"

"حرث ——" کاہن نے چیخ کر کہا اور اس کے ہاتھ دیوانگی کے جوش سے آسمان کی طرف بلند ہو گئے۔ اس نے آنکھوں کو گھما کر آسمان کی طرف دیکھا۔ گردن کے پٹھے ابھر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے

جسم کا خون سمٹ کر چہرے اور آنکھوں میں سما گیا ہے۔

"حرث" وہ ایک دفعہ پھر اپنی پوری قوت کے ساتھ چلایا، "سلوان الکاہن پیش کیا جائے۔"

ایک بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ مٹھی بھر کھجوریں، کچھ جَو اور تھوڑے سے ستّو دیوتا کے سامنے رکھے ہوئے صاف ستھرے دُھلے دھلائے پتھر پر رکھ دیئے اور کہا۔

"مقدس کاہن ــــ یہ تمہارا سلوان ہے ــــ یہی تھا جو ہم دے سکتے ہیں ــــ!"

کاہن نے کنکھیوں سے معمولی سے نذرانے کی طرف دیکھا۔ اُس کا دل اندر ہی اندر بیٹھ گیا۔ اتنی معمولی چیز اور اس جیسے عظیم الشان کاہن کی خدمت میں ــــ اسے غصّہ آ گیا۔

"سونا ــــ!" لفظ فضا کے جگر کو کاٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے، "سونا پیش کیا جائے ورنہ عفت ماٰب عوف کا قہر و غضب تم لوگوں کو گھیر لے گا۔ زمین و آسمان کی قسم، یاد رکھو، مٹی میں ملا دیئے جاؤ گے۔" اور کاہن نے آنکھیں بند کر لیں۔

قبیلے والوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ عورتیں سہمی ہوئی نظروں سے کاہن کی طرف دیکھتی ہوئیں حلیمہ کے ارد گرد سمٹ آئیں اور ہلکی آواز سے کہنے لگیں،

"سونا نہیں لائیں۔"

"ہمارے پاس کہاں دھرا ہے سونا۔" حلیمہ نے پریشانی کے عالم

میں کہا۔

"لیکن کچھ تو دینا ہی ہوگا۔"

"ہو تب نا ــــ جب ہے ہی نہیں تو کہاں سے دیں۔"

"یہ انگوٹھی دے ڈالو۔"

"یہ نہیں دوں گی ــــ میرے بچے کی ماں نے دی تھی مجھے۔"

"تو پھر ــــ"

"کہہ دو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"تم تو ایسی باتیں کرتی ہو جیسے گھر ہی کا معاملہ ہو۔"

"سونا لاؤ ــــ ورنہ خاک کر دیئے جاؤ گے۔" کاہن کی آواز پھر گونجی۔

"اور خاک ہونے میں کوئی کسر ــــ" حلیمہ تلملا کر کاہن کی طرف بڑھی لیکن حرث نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا کر رہی ہو حلیمہ ــــ عوف سے ڈرو۔" کسی نے کہا اور چاروں طرف سے کانا پھوسیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

اور اس عام گڑبڑ میں کاہن کی بلند آواز پھر گونجی۔

"میرا جن شیعبان کی اولاد ہے۔ وہ شیعبان جو شیطانوں کا استاد تھا۔ ہاں شیعبان ــــ وہ میرا ساتھی ہے اور میں اس کا ساتھی ــــ میں اُسے پکارتا ہوں۔ میرے دوست مسحل ــــ میرے دوست مسحل ــــ یا مسحل ــــ یا اخی ــــ یا مسحل ــــ یا مسحل ــــ"

اور بدوؤں کی حیران آنکھوں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں جیسے آندھیاں چلنے لگی ہوں۔ سُرخ اور خونی آندھیاں۔ اُس کے اعضا کانپنے لگے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے کف جاری تھی اور ہاتھ پاؤں پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

لوگ سکتے میں کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اور دفعتہً کاہن اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر باطنی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے دُور ریگستان کی وسعتوں میں نظریں گاڑتے ہوئے کہا،

"قسم ہے زمین و آسمان کی اور عقاب و آفتاب کی۔ میں ہوں مسحل جو جو جنہام کا بیٹا ہے اور میرا جدِ اعلیٰ شیعبان ہے۔ یہ میرا دوست ہے اور میں اس کو غیب کی باتیں بتاتا ہوں۔ میں بتاتا ہوں وہ باتیں جو ابھی ہونے والی ہیں اور جس کے متعلق کسی خاکی کو کچھ پتہ نہیں ہو سکتا۔ میں خدا کی عفت مآب بیٹی کا پجاری ہوں اس لئے خدا مجھے اپنے دل کی بات بتا دیتا ہے۔ یاد رکھو اے قبیلہ والو! اگر تم نے میرے کاہن کو وہ حلوان نہ دیا جو وہ مانگتا ہے اور جس پر اُس نے اپنا دل لگایا ہے تو میں تمہارے ریوڑوں کو اس وقت جنگلوں میں گھیر لوں گا جب وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہری ہری دُوب پر منہ مار رہے ہوں گے۔ میں ان چشموں اور تالابوں میں زہر گھول دوں گا جس سے تم، تمہارے بچے اور تمہاری بیویاں پیاس بجھاتی ہیں۔"

"حلیمہ۔۔۔!" کسی نے پاس سے کہا "دے ڈال انگوٹھی!"

"میں نہیں دوں گی۔۔۔ مجھے تو یہ کوئی پاکھنڈی دکھائی دیتا ہے۔"

صرف قبیلے والے ہی نہیں خود حلیمہ یہ کہہ کر سہم گئی ـــ اُس نے عوف کے کاہن کو پاکھنڈی کہہ دیا ہے؟ آخر کیوں؟ اتنی گستاخی کی بات کیوں نکل گئی، اس کے منہ سے؟ ایسی لامذہبیت کہاں سے آگئی اس کے ذہن میں؟ وہ پریشان ہونا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ اپنے اس جذبے پر نادم ہو لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل تاسف کے جذبات سے پاک تھا اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے غیر اختیاری طور پر اُس نے سچی بات کہہ دی ہو لیکن کاہن کے جی کو اور غصہ آگیا تھا۔

"قسم ہے بکری کی اس مینگنی کی جسے بچپن میں گولی بنا کر کھیلا کرتا تھا۔ قسم ہے کیکر کے اس کانٹے کی جو میں راہ چلتوں کے پاؤں میں گھونپ دیا کرتا ہوں میں خواب بن کر آؤں گا۔"

"حلیمہ ـــ انگوٹھی دے دے۔" اب تو حرث نے بھی کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ بددعائیں نہیں سن سکتا تھا۔ "میں اور بنوا دوں گا تجھے۔"

"یہ بی بی آمنہؓ کی دی ہوئی انگوٹھی ـــ یہ مت چھینو مجھ سے حرث ـــ یہ مت لو۔"

"وہ بھیانک خواب!" کاہن کی آواز قبیلے والوں کی زیر لب سہمی آواز پر غالب آرہی تھی، "جو تمہاری نیندیں پریشان کر دے گا۔ جو تمہارے دل کا سکھ چین چھین لے گا۔ تمہاری مسکراہٹوں کو تمہارے ہونٹوں پر منجمد کر دے گا۔ تمہیں آنسوؤں میں ڈبو دے گا ـــ علوان الکاہن ـــ سونا ـــ یہی

ایک چیز ہے جو تمہیں بچا سکتی ہے۔"

"دے ڈالو انگوٹھی علیمہ!" حرث نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

علیمہ نے حرث کے چہرے کی طرف دیکھا۔ حرث کی آنکھوں میں پریشانیاں تیر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ اس طرح سمٹ گیا تھا جیسے بھیک مانگنے کی شرم اُسے پانی پانی کئے دے رہی ہے۔

علیمہ نے اپنی انگلی کی طرف دیکھا۔ سونے کی ہلکی سی انگوٹھی اُس کی گاؤدُم انگلی پر لپٹی ہوئی تھی۔ علیمہ کو یوں محسوس ہوا جیسے دھات کی بنی ہوئی یہ بے جان انگوٹھی زندگی کی دھڑکنوں سے کانپ اٹھی ہے اور اپنی نگینے کی ایک آنکھ سے علیمہ کی طرف التجا بھری نگاہ سے دیکھ کر کہہ رہی ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے، مجھے اپنے سے جدا مت کرو۔ یہ داغ مت دو مجھے، اور علیمہ نے جیسے اپنے جسمانی کانوں سے انگوٹھی کی آواز سنی ہو انگلی کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے رُک گیا۔ اُس نے انگوٹھی کی التجا کو آنکھوں میں سمیٹ کر حرث کی طرف دیکھا اور بولتی ہوئی نظروں سے کہا۔ ہم دونوں کو جدا نہ کرو حرث ——— لیکن حرث کی آنکھوں میں اس سے کہیں زیادہ التجا تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ علیمہ سے اپنے سکون، اپنی تسکین نہیں ——— ! اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

اور علیمہ نے ——— انگوٹھی کی بلند آوازوں پر اپنی سماعت کے دروازے بند کر دیئے۔ اس کا دوسرا ہاتھ تیزی سے انگوٹھی کی طرف بڑھا۔

کاہن کی سُرخ آنکھیں کوندے کی لپک کی سی تیزی کے ساتھ انگوٹھی

پرمژدہ ہو گئیں ___ سونا ___ ہاں اس کی سکڑتی اور پھیلتی ہوئی باچھوں میں مسکراہٹ کی ہلکی کپکپی شاید بنو سعد کے کسی آدمی نے نہیں دیکھی تھی۔

حلیمہ نے انگوٹھی کو اپنی انگلی کی پوروں سے چھوا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے عزیز ترین ساتھی کو اپنے سے جدا کر دینے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اس کے اس لمس میں کتنی مایوس محبت اور کتنی بھیانک مجبوری تھی انگوٹھی آہستہ آہستہ اس کی انگلی پر کھسکی، ایک ایک قدم پر رکی جیسے اترنا نہ چاہتی ہو۔ لیکن وہ مجبور ہو گئی۔ تڑپ کر زمین پر گر پڑی۔

حریث نے لپک کر انگوٹھی اٹھالی اور آگے جھک کر دیوتا کے سامنے رکھ دی۔

"سونا ___!" کاہن کی آواز میں قہقہے گونج رہے تھے۔ "اللہ کی بیٹی تمہاری مدد کرے گی۔"

لیکن حلیمہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ انگوٹھی نہیں، اس کی زندگی دیوتا کے بیڈول جسم پر قربان کر دی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہیں چھپانے کے لئے حلیمہ نے اپنا چہرہ چھوٹے حضورؐ کی گردن پر رکھ دیا۔

کاہن کے جن نے بعض ایسی باتیں بتائی تھیں جن سے قبیلے والے بیحد مسرور تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ عنقریب بارش ہو گی۔ صحرا کا چپہ چپہ سبز پوش ہو جائے گا۔ درختوں پر پھول آئیں گے اور ہوا ان پر دولت کی بارش کرے گی۔ سب سے حیرت خیز بات جو جن کے منہ سے نکلی تھی یہ تھی کہ

قبیلے والوں میں سے ہر آدمی کے پاس سو اونٹ ہوں گے۔ سیاہ چشم اونٹ جن کی تعریف عرب بھر میں ہو گی۔

یہ اور دولت و عزت کے وہ ہزاروں وعدے جو قبیلہ بنو سعد کے مستقبل میں پوشیدہ تھے نشہ خیز گیت بن کر معبد کے در و دیوار میں گونج رہے تھے اور قبیلے والے خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے لیکن یہ عام خوشی حلیمہ پر مطلقاً بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ اسے کاہن کی کسی بات پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اسے کاہن کی ہر بات میں مکر و فریب کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ حیرت تو یہ تھی کہ کوشش کے باوجود حلیمہ اپنے دل میں عوف دیوی اور اس کے کاہن کے لئے وہ پرانی عزت اور عقیدت پیدا نہ کر سکی جو آج سے کچھ ہی مہینے پہلے موجود تھی۔ اگر آج سے کچھ مہینے پہلے ——— شاید مکہ جانے سے پہلے ——— وہ یہاں آتی تو اس کا سر عقیدت کے ساتھ عوف کے قدموں میں جھک جاتا۔ ایک معمولی انگوٹھی تو کیا وہ اپنے گھر کی ہر چیز دیوتا کے مقدس قدموں پر نچھاور کر دیتی۔ لیکن نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ اُس کے دل میں رہ رہ کر یہی سوال پیدا ہو رہا تھا۔ کیا واقعی عوف اللہ کی بیٹی ہے ——— ؟ کیا واقعی کاہن کاہن مستقبل پر سے پردے ہٹا سکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ اللہ کے بھیدوں میں کسی اور کو بھی شرکت کی اجازت ہوتی ہے؟

ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب ملتا اس کے دل سے ——— ایسا جواب جس کا اعلان کرتے ہوئے اُسے ڈر لگ رہا تھا۔ اگر وہ کہہ دے کہ نہیں ——— اگر وہ اپنے دل کی آواز کو ایسے لفظوں میں ڈھال دے جو سننے

والوں کے کانوں میں پہنچ سکیں —— تو؟ —— ؟

یہی وجہ تھی کہ اس نے قربانی میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ایک اونٹ اور دو بکریاں قصاب کی چھری کے خلاف احتجاج کرتی ہوئیں خون میں شرابور ہو کر ہمیشہ کے لیئے سو گئیں۔ ان کا گوشت بڑے بڑے ٹکڑوں میں کٹ کر قبیلہ والوں میں بٹ گیا۔ ایک کانپتا ہوا ٹکڑا حلیمہ کو بھی ملا تھا۔ لیکن حلیمہ کو اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قبیلے والوں کا خیال تھا کہ گوشت کی ہر بوٹی میں برکت ہے کیونکہ اس کو عوف دیوی کے کاہن کے بابرکت ہاتھ چھو چکے ہیں۔ لیکن حلیمہ کے لیئے یہ ایک بے برکتی کی دلیل تھی۔ عوف دیوی بھی پاکھنڈ اور اس کا کاہن بھی پاکھنڈ۔ اس لیئے اس کا نام لے کر جن بکریوں کی قربانی دی گئی وہ قربانی نہیں ہوئی۔ بے دردی اور بے جگری سے کاٹ کر ضائع کر دی گئی ہیں۔

اور شام کو واپسی کے وقت بدی خوانوں کی موسیقی ایک دفعہ پھر وسیع ریگستان میں گونجی۔ صحرائے عرب کی کانپتی ہوئی سرخ شام کھجور کے ساکن درختوں کو اپنی گود میں لیئے دیر تک ہمہ تن گوش ہو کر پرکیف تانیں سنتی رہی اور آخر بنو سعد کے خیمے آ گئے۔

حلیمہ چپ چپ تھی۔ بچوں کی اونچی آوازیں اس کے ارد گرد ناچ رہی تھیں۔ حرث اپنے رنگین مستقبل کو حال سمجھ کر آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ لیکن حلیمہ چپ تھی۔

آخر رات کے وقت سونے سے پہلے حرث نے پوچھا۔

"حلیمہ ـــــ"

"اوں ـ !"

"آج تم چپ چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"ہمیں بھی نہ بتاؤ گی۔"

"کچھ بتانے کو ہو تو کہوں۔"

"یہ تو غلط ہے ـــــ انگوٹھی کا افسوس ہے۔"

"نہیں!"

"تو پھر ـ؟"

"سو جاؤ اب ـــــ آغا۔"

"سو جاؤں؟"

"ہوں۔"

"اچھی بات۔"

اور خیمے کی فضا میں مکمل سکوت آ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حرث نے پہلو بدل کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔ کمرے کی تاریکی میں حلیمہ کا گندمی چہرہ چمک رہا تھا اور ساتھ ہی اُس کی تیز سیاہ آنکھیں حلیمہ آنکھیں کھولے ٹکٹکی لگائے خیمے کی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"حلیمہ ـــــ!"

حلیمہ خاموش تھی جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"حلیمہ ---!"

"ہوں --- ہاں --- کیا بات ہے۔"

"سو کیوں نہیں جاتیں۔"

"نیند نہیں آتی۔"

"کیوں ---؟"

"معلوم نہیں۔"

"سوچ رہی ہو۔"

"ہاں!"

"کیا۔"

"پتہ نہیں ---۔"

"انگوٹھی کے بارے میں۔"

"سو جاؤ اب --- آہ۔"

"میں تمہیں اور انگوٹھی بنوا دوں گا۔"

"اچھا۔"

"اب سو جاؤ۔"

"ہوں۔"

اور حلیمہ نے پہلو بدل لیا۔ حشمت نے بھی پہلو بدلا۔ اس کے اوپر کے گھٹنے کی ہڈی نچلے گھٹنے کی ہڈی سے ٹکرا گئی اس نے اُسے ہاتھ سے سہلا کر چادر اوڑھ لی۔ ہلکی ہلکی نیند دھیرے دھیرے اس کی پنڈلیوں اور رانوں میں

رنگینی ہوئی آنکھوں تک آگئی۔ پپوٹے بھاری ہونے لگے اور آہستہ آہستہ وہ نیند کے حسین خوابوں میں کھو گیا۔

"حریث" حلیمہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"حلیمہ ـــــ کیوں؟"

"سو گئے؟"

"نہیں تو۔"

"لیٹ جاؤ۔"

"بات کیا ہے؟"

"میں سوچ رہی ہوں۔"

"سوچ رہی ہو۔"

"ہاں!"

"کیا ـــــ؟"

"یہ عوف دیوی سچ مچ اللہ کی بیٹی ہے؟"

"مجھے کیا پتہ ـــــ کہتے تو یہی ہیں۔"

"لیکن تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"ہو گی۔"

"لیکن اللہ کے بھی کبھی بیٹیاں ہوئی ہیں۔"

"نہ ہوتیں تو یہ لوگ کیوں کہتے۔"

"جھوٹ تو نہیں بولتے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کب۔"

"میں نے کہا ہو سکتا ہے۔"

"لیکن کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہی کہ اللہ کی بیٹیاں نہ ہوں اور یہ محض جھوٹ بول رہے ہوں۔"

"تمہارا دل کیا کہتا ہے۔"

"چھوڑو —— سو جاؤ۔"

"نہیں حرث —— سوچو اللہ کے بھی کبھی بیٹیاں ہو سکتی ہیں۔"

"فرض کرلو نہیں ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں یہ سب۔ تب؟"

"تب کیا؟"

"مطلب یہ کہ ہمیں کیا فائدہ ہوا۔"

"فائدہ وائدہ —— تو کچھ نہ ہوا۔"

"تو پھر سوچنے سے حاصل۔ کاہن جانیں اور اُن کی باتیں —— تم سو جاؤ۔"

"ہاں —— ہمیں کیا۔"

"تو پھر سو جاؤں۔"

"سو جاؤ ——"

"اچھی بات —— آہ۔"

تھوڑی دیر بعد حلیمہ نے پھر کہا،

"سحرش!"

"اوں۔"

"سو گئے۔"

"نہیں ——"

"ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور ——!" سحرش نے پہلو بدل کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔ ثانیئے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اُسے حیرت ہوئی۔ حلیمہ کا چہرہ آج معمول سے بہت زیادہ چمکدار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اُس نے نہ جانے کیا سوچ کر ٹال دیا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی تھی۔ وہ بڑی بڑی اہم باتوں کو کچھ سوچ کر ٹال دیتا تھا، بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کیا کچھ ہے۔

"اگر فرض کر لو کہ اللہ کے نہ کوئی بیٹا ہے نہ بیٹی۔"

"پھر وہی۔"

"تم سنو تو۔"

"اچھا کر لیا فرض ——"

"تو پھر یہ کاہن لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟"

"میرے دل کی بات پوچھتی ہو۔"

"ہاں ——"

"ناراض تو نہ ہوگی۔"

"نہیں۔"

"ہوا وعدہ۔"

"ہاں ہوا۔"

"جس طرح ہماری بکریاں ہیں نا۔"

"ہاں!"

"بھئی دودھ دیتی ہیں ہم پیتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، پنیر کھاتے ہیں۔"

"ہاں!"

"اسی طرح کاہنوں کے لئے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔"

"مطلب ــــ؟"

"اگر یہ اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے نہ ہوں تو کاہنوں کو کھانا کہاں سے ملے۔ ہم لوگ تو پھر کاہنوں کو کچھ دینے سے رہے۔ بھوکوں مر جائیں یہ۔"

"تمہارا مطلب ہے ــــ یہ کاہن وغیرہ اس لئے جھوٹ بولتے ہیں کہ انہیں حلوان ملے۔"

"جھوٹ نہیں بولتے ــــ یا بولتے ہیں، یہ کون جانے۔ لیکن اگر اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے ہیں تو انہیں کاہن بالکل اسی طرح اپنے پاس رکھتے ہیں جس طرح ہم اپنی بکریاں اور اونٹ۔"

"ہم اپنی بکریوں اور اونٹوں کی پوجا تو نہیں کرتے۔"

تھوڑی دیر بعد حلیمہ نے پھر کہا،

"حرث!"

"اوں۔"

"سو گئے۔"

"نہیں ــــــ"

"ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور ــــــ!" حرث نے پہلو بدل کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔ شانے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اُسے حیرت ہوئی۔ حلیمہ کا چہرہ آج معمول سے بہت زیادہ چمکدار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اُس نے نہ جانے کیا سوچ کر ٹال دیا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی تھی۔ وہ بڑی بڑی اہم باتوں کو کچھ سوچ کر ٹال دیتا تھا، بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کیا کچھ ہے۔

"اگر فرض کر لو کہ اللہ کے نہ کوئی بیٹا ہے نہ بیٹی۔"

"پھر وہی۔"

"تم سنو تو۔"

"اچھا کر لیا فرض ــــــ"

"تو پھر یہ کاہن لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟"

"میرے دل کی بات پوچھتی ہو۔"

"ہاں ــــــ"

"ناراض تو نہ ہو گی۔"

"نہیں۔"

"ہوا وعدہ۔"

"ہاں ہوا۔"

"جس طرح ہماری بکریاں ہیں نا۔"

"ہاں!"

"بھئی دودھ دیتی ہیں ہم پیتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، پنیر کھاتے ہیں۔"

"ہاں!"

"اسی طرح کاہنوں کے لئے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔"

"مطلب —؟"

"اگر یہ اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے نہ ہوں تو کاہنوں کو کھانا کہاں سے ملے۔ ہم لوگ تو پھر کاہنوں کو کچھ دینے سے رہے۔ بھوکوں مر جائیں یہ۔"

"تمہارا مطلب ہے —— یہ کاہن وغیرہ اس لئے جھوٹ بولتے ہیں کہ انہیں حلوان ملے۔"

"جھوٹ نہیں بولتے —— یا بولتے ہیں، یہ کون جانے۔ لیکن اگر اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے ہیں تو انہیں کاہن بالکل اسی طرح اپنے پاس رکھتے ہیں جس طرح ہم اپنی بکریاں اور اونٹ۔"

"ہم اپنی بکریوں اور اونٹوں کی پوجا تو نہیں کرتے۔"

"تو بھی یونہی رہی ــــ دیکھ ــــ ہم چراتے ہیں بکریوں کو، اُن کے لئے دانہ بھٹّا جمع کرتے ہیں۔ پھر انہیں نہلاتے ہیں، پانی پلاتے ہیں، ہر طرح اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اب اللہ کی یہ بیٹیاں اور بیٹے کھاتے پیتے تو کچھ ہیں نہیں۔ ان کی خوراک تو بس یہی ہے کہ بھٹی بھر عُود دھجیاں سلگا کر خوشبو بہت خوشبو کر دی۔ ایک آدھ شعر پڑھ دیا ان کی تعریف میں اور سجدہ کر کے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کا پیٹ بھر گیا۔ اور تم جانتی ہو جب بکریوں کا پیٹ بھرتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ دُودھ دیتی ہیں۔ اسی طرح جب اللہ کی بیٹی بیٹوں کا پیٹ بھرتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ خوشخبریاں سناتے ہیں۔ آج نہیں دیکھا تھا۔ اِدھر تم نے انگوٹھی دی اور کاہن کے جن نے وہ وہ خوشخبریاں سنائی ہیں کہ ــــ میں نے کہا حلیمہ۔"

"ہاں ــــ"

"تم نے سُن لیا۔"

"ہاں ــــ"

"کچھ سمجھ میں آیا۔"

"ہاں۔"

"کیا بھلا۔"

"اللہ بھی ــــ بکریوں اور اونٹوں کی طرح تجارت ہی کا مال ہے۔"

"بس یہی بات ہے۔ اب سو جاؤں۔"

"لیکن اللہ ــــ میرا مطلب ہے اس سے کچھ بڑا ہونا چاہیئے۔"

"وہ کیوں؟"

"مطلب یہ ہے ۔۔۔ دیکھو نا ۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہم انسان ہیں۔"

"ہاں!"

"تو اللہ ہم سے بڑا ہونا چاہیئے۔ طاقتور ضرور ہونا چاہیئے۔"

"وہ تو ہے ہی۔"

"تو پھر اس کی اولاد جو ہو ۔۔۔ وہ بھی ہم سے زیادہ طاقتور ہوگی۔"

"کوئی شک نہیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ اس طرح سے ۔۔۔ کیسے کہوں ۔۔۔"

حرث ہنس پڑا۔

"میرا مطلب ہے کہ ۔۔۔ اب ہماری جو بکریاں ہیں وہ ہم سے کمزور ہیں ۔۔۔!"

"ہاں!"

"تو پھر اللہ کی بیٹیاں کاہنوں سے کمزور ہوئیں۔ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں انہیں بیچ دیں۔"

"بات یہ ہے کہ یہ باتیں کبھی سوچی نہیں۔ مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ بکریاں ہمیں دودھ دیتی ہیں اور اللہ کی بیٹیاں کاہنوں کے لئے حلوان۔ چھٹی ہوتی ۔۔۔"

"لیکن ایسا نہیں ہے۔"

"ہمیں کیا فرق پڑتا ہے ـــــ نہ ہو۔"

"لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارا کوئی مالک تو ہونا چاہیئے۔"

"بھئی سچی بات بتاؤں۔"

"ہاں۔"

"اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ جو کاہن کہیں سچ ہے ـــــ اس سے زیادہ سوچنا ہی فضول ہے۔"

"سو جاؤ۔"

"اچھا!"

"مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"اچھی بات ـــــ"

حرث نے پہلو بدلا اور تھوڑی دیر کے بعد خیمے کی فضا ہلکے ہلکے خراٹوں میں گم ہو گئی۔

۲

لیکن اسے زیادہ سے زیادہ ہنگامی جوش کہا جاسکتا ہے۔ کاہن کی حرکتوں نے حلیمہ کے دماغ کی کوئی ایسی کھڑکی کھول دی تھی جس کے متعلق اُسے پتہ نہ تھا۔ اس لئے چند دنوں کے لئے شکوک واوہام حلیمہ کو گھیرے رہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے چھپے دبے پہلوؤں پر غور کرتی رہی اور آخر کوئی تسلی بخش جواب نہ پاکر شاید تحت الشعوری طور پر مایوس ہو کر مطمئن ہو گئی۔ سوال کا معقول جواب اگر نہ ملے اور آدمی اپنی پریشانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس سوال سے آنکھیں چرانے لگے تو اسے بھی ایک طرح کی تسلی ہی تو کہا جائے گا۔ حلیمہ کو بھی ایسا ہی اطمینان ملا تھا۔ اُس نے اس پریشان کُن سوال ہی کو اپنے ذہن پر سے کھرچ ڈالا۔

اور پھر گھر کے دھندے، چولہے چوکے کی فکر، بکریوں اور دراز گوشوں کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور سب سے بڑھ کر چھوٹے حضورؐ کو پالنا

پچڑھانے اور ان کے والدین کی مرضی کے مطابق انہیں مضبوط اور زور آور عرب بنانے میں اس کا بہت سا وقت کٹ جاتا تھا۔

حلیمہ کو ابن عبداللہ سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا تھا جو آج تک اُسے کسی کے بچے سے نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں قریش کے کئی بچوں کو گود لیا اور دودھ پلایا تھا۔ لیکن ادھر دودھ پلانے کی مدت ختم ہوتی اور حلیمہ کے دل سے بچے کی محبت بھی ختم ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ بچوں کو مال تجارت سمجھا کرتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ مال تجارت ہی تھے دوسروں کے بچے۔ انہیں دودھ پلانا اور ان پر بناوٹی محبت نچھاور کرنا ہی تو حلیمہ کی تجارت تھی۔ اس لئے وہ دودھ پینے کی مدت ختم ہونے کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کیا کرتی تھی۔ مہینے، دن اور گھنٹے گنا کرتی اور جب مدت ختم ہو جاتی تو اس کے لئے گویا عید ہوتی۔ وہ بڑی خوشی اور بے صبری کے ساتھ مکے واپس جاتی اور بچوں کو اُن کے والدین کے سپرد کر دیتی۔

لیکن ابن عبداللہ کے ساتھ تو معاملہ ہی اور ہو گیا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابن عبداللہ اس کا اپنا بچہ ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اس کا اپنا بیٹا عبداللہ جو آمنہ کے لال سے کچھ ہی بڑا تھا اُسے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ لوریاں سناتی تو چھوٹے حضورؐ کو، کھلاتی تو چھوٹے حضورؐ کو، لئے پھرتی تو چھوٹے حضورؐ کو اور عبداللہ حرث کے کندھے سے چپکا اپنی جھپکتی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھا اور مسکرایا کرتا تھا۔

جب کبھی حلیمہ کسی کام میں اُلجھی ہوتی چھوٹے حضور زمین پر بیٹھے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے کھیلا کرتے، تو انیسہ اور شمیمہ میں تکرار ہو جاتی۔ شمیمہ چاہتی کہ وہ چھوٹے حضورؐ کو گود میں لے کر خیمہ سے باہر نکل جائے اور انیسہ چاہتی کہ یہ فخر اُسے ملے۔ اس پر اکثر ان دونوں میں ٹھنی رہتی تھی اور فیصلہ کرنے کے لئے اکثر حلیمہ یا حرث کو آنا پڑتا تھا۔

قبیلے کے دوسرے افراد بھی چھوٹے حضورؐ کو اٹھانے اور سیر کرانے کے لئے بے چین رہا کرتے تھے۔ جب کبھی شمیمہ یا انیسہ انہیں گود میں اٹھائے باہر جاتیں کوئی نہ کوئی انہیں اچک لیتا۔ لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر یا لالچ دلا کر جس طرح بھی بن پڑتا۔

اس طرح آمنہؓ کے دُرِّیتیم نے بنی سعد کے خیموں کے محبت بھرے سائے میں دانت نکالے، پاؤں چلنا سیکھا اور صاف و شفاف، نکھری منجھی، ٹکسالی بولی سے اپنی توتلی زبان کو آشنا کیا۔ ہر چھٹے مہینے حلیمہ اپنے چھوٹے حضورؐ کو مکہ میں لے جاتی اور ماں سے ملا لاتی۔

تین سال بیت گئے۔

اب چھوٹے حضورؐ خاصے توانا ہو گئے تھے۔ بکریوں کے لئے چارے کی چھوٹی سی گٹھڑی اٹھا کر چند قدم لڑکھڑاتے ہوئے سے چلتے اور گٹھڑی کے اُوپر ہی گر جاتے۔ حرث ہنستا،

"گٹھڑی بڑی ہے اور تم چھوٹے ہو محمدؐ۔" وہ محبت سے کہتا۔

"چھوٹی چیز بڑی چیز کو نہیں اٹھا سکتی ابا۔"

"اونہوں ـــــ کیسے اٹھا سکتی ہے۔"

"چیونٹیاں کیسے اٹھا لیتی ہیں اپنے سے بڑے بڑے دانے۔"

"وہ تو چیونٹیاں ہوئیں۔" سرت مطالعے کی اس عجیب و غریب قوت پر حیران ہوتے ہوئے لاجواب سا ہو کر یونہی جواب دے دیتا۔

"وہ تو چیونٹیاں ہوئیں۔" چھوٹے حضور جیسے اپنے آپ سے سوال کرتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔

چھوٹے حضور کی اس خاموشی کو سرت نہ جانے کیا سمجھتا اور ان کا خیال بدلنے کے لیے زور سے پیٹھ پر تھپکی دے کر کہتا،

"اب اٹھ بھی چکو میاں ــــ بہت کام ہیں ابھی۔"

اور حضور جلدی سے اٹھ کر پھر گٹھری اٹھانے کی کوشش کرنے لگتے لیکن اُن کا خیال گٹھری اور چھوٹے بڑے کی اس تقسیم پر سے نہ ہٹتا۔ وہ رات کے وقت سونے سے پہلے پوچھتے۔

"ماں ــــ کیا چیونٹیاں اپنے سے بڑا دانہ صرف اس لیے اٹھا لیتی ہیں کہ وہ چیونٹیاں ہیں اور ہم اپنے سے بڑی چیز اس لیے نہیں اٹھا سکتے کہ ہم چھوٹے حضور ہیں۔"

حلیمہ ہنس پڑتی اور پوچھتی،

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔"

"ابا نے۔"

"کیا کہا تھا ابا نے۔"

"میں چارے کی گٹھری اٹھا رہا تھا تو ابا نے کہا گٹھری بڑی ہے تم چھوٹے ہو محمد۔ میں نے پوچھا تو چھوٹی چیز بڑی چیز کو نہیں اٹھا سکتی۔ ابا بولے اونہوں، کیسے اٹھا سکتی ہے۔ میں نے کہا تو چیونٹیاں کیسے اٹھا لیتی ہیں اپنے سے بڑے بڑے دانے۔ اس پر ابا بولے، وہ تو چیونٹیاں ہوئیں — یہ بھلا کیا بات ہوئی اماں۔"

اور حلیمہ اپنے نورِ عین کو جگر سے لگا کر کہتی،

"دانا بڑا ہوتا ہے لیکن بھاری نہیں ہوتا۔ چیونٹیاں چھوٹی ہوتی ہیں لیکن اُن میں ایک خاص وزن اٹھانے کی طاقت ضرور ہوتی ہے۔ دانہ جسامت میں بڑا لیکن وزن میں تھوڑا ہوتا ہے۔ اس لئے چیونٹیاں اٹھا لیتی ہیں۔"

"وزن کیا ہوتا ہے ماں۔"

اور حلیمہ چکرا جاتی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہتی،

"وزن ہوتا ہے — مثلاً میرا ہاتھ پکڑو۔"

اور چھوٹے حضورؐ مسکراتے ہوئے بستر میں سے نکل کر بیٹھ جاتے اور اپنی رضاعی ماں کا ہاتھ پکڑ لیتے۔

"اب اٹھاؤ اسے۔"

ہاتھ آسانی کے ساتھ اٹھ جاتا۔

"زور لگا؟"

"ناں۔"

"اچھا اب اٹھاؤ۔"

چھوٹے حضور زور لگانے لگتے۔

"لگاؤ زور ___ شاباش" حلیمہ کہتی۔

ابن عبداللہ کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہو جاتا۔

"شاباش ___ اور"

"نہیں اٹھتا ماں ___" چھوٹے حضور ہانپنے لگتے۔

شیمہ کہتی ___ "میں اٹھاؤں"

انیسہ بولتی ___ "میں اٹھا سکتی ہوں"

اور عبداللہ منہ بسور کر کہتا،

"ہم سے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ نہیں تو میں فوراً اٹھا لوں امی کا ہاتھ"

"لو بھئی ہمارے پہلوان کو بھی آزما لو" حرث عبداللہ کو اٹھا کر آگے کر دیتا۔ عبداللہ لپک کر آتا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر زور لگانے لگتا۔

"شاباش ___ اور ___ اور" حرث بھی اٹھ کر اپنے بستر میں بیٹھ جاتا "لگے زور ___ ارے بھاگ بھنڈی"

"اچھا اب تم دونوں زور لگاؤ"

ابن عبداللہ اور ابن حرث ماں کے ہاتھ پر زور آزمائی کرنے لگتے۔

"اٹھ گیا ___ اٹھ گیا"

دونوں خوشی سے ناچتے۔

"دیکھا محمد" حلیمہ ابن عبداللہ کو بغل میں دبا کر ان کا ماتھا چومتے ہوئے کہتی "اسے کہتے ہیں وزن۔ پہلے ہاتھ ہلکا تھا تم نے اٹھا لیا۔ پھر میں نے

زور لگا کر ہاتھ کو بوجھل کر دیا اور تم سے نہ اٹھ سکا۔"

"اچھا!" چھوٹے حضورؐ داتائی سے فرماتے۔ "تو داتا زور نہیں لگاتا ہوگا ۔۔۔ سمجھ گیا۔"

حرث زور سے ہنس پڑتا،

"خوب سمجھے ہو میاں ۔۔۔۔۔ تم ماں بیٹا دونوں ہی فلسفی ہو ۔۔۔ کہیں بڑے ہو کر کاہن نہ بن جاؤ۔ مجھے تو یہی خطرہ ہے۔"

حلیمہ گھبرا کر حرث کی طرف دیکھتی۔ اس کے چہرے پر خوف کھنڈ جاتا اور وہ پریشان لہجے میں کہتی،

"ایسا نہ کہو حرث۔"

اور لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ چھوٹے حضورؐ کے نازک سے جسم کے گرد لپٹ جاتے وہ انہیں زور سے اپنے ساتھ بھینچ لیتی جیسے کسی بری چیز سے بچانا چاہتی ہو اور کہتی،

"میرا لال کیوں بننے لگا کاہن ۔۔۔۔۔ زمین و آسمان کے مالک اسے اس شر سے محفوظ رکھیں۔ وہ تو بڑا ہو کر سردار بنے گا۔ کعبے کے سامنے ریشمی چادر بچھا کر اس پر بیٹھے گا۔ اس کے سامنے عرب کے بڑے بڑے سردار سر نہوڑائے بیٹھے ہوں گے۔ پھر میں جاؤں گی۔ بڑھاپے کے بوجھ سے ڈولتی ہاتھ میں لٹھیا، کانپتا ہوا سر اور سفید بال۔ میں کہوں گی محمدؐ ۔۔۔۔۔ اور ارد گرد بیٹھے ہوئے سردار چونک کر میری طرف دیکھیں گے۔ وہ سوچیں گے گستاخ بڑھیا نے شاہ عرب کے حضور میں گستاخی کی ہے۔ تلواریں شڑاپ سے

میان میں سے نکل آئیں گی۔ بجلی کی سینکڑوں شاخوں کی طرح دھوپ میں چمکیں گی اور پھر ایک آواز پکارے گی، ٹھہرو ـــــ بڑھیا کو ہمارے حضور پیش کیا جائے، یہ آواز میرے لال کی ہوگی۔"

اور وہ جھک کر پُر نور چہرے پر ایسے پُر محبت بوسوں کی بارش کر دیتی جن میں عقیدت کا رنگ زیادہ ہوتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے حلیمہ کے تصور کی تیز نگاہیں مستقبل کو حال میں بدل چکی ہیں۔ وہ چند لمحوں کے لئے سچ مچ اپنے تصورات کو حقیقت سمجھ لیتی۔ بچے بھی دم بخود سنا کرتے۔ جب حلیمہ چپ ہو جاتی تو شیمہ پوچھتی،

"پھر کیا ہوا اماں۔" جیسے حلیمہ کوئی دلچسپ کہانی سنا رہی ہو۔

"ہاں صاحب!" حرث مسکرا کر کہتا، "پھر کیا ہوا آگے بھی کہو۔"

حلیمہ جھینپتی ہوئی سی نگاہوں سے حرث کی طرف دیکھتی اور کہتی۔

"تم تو مذاق سمجھتے ہو ـــــ میں سچ کہتی ہوں ـــــ ایسا ہی ہوگا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔"

"یہ تو خیر کاہن بنے سو بنے تم ابھی سے کہانت کا دعویٰ کرنے لگیں۔"

"پھر وہی ـــــ"

"ماں پھر کیا ہوا۔" انیسہ کہتی۔

"پوچھو اپنے باپ سے ـــــ"

"ابا تمہیں آتی ہے یہ کہانی۔" عبداللہ باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال دیتا

"ہاں!" حرث شریر نگاہوں سے حلیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا

"آتی کیوں نہیں۔ یہ تو عرب بھر میں مشہور ہے۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا۔" شمیہ اور رابعہ دونوں ہمہ تن گوش ہو جاتیں۔ ابن عبداللہ بھی کہانی میں دلچسپی لینے لگتے۔

"ہاں تو کہاں سے چپ ہو گئی تھیں۔" حرث تمسخر سے کہتا۔ "آخری بات کیا کہی تھی۔"

"تلواریں ــــ" شمیہ کہتی

"تلواریں نہیں جی کچھ اور تھا۔" حرث کہتا۔

"سردار کی کوئی بات تھی۔"

"اونہوں ــــ!"

"یہ آواز میرے لال کی ہو گی۔" ابن عبداللہ بول پڑے۔

"ہاں ــــ" حرث مسکرا کر بچے کی طرف دیکھتا۔ "تم ضرور کاہن بنو گے میاں ــــ غضب کی یاد داشت ہے تمہاری۔"

"حرث!" حلیمہ چلا پڑتی۔ "میں لڑ پڑوں گی سچ کہتی ہوں۔ اگر یہ کاہن کاہن کی رٹ لگائے رہے تو۔"

"ہاں تو ــــ" حرث نے شریر آنکھوں سے حلیمہ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ "اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ عرب کی خدمت میں وہ بڑھیا حاضر کی گئی۔ شاہ عرب نے آنکھیں نکال کر کڑکتی ہوئی آواز میں کہا ــــ تو کون؟" بڑھیا نے لاٹھی ٹیک کر دوسرے ہاتھ سے اپنی کبڑی پیٹھ سیدھی کی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں شہزادی ــــ شہزادی؟ میرا دوں

طرف سے غلغلہ سا اٹھا۔ سردار حیران ہو کر اپنے اپنے انگوٹھے چوسنے لگے فضا میں چیں چیں کی آوازیں بھنبھنانے لگیں۔ شاہ عرب نے غصے اور نفرت سے اپنے سرداروں کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور حاجب کو حکم دیا "سردارانِ عرب کی خدمت میں ہمارے خزانۂ عالیہ سے وہ تمام جھنجھنے پیش کیے جائیں جو ہم نے ملکِ شام پر حملہ کرتے وقت بطورِ مالِ غنیمت لوٹے تھے" حکم کی دیر تھی، تمام نوکر چاکر، درباری، چپڑاسی، سپاہی، فوج یک دم خزانے کی طرف بھاگ پڑے، وہاں جھنجھنوں کی کیا کمی تھی۔ فوراً ڈھیروں جھنجھنے سردارانِ عرب کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ تلواریں جو شڑاپ سے تڑپ کر میانوں سے باہر نکل پڑی تھیں اور بجلی کی سینکڑوں شاخوں کی طرح مکہ کی چمکدار دھوپ میں تڑپ گئی تھیں جھنجھنا کر زمین پر گر پڑیں اور سردارانِ عرب جھنجھنے بجا بجا کر بڑھیا کے ارد گرد ناچنے لگے۔ اُن کی سفید اور کھچڑی داڑھیاں ہوا میں اڑ رہی تھیں اور ناچ بجا رہے تھے ٹھناٹھن کہ دھنادھن۔ دھنادھن کہ ٹھناٹھن۔"

"لیکن بڑھیا کا کیا ہوا؟"

"سنو تو —— ہاں تو ٹھناٹھن ناچے چلے گئے سردار۔ اتنے میں شاہ عرب نے پھر کڑکتی ہوئی آواز میں کہا، "خاموش ——!" سب خاموش ہو گئے۔ سردار نے پوچھا، "بڑھیا تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو اور کیا پیغام لائی ہو۔؟"

"لیکن بڑھیا تو کہہ چکی تھی کہ وہ شہزادی ہے۔ دوبارہ پوچھنے کی

کیا ضرورت تھی؟" ابن عبداللہ نے سوال کیا۔
"تم چپ رہو بیٹا ــــ یہ تو یونہی باتیں کیا کرتے ہیں تمہارے ابا ــــ آؤ سو جائیں ہم۔"
"مگر ایسا کبھی ہوا بھی ہے ماں ــــ ابا کے بھی تو داڑھی ہے یہ تو جھنجھنے لے کر نہیں ناچتے۔"
"یونہی کہہ رہے ہیں۔"
"تو جھوٹ بول رہے ہیں ابا ــــ؟" ابن عبداللہ نے حیرت ناک سنجیدگی سے پوچھا۔
"یونہی باتیں بنا رہے ہیں۔"
"ابا جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں ماں ــــ آپ تو کہتی تھیں جھوٹ نہیں بولا جاتا۔"
"ابا جھوٹ نہیں کہہ رہے بیٹا ــــ یونہی تمہیں ہنسانے کے لئے کہانی سُنا رہے تھے۔ لو اب سو جاؤ میرے لال ــــ"
"ہاں بھئی سو جاؤ ــــ" حرث آج زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کر رہا تھا۔ اگر یہی کہانی ہاتھ پیر کی ایسی ہی حرکتوں کے ساتھ وہ کہیں اور بیان کرتا تو شاید سننے والے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور اس میں شبہ بھی نہیں۔ اس کے اپنے بچے اس کہانی کو سُن سُن کر مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ پکڑ کر دہرے ہو گئے تھے۔ لیکن ابن عبداللہ کا غیر معمولی طور پر سنجیدہ چہرہ ان سب میں نمایاں تھا۔ یہ کیوں نہیں ہنستے؟ ــــ کیا وجہ

ہے ۔۔۔۔؟ کیوں؟ حمزہ نہ جانے کیوں پریشان ہو گیا تھا۔ وہ شاید یہی سوچ رہے ہوں گے۔ ابن عبداللہ ۔۔۔۔ تین سال کا بچہ ۔۔۔۔ اُسے جھوٹا سمجھ رہا ہے۔ کس قیامت کی سنجیدگی سے اُس نے حلیمہ سے پوچھا تھا، "ابا جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں ماں ۔۔۔۔"

جھوٹ ۔۔۔۔؟

خیمے میں چاروں طرف سکوت چھا گیا تھا۔ کہانی ادھوری رہ گئی تھی اس لئے بچے مچلے تو تھے۔ سب نے باری باری ہنس ہنس کر حمزہ سے کہا تھا،

"جھنجھنوں والی کہانی سناؤ ابا۔"

لیکن حمزہ نے سب کو ڈانٹ ڈانٹ کر سلا دیا تھا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ ان سب کو کیوں اس طرح بڑی حد تک بے دردی کے ساتھ ڈانٹ رہا ہے لیکن بچے اس ایکا ایکی تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر ہی سو بھی گئے تھے۔ حلیمہ بھی سو چکی تھی۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے ہوا میں سنائی دے رہے تھے ۔۔۔۔

لیکن حمزہ جاگ رہا تھا۔ وہ چھت سے آنکھیں لگائے سوچ رہا تھا۔ جھوٹ؟ اگر ابن عبداللہ کے غیر معمولی ذکی ذہن میں یہ قائم ہو گیا کہ حمزہ ۔۔۔۔ اُس کا رضاعی باپ جھوٹ بول رہا ہے۔ اُسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے ۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔؟

آج سے پہلے حمزہ نے ایک دفعہ نہیں دن میں ہزار دفعہ جھوٹ بولا

تھا۔ ہاں ——— جھوٹ!

یہ تو ایک کہانی تھی۔ یونہی بچوں کو خوش کرنے کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈا تھا حرث نے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ کڑے جھوٹ بولے تھے اس نے۔ اور صرف وہی نہیں اُس کے قبیلے کے بہت کم لوگ ایسے تھے جو جھوٹ کو بُری چیز سمجھتے ہوں۔ لوگ عام طور پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ دوسروں کی بکریوں کا دودھ دوہ کر پی جاتے اور پھر جھوٹ بول دیتے۔ دیوتاؤں کی قسمیں کھا جاتے۔ دوسروں کی عزت اُتارنے کے لئے جھوٹ بول دیتے۔ معمولی سے معمولی چیز حاصل کرنے کے لئے جھوٹ بول دیتے۔ بالکل یونہی ہوتا رہا ہے قبیلے میں ———

صرف یہی نہیں۔ جھوٹ کو بُرا سمجھا ہی نہیں جاتا تھا سرے سے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ جھوٹ بولنے میں عیب ہی کیا ہے۔ جان بچانے اور دوسروں کی نگاہ میں باعزت سمجھے جانے کا آسان طریقہ جھوٹ تھا۔ ہاں جس کو کسی کے جھوٹ سے نقصان پہنچتا وہ جھوٹ کو بُرا کہتا۔ حلیمہ قبیلے بھر میں واحد تھی جو جھوٹ کو محض جھوٹ کی حیثیت سے بُرا کہتی تھی اور حرث اُس کی اس بات پر مسکرا دیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا حلیمہ کو عقل نہیں ہے۔ جھوٹ تو سیاست کی بنیاد ہے۔ پھر اس میں برائی کیوں سمجھی جائے۔

لیکن آج ———؟

معبود ———!

حرث کا سر گھوم رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل پر

کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہے۔ ابن عبداللہ کا معصوم چہرہ، اس پر وہ قیامت کی سنجیدگی جس پر ہنسی بھی آتی تھی لیکن ہنسنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اُن کی سیاہ بے حد سیاہ اور تیز چمکتی ہوئی آنکھوں میں حیرتوں کے کتنے معصوم لیکن عظیم دریا لہرا رہے تھے۔ اُن کے پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں کی تہوں میں کتنی بیباک جراتیں کانپ رہی تھیں۔ اُنہوں نے کتنی سادہ سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا،

"ابا بھی جھوٹ بولا کرتے ہیں ماں"

یہ لفظ ——— یہ تیر سے زیادہ تیز لفظ حرث کے ذہن میں جہنم کی طرح تپ رہے تھے۔

لیکن کیوں ——— ؟

حرث نے سوچا۔ اگر ابنِ عبداللہ نے یہ کہہ دیا ہے تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ آخر تین سال کے بچّے کی ہر بات کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے۔ کہہ دیا ——— بس کہہ دیا۔ جو لفظ ذہن میں ابھرا گیند پر رکھی ہوئی گولی کی طرح لڑھک کر زبان پر آگیا۔ شعور اتنا بیدار تو نہیں کہ ہر لفظ کا محاسبہ کر سکے، آخر عقل اتنی تیز تو نہیں کہ جو کچھ کہے سوچ سمجھ کر ہی کہے۔

لیکن پھر بھی ——— ہاں ——— شاید!

شاید لفظ اتنے تیز نہیں تھے جتنا حرث سمجھ رہا تھا معمولی لفظ۔

"ابا بھی جھوٹ بولا کرتے ہیں"

ہاں میاں بولا کرتے ہیں۔ پھر ———؟ کر لو کیا کرتے ہو آبا کا۔ دے دو پھانسی آبا کو ——— کاٹ لو گردن ——— چھی ———!

لیکن پھر ——؟

وہ قیامت کی سنجیدگی، وہ غضب کا بھولا پن —— اُونہہ!

لیکن ہاں ——!

حرث اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُسے پیاس نہیں تھی لیکن اُس کا جی چاہتا تھا پانی پینے کو، باہر اوس پڑ رہی تھی۔ لیکن اس کا نہانے کو جی چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم کی پور پور میں تنور دہک رہے ہیں۔

تین سال کے بچے کے چہرے پر کھدی ہوئی سنجیدگی حرث کی نگاہوں کے سامنے مجسم ہو گئی۔ لیکن کیا یہ صرف سنجیدگی ہی تھی۔ محض بچپن کا بھولا پن، آنکھوں میں کانپتی ہوئی حیرتیں صرف حیرتیں تھیں ——؟ ہونٹوں کی نہوں میں کانپتی ہوئی جرأتیں —— محض جرأتیں تھیں؟ اور کچھ نہیں تھا —— کچھ نہیں! یہ خود اعتمادی —— اپنے آپ پر اتنا غیر معمولی اعتماد —— غیر معمولی —— قطعی غیر فطری!

اس نے کئی بچے دیکھے تھے۔ اس کے اپنے بچے تھے۔ روتے بسورتے ٹھنڈتے دبکتے، اور جھگڑتے ہوئے بچے، قبیلے والوں کے بچے تھے۔ گندے بے ڈھنگے، گول مٹول بلبلاتے ہوئے بچے۔ اور ایک یہ تھا۔ کتنی تیز اور صحیح یادداشت تھی۔ کتنا تیز دماغ، قوت مطالعہ کتنی غیر معمولی تھی۔ بات کو کس طرح تولتا تھا ——!

اور پھر یہ بے پناہ اعتماد ——! اپنے ہر لفظ پر مافوق الفطرت یقین ——!

کیوں ——؟

حرث گھبرا کر اٹھا اور پانی کے مشکیزے کی طرف لپکا۔ پانی چھری کی طرح اس کا گلا کاٹتا ہوا معدے میں پہنچ گیا اور حرث کی نگاہ یک دم ابن عبداللہ کی طرف کھنچ گئی۔

حلیمہ کے گول بازو پر سر رکھے ابن عبداللہ میٹھی نیند سو رہے تھے۔ چاند کی ہلکی سی شعاع خیمے کی درز میں سے ہوتی ہوئی ابن عبداللہ کے گندمی چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وسیع پیشانی پر محرابوں کی طرح کھچی ہوئی باریک بھنویں، بھنوؤں کے درمیان سرخ لکیر، پوپلا موٹا چہرہ، اونچی ناک، باریک ہونٹ اور صراحی کی ایسی گول گاؤدم گردن۔ ان جزئیات پر خیمے کی چھت میں لگے ہوئے جوڑوں سے قاشوں میں کٹ کر بکھری ہوئی روشنی اور سائے کے دلفریب کھیل کھیلتی ہوئی چاند کی حسین شعاع ——— حرث سناٹے میں آگیا ——

تین سال سے یہ بچہ اس کے خیمے میں پل رہا تھا۔ اس نے اسے گودوں کھلایا تھا۔ انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلایا تھا۔ اس تھوڑی سی عمر کے ہر لمحے پر اپنی زندگی کی مہریں ثبت کی تھیں۔ اور پھر بھی —— آج —— حرث حیرت کے ساتھ اسی بچے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ بچہ ابھی ابھی اس کے خیمے میں آیا ہو۔ یا زیادہ صحیح طور پر جیسے وہ زندگی میں پہلی دفعہ اپنے خیمے میں داخل ہوا ہو۔

اس نے دیکھا —— خوب غور سے۔ اور اس کی پریشانی رفع ہوگئی

تین سال کے بچے نے ایک معمولی سا فقرہ کہہ کر اُسے پریشان کر دیا تھا اور اب وہ پریشانی خود بخود رفع ہوگئی۔ وہ سوالات جو چنگاریوں کی طرح اس کے جلتے ہوئے خیالات سے جھڑ رہے تھے، اپنا جواب آپ ہی بن گئے۔

حرث نے غیرارادی طور پر سوچا: "ہاں —— ابا بھی جھوٹ بولا کرتے تھے لیکن اب نہیں بولیں گے ۔"

لیکن کیوں ——؟ کیوں نہیں بولیں گے ابا جھوٹ ——!

کیونکہ اگر ابا نے جھوٹ بولا تو محمدؐ ناراض ہو جائیں گے۔ وہ پھر اپنے ابا سے نہیں کھیلیں گے اور حرث خود ہی اپنے بچوں ایسے خیال پر مسکرا دیا ——

اور دوسرے دن صبح واقعی محمدؐ ناراض تھے

وہ ہر روز صبح آنکھ کھولتے ہی لڑکھڑاتے، گرتے، سنبھلتے حرث کے کمبل میں آجایا کرتے تھے۔ کمبل اٹھاتے اور اس کی پیٹھ سے چمٹ جایا کرتے۔ وہ ہلکی ہلکی نیند کے اونگھتے ہوئے سے نشہ میں ڈوبا اس سنسنی کو محسوس کیا کرتا جو ننھے ننھے ہاتھوں کے لمس سے اس کی رگوں میں رینگنے لگتی۔ وہ لطف اور ایک عجیب نشہ بار لذت کے زیر اثر آگے پیچھے ہلتا۔ پھر اس کا ہاتھ دھیرے سے اٹھ کر گدگدی پوپلی سی رانوں پر لہراتا جو اس کے جسم پر لپٹی ہوتیں۔ وہ ان پر ہاتھ پھیرتا اور اپنی پیٹھ کے ساتھ دبا لیتا۔ پھر ہلکی سی

آواز سنائی دیتی ــــــ،

"ابا ــــ!"

"میرے چاند!" وہ گنگھیائی ہوئی آواز میں کہتا۔

اور اُس کا چاند اور زور سے اس کے ساتھ لپٹ جاتا کتنی عجیب سنسنی ہوتی تھی۔ کتنی عظیم لذّت محسوس کرتا تھا وہ۔ اس کے جسم میں محبت کے فوارے اُبل پڑتے تھے۔

لیکن آج ــــ آج وہ سنسنی ــــ وہ عظیم لذّت!

رات وہ کیوں پریشان ہو رہا تھا؟ اس سوال کا جواب اُسے مل گیا جب آپ کی محبت، اور آپ کی اُلفت کا مرکز آپ کے پاس ہو تو اُس کی اہمیت کا اندازہ آپ شعوری طور پر نہیں کر سکتے۔ آپ کا لاشعور اس خزانے کو شعور سے بچائے رکھتا ہے۔ لیکن جب مرکز کھو جائے ــــ خواہ کتنی تھوڑی دیر کے لئے ہی کیوں نہ جدا ہو جائے ــــ تو لاشعور اپنے خزانے کو شعور کے سپرد کر دیتا ہے۔ حرث کل رات غیر شعوری طور پر پریشان تھا۔ اُسے اپنی پریشانی کی وجہ جواز نہیں ملتی تھی لیکن آج صبح وہ شعوری طور پر پریشان ہو گیا اور اُس نے خود ہی کہا،

"محمدؐ ــــ! جاگ رہے ہو؟"

"ہاں!"

"آج اپنے ابا کے پاس نہیں آؤ گے ــــ"

اور محمدؐ چپ ہو گئے۔

حلیمہ نے سر پر ہاتھ پھیر کر محبت بھرے انداز میں کہا۔
"اپنے ابا کے پاس جاؤ میرے لال۔"
حلیمہ کے لال نے معصوم سوچتی ہوئی سی آنکھوں کے ساتھ حلیمہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔
"جاؤ ــــ" حلیمہ نے بوسہ لیتے ہوئے کہا۔
"لیکن وہ جھوٹ جو بولتے ہیں۔" وہی معصوم سنجیدہ اور معتمد آواز ــــ وہی تیز تلوار کی طرح کاٹتے ہوئے الفاظ۔ حرث بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا اور خواہ مخواہ ادھر اُدھر دیکھ کر یونہی ہوں ہاں کہہ کر دروازے کا کمبل اٹھایا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔
"ابا ناراض ہو گئے ماں۔" ابن عبداللہ نے پوچھا
"تم جو نہیں گئے ان کے پاس۔" حلیمہ نے کہا۔
"لیکن وہ جھوٹ جو بولتے ہیں۔"
"جھوٹ نہیں تھا بیٹا ــــ وہ تمہیں ہنسانے کے لئے یونہی کہہ رہے تھے۔"
"ہنسانے کے لئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے ماں۔"
"کبھی کبھی۔"
"تو میں آپ کو کبھی نہیں ہنسایا کروں گا۔"
حلیمہ کو ہنسی آ گئی لیکن اُس نے ہنسی کو دبا کر کہا۔
"تو اب تم ابا کے پاس کبھی نہیں جاؤ گے۔"

"جی تو بہت چاہتا ہے۔"

"تو پھر جاتے کیوں نہیں۔"

"ماں۔۔۔" محمدؐ حلیمہ سے لپٹ گئے اور رونے لگے "ابا سے کہہ دو جھوٹ نہ بولا کریں۔ آپ کہتی تھیں جھوٹ بہت بُرا ہوتا ہے۔ ابا اتنے اچھے ہو کر اتنا بُرا کام کیوں کرتے ہیں۔"

حلیمہ نے انہیں سینے سے لگا لیا۔

خیمے کے دروازے پر پڑا ہوا کمبل آہستہ سے اٹھا۔ حرث ہارا ہوا سا اندر آیا اور لپک کر محمدؐ کو اٹھا لیا اور زور سے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

۴

خیموں میں معمول کے مطابق ہلچل ہو رہی تھی۔ بنو سعد کے دوسرے لوگ اپنی اپنی بکریاں کھول رہے تھے اور انہیں ایک ریوڑ میں جمع کر رہے تھے چاروں طرف سے عورتوں، مردوں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ہمسائے نے زور سے آواز لگائی،

"حرث ــــ چلو۔"

اور حرث نے خیمے سے نکلتے ہوئے کہا،

"تیار ہوں بھئی ــــ ذرا میری بکریاں دیکھنا میں ابھی آیا۔"

اور پھر خیمے میں آگیا۔ اندر حلیمہ اس کے لئے ستو تیار کر رہی تھی۔ آج تو بڑے زوروں کا کھانا تھا۔ دودھ میں پکے ہوئے ستو جن میں کھجوریں ملا کر انہیں اور بھی خوش ذائقہ کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ بچوں کو دے

دیا گیا تھا اور بچے بڑے مزے سے اسے کھا کر انگلیاں چاٹ رہے تھے

البتہ عبداللہ تھا جو منہ لبسورے خیمے کے ایک کونے میں ٹھنٹھنا رہا تھا

عبداللہ کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ اُسے حصہ سب سے بعد میں ملا ہے اور گو

ستو سب کو ایک سے ہی تقسیم ہوئے تھے لیکن عبداللہ کو شک تھا کہ

دوسرے بہن بھائیوں سے تھوڑے ہیں۔

حلیمہ نے اُسے بہلانے کے لاکھ جتن کئے تھے لیکن وہ کسی طرح مان

ہی کے نہیں رہتا تھا اس لئے حرث اسے بہلانے میں مشغول تھا۔

"دوسروں سے زیادہ ہیں بھئی۔"

"تم دیکھو تو سہی۔"

"ارے ہاتھ میں لو ـــ یوں ـــ ہاں ـــ ہیں ناں زیادہ۔"

"یہ بھی ایک ہی رہی ـــ اچھا تو میرے حصے میں سے لو۔ یہ لو۔ بس۔"

"لیکن مجھے پہلے کیوں نہیں دیئے تھے۔" عبداللہ نے بکھرتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال ٹیڑھا ہے۔" حرث نے منہ بنا کر کہا۔ "سوال پیدا ہوتا ہے کہ

حضور عبداللہ کو پہلے کیوں نہیں دیئے گئے ستو ہوں ـــ ہوں۔"

"منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" حلیمہ چمک کر بولی۔ "دو ہنٹر دکھاؤ اسے ذرا

ہوش آئے۔ اسے تھوڑا بہت۔"

"کیوں صاحب!" حرث نے عبداللہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا

ارادے ہیں۔ عرض کروں ایک گرما گرم قسم کا دو ہنٹر۔"

عبداللہ اور بکھر گیا۔

"بھئی یہ تو بڑی مصیبت ہے۔ تو چاہتے کیا ہو؟"

"ستو پہلے کیوں نہیں دیئے؟"

"ارے بھئی غلطی ہو گئی اب معاف کر دو۔ اور کیا کہتے ہو؟"

"لیکن ابا سے تو پہلے مل رہے ہیں تمہیں ستو" ابن عبداللہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ——— دیکھ لو ——— تمہارے رضاعی بھائی کیا کہہ رہے ہیں ابے ہم سے پہلے ملے بھئی ———"

"ان سے پہلے کیوں نہیں دیئے؟"

"تو اب کیا کریں؟"

عبداللہ رونے لگا۔

"تم رہنے دو میں درست کر لوں گی اسے۔"

"تو مار کھاؤ گے ——— ایں!" حرث کی اونچی "ایں" سے عبداللہ کانپ کر خاموش ہو گیا اور پھر اُسے ہنستا دیکھ کر رونے لگا۔

"تمہارے بس کا یہ روگ نہیں ہے میاں ——— تم بکریاں چراؤ ——— یہ آدمی ہیں آدمی؟"

باہر سے پھر آواز آئی،

"یہ اندر کیا ہو رہا ہے حرث ——— باہر آ بھی چکو یار۔"

"آیا بھئی آیا ———" حرث نے آواز لگائی اور حلیمہ سے کہا،"حلیمہ مارنا نہیں ——— مان جائے گا خود ہی۔"

"اُلٹی ضد کرتا ہے ــــ"

"بچہ تو ٹھہرا ــــ" حرث نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ دروازے کا کمبل اٹھا کر وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹھک گیا اور مڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے کہا ــــ چھوٹے حضورؐ ــــ اب ہماری تمہاری صلح ہو گئی نا ــــ ناراضگی وارضگی ختم۔"

اور چھوٹے حضورؐ نے مسکرا کر حلیمہ کی طرف دیکھا۔

"شاباش ــــ" اس نے ابن عبداللہ کے گالوں پر انگلی سے پیار کرتے ہوئے کہا، اور پھر حلیمہ سے مخاطب ہو کر بولا،

"حلیمہ یہ عبداللہ نے ایسی ریں ریں لگائی کہ میں تم سے ایک بات کہنا ہی بھول گیا۔"

"کیا ــــ؟"

"اگر تم مناسب سمجھو تو ــــ میرا مطلب ہے آج محمدؐ کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"اپنے ساتھ ــــ؟" حلیمہ نے حیرت بھری آنکھوں سے حرث کے چہرے کی طرف دیکھا، "کہاں؟"

"جنگل ــــ" حرث نے جھجکتے ہوئے کہا، جیسے کوئی بہت بڑی چیز حلیمہ سے مانگ رہا ہو، "اس میں کوئی خاص حرج نہیں۔"

"وہ کس لئے۔"

"یونہی ــــ میرا مطلب ہے۔ آج صبح بہت تکلیف ہوئی مجھے۔ محمدؐ میرے پاس نہیں آئے تو مجھے ایسا لگا ــــ بہت برا سا لگا ــــ میرا جی چاہتا ہے آج میں ساتھ لے جاؤں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"اور جب محمدؐ اپنی ماں کے پاس چلے گئے تب کیا کرو گے۔"

"بہت بھاری پتھر رکھنا پڑے گا سینے پر۔" حرث نے خاصے جذبات کے ساتھ کہا۔ "لیکن ابھی تو کم سے کم ایک سال ہمارے پاس ہیں ــــ کیوں محمدؐ چلو گے ہمارے ساتھ۔"

عبداللہ رونا دھونا بھول کر خوشی سے ناچتے ہوئے بولا،

"میں بھی چلوں گا ــــ میں بھی چلوں گا۔"

اور شیمہ اور انیسہ نے بھی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا،

"ہم بھی جائیں ماں۔"

"جنگل میں عکاظ کا میلہ نہیں لگ رہا ہے۔" حلیمہ نے ڈپٹ دیا۔

"ارے بھئی ہماری گزارش کا کیا ہوا۔" حرث نے تمسخر کے انداز میں کہا، "ہم نے بھی ایک عرضی گزاری تھی حضور میں۔"

"جنگل کا معاملہ ہے، مجھے ڈر لگتا ہے بابا، سچی بات ہے۔"

"ہا ہا ہا ــــ!" حرث نے حلیمہ کو نرم پڑتا دیکھ کر ذرا ہاتھ پیر کھول کر کہا، "ڈر لگتا ہے تو میں کیا ساتھ منہ دیکھنے جاؤں گا ــــ ارے بھئی ڈر کا ہے کا۔"

"پرایا بچہ ہے ـــــ کہیں ـــــ چھلاوے بھوت پریت بہت ہوتے ہیں جنگل میں۔"

"وہ لو یہ کاٹکڑا باندھ دو جو اس رملہ کاہن نے ردِ بلا کے لئے دیا تھا۔"

"اُس کاہن کا نام نہ لو میرے سامنے۔" اور اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر اس انگلی پر پھرنے لگا۔ جس میں بی بی آمنہ کی دی ہوئی انگوٹھی تھی۔ "پاکھنڈی کہیں کا۔"

"بھئی حرث ـــــ ہم جا رہے ہیں۔" باہر سے آواز آئی "تم آجانا جب تمہارا جی چاہے۔"

"آیا بس ـــــ" اس نے ابن عبداللہ کی طرف دیکھ کر کہا "آؤ محمدؐ ـ آؤ عبداللہ ـــــ استاد آج تمہیں سیر کرا لائیں ـــــ خوب دُور دُور کی۔"

دونوں بچے خوشی سے اچھلتے کودتے حرث کی طرف بڑھے۔ حرث کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا،

"محمدؐ دائیں کندھے پر عبداللہ بائیں کندھے پر ـــــ ہا ہا ـــــ ارے سنبھل کر بھائی لوگ۔"

دونوں بچے اچک اچک کر سوار ہو گئے۔

لڑکیوں نے رشک کی نگاہوں سے لڑکوں کی طرف دیکھا اور ایک دوسرے کا منہ تک کر رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چھلکے پڑتے تھے۔ جنہیں وہ حسب مقدور پی رہی تھیں۔

حرث دونوں لڑکوں کو کندھوں پر اٹھائے بلند آواز میں گاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"اچھا ـــ تو یہ وجہ ہو گئی تھی دیر کی" ہمسایوں نے ہنس ہنس کر کہا۔

"آج ساتھ چلیں گے شہزادے۔"

"ہاں!" حرث نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "میرا چھوٹا بھائی ابو ثوران کہاں ہے۔"

"وہ رہا ـــ تمہاری بکریاں کھول رہا ہے۔"

"ابو ثوران ـــ" حرث نے آواز لگائی "یہ عبداللہ کو تم تھامو بھائی میں کھولتا ہوں بکریاں!"

"ابھی آیا ـــ" ابو ثوران نے کہا "ایک بکری رہ گئی ہے۔"

"لیکن اپنے ساتھ جنگل میں لے جاؤ گے بچوں کو" ایک نے پوچھا۔

"ہاں ـــ"

"محمدؐ کو بھی"

"ارے بھئی کہہ تو دیا کہ ہاں ـــ ہاں ـــ ہاں"

"حیرت ـــ حلیمہ نے کیسے اجازت دے دی"

"تو دیر کیوں ہو گئی ـــ اُسے ہی تو منا رہا تھا"

اور دوسرا بولا

"اس طرح بچوں کو خیمے میں قید رکھنا تو غلطی ہے۔ خاص طور سے لڑکوں کو باہر کھلی ہوا میں گھومیں پھریں گے اور بھاگیں گے تو تگڑے رہیں گے۔"

تیسرے نے کہا،

"ارے بھئی محبت سانس لینے دے تب نا۔ حلیمہ تو محمدؐ کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔"

"عبداللہ کا بھی تو یہی حال ہے۔"

"محبت کے شکار ہیں بیچارے دونوں۔ اگر ہماری مائیں ہم سے اس طرح کی محبت کریں تو ہمارا دم گھٹ جاتا۔"

ابو ثوران آگیا ——

"یہ ذرا عبداللہ کو تھامنا۔"

"محمدؐ کو دے دو بڑے بھائی —— ذرا باتیں کریں گے ہم دونوں۔ ہم دونوں میں بڑا یارانہ ہے —— کیوں محمدؐ؟"

"جی —— !" حرث نے کہا "اور ہم دونوں میں بھی کوئی ایسی دشمنی نہیں —— بکریاں ہانکو!"

"اور عبداللہ؟" ابو ثوران نے پوچھا۔

"تمہارے کندھے پر —— !" حرث نے عبداللہ کو ابو ثوران کے کندھے پر زبردستی بٹھا دیا —— "چلو ہانکو ——"

دوسرے نے قہقہہ لگایا اور بکریاں ہانک دی گئیں۔

جوان بکریاں اچھلتی کودتی، ایک دوسرے سے سینگ لڑاتی، تعاقب کرتی، اور غوطے مار مار کر بچتی ہوتی بھاگتی چلی گئیں۔ اور عمر رسیدہ بکریاں —— جن کے چہروں پر گزری ہوئی عمر نے جھریاں چھوڑ دی تھیں متانت

سے آنکھیں جھپکاتی، جوانوں کی پیٹھ سے چمٹی اور دبتی قدم اٹھاتی رہیں۔ چرواہے ایک دوسرے سے گھریلو معاملات پر بحث کرتے، اپنی بیویوں کی تعریف اور شکایت کرتے، بوڑھی ماؤں اور بوڑھے باپوں کو ان کی پیٹھ پیچھے جلی کٹی سناتے چلے گئے۔ عبداللہ اپنے چچا کے کندھے پر سوار ہلکے ہلکے ہلکورں سے اونگھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

چھوٹے چھوٹے ٹیلے، ریت کے چھوٹے چھوٹے میدان اور کہیں کہیں اکا دکا کھڑے ہوئے ببول کے درخت اور چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں جن کے پتے اور نازک ٹہنیاں آنے جانے والی بکریوں اور اونٹوں کے ہاتھوں بڑی حد تک صاف ہو چکی تھیں گزرتی چلی گئیں۔

ابن عبداللہ اپنے رضاعی باپ کے کندھے پر سوار وسیع وعریض ریگستان کو اپنی تیز کالی کالی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس پر نیلے آسمان کا حسین چمکتا ہوا کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں کہیں ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دیتے جن پر بکریاں تیزی سے چڑھ جاتیں اور اسی تیزی سے دوسری طرف اتر جاتیں راستے میں اکا دکا کیکر کا درخت، ناگ پھلی کا لمبا لمبا کارے واں یا جھڑبیریوں کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں دکھائی دیتی تھیں۔ چرواہے اچک اچک کر کیکر کی نیچے کو جھکی ہوئی شاخوں میں سے خواہ مخواہ بے مقصد پتے نوچ لیتے اور ان کی بکریاں جھڑبیریوں پر ہاتھ صاف کرتی ہوئی گزر جاتیں۔ انہوں نے یہ سب دیکھا اور خاموش رہے۔ پھر یکایک بولے،

"ابا ــــــ!"

"میرے چاند ۔۔۔" حرث نے اپنا چہرہ اٹھا کر اُن کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اسے ببول کہتے ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔"

"اور اسے ناگ پھنی۔"

"ہاں ۔۔۔!"

"ابا یہ ببول اور ناگ پھنی کس نے بنائی ہے۔"

"کس نے بنائی ہے ۔۔۔ کیا مطلب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ان کو بنانے والا کاریگر کون ہے۔"

"کہتے ہیں کہ ہر چیز اللہ نے بنائی ہے۔"

"اللہ۔"

"ہاں ۔۔۔ اللہ۔"

"یعنی میرے رضاعی بھائی کا مالک۔"

"ہاں بیٹا ۔۔۔ وہی اللہ ہم سب کا مالک ہے۔"

"بڑے اچھے کاریگر ہیں اللہ میاں۔ یہ ناگ پھنی کیسے کاٹی ہوگی انہوں نے اور پھر ابا ۔۔۔ دیکھو تو ببول کے کانٹے کس صفائی سے کٹے ہوئے ہیں۔"

"ہاں ۔۔۔ بڑے استاد ہیں اللہ میاں ہمارے۔"

"کہاں رہتے ہیں ۔۔۔؟"

"آسمان پر ۔۔۔"

"اتنی دور۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔ بہت دُور۔"

"تو پھر ۔۔۔ انہیں ہمارا کیسے پتہ چلتا ہے۔"

"انہوں نے اپنے بڑے بڑے نائب اور مددگار اس جگہ چھوڑ رکھے ہیں۔ وہ پل پل کی خبر پہنچاتے رہتے ہیں انہیں۔"

"وہ کون ہیں ابا؟"

"دیوی ۔۔۔ دیوتا ۔۔۔ بھوت ۔۔۔ جن ۔۔۔ شیطان ۔۔۔ چھلاوے۔"

"یہ سب اللہ میاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

"اللہ میاں کے پاس جانے کے خفیہ راستے ہیں۔ یہ سب انہیں راستوں سے جاتے ہیں۔"

"ہم کسی دن کسی دیوتا یا شیطان کے پیچھے پیچھے چپکے سے چلے جائیں اور وہ راستہ معلوم کریں تو کیسا رہے۔"

حسرت ہنس پڑا۔

"لیکن اللہ میاں کے یہ مددگار دکھائی کیسے دیں گے۔"

"واہ ۔۔۔ دیوی دیوتا تو معبدوں میں رکھے رہتے ہیں۔"

"وہ تھوڑے ہی چلے جاتے ہیں۔"

"تو پھر ۔۔۔" ننھے چہرے پر شک کی بدلیاں گھر آئیں۔

"پتہ نہیں ۔۔۔ نہ جانے کیسے پہنچ جاتے ہیں اللہ میاں کے یہاں۔"

"آپ سچ تو کہہ رہے ہیں ابا؟"

حرث نے چونک کر ابن عبداللہ کی طرف دیکھا،

"ہاں بیٹا ۔۔۔" اور پھر اُس نے فوراً اپنا بیان بدلا ۔" میرا مطلب ہے یہ کاہن لوگ ایسا ہی کہتے ہیں ۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے ۔ یہ تو میں نہیں جانتا ۔"

"لیکن ابّا کاہنوں سے تم نے کبھی نہیں پوچھا کہ پتھر کے دیوتا اللہ میاں کے پاس آسمان پر کیسے چلے جاتے ہیں۔"

"یہ پوچھنے کی ضرورت کیا ہے بیٹا ۔۔۔ آخر ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ سوچو تو کیا ضرورت ہے۔"

"اپنے مالک کی باتوں کو سمجھنے کی ضرورت کیوں نہیں ۔ جب اللہ ہم سب کا مالک ہے تو اس کی ہر بات سمجھ میں آنی چاہیئے۔"

"بڑے ہو جاؤ گے ۔۔۔ تو آپ ہی سمجھ جاؤ گے ۔" حرث نے ٹالنا چاہا ۔

"تو اماں کو بھی پتہ نہیں کہ اللہ میاں کو ہماری باتوں کا کیسے پتہ چل جاتا ہے ۔"

"یہی کہ ۔۔۔ بھوت وغیرہ اُسے بتا دیتے ہیں۔"

"یہ بات تو ٹھیک نہیں لگتی ابّا ۔ جب اللہ میاں ہم سب کا مالک ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بھوتوں اور شیطانوں ہی کو اللہ کے راستے معلوم ہوں اور ہمیں کچھ پتہ ہی نہ ہو ان باتوں کا۔"

"بھئی میں نے کبھی سوچا نہیں ۔۔۔ تم اپنی ماں سے پوچھ دیکھنا ٹھیک

تو نہیں گئے۔

"نہیں ——!"

"پیدل چلنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"آپ کا کندھا تھک گیا ہے کیا؟" ابن عبداللہ کا معصوم چہرہ افسوس کے جذبات سے کمہلا سا گیا۔

"نہیں ——" اور اس نے گھبرا کر پھر کہا، "میرا مطلب ہے کچھ ایسا نہیں تھکا۔ تم بیٹھے رہو مزے میں —— وہ دیکھو وہ سامنے کھجوروں کے درخت ہیں نا۔!"

"ہاں ——!"

"بس ہمیں وہیں تک جانا ہے۔ وہاں ایک چھوٹا سا کنواں ہے۔ اس پہ پاس کے گاؤں کی لڑکیاں پانی بھرنے کو آتی ہیں اور پھر پاس ہی ایک چھوٹی سی جگہ ہے وہاں گھاس ہے، پھول ہیں۔ پھول لوگے تم؟"

"ہاں ——!"

"تم بیٹھے ہو نا ہمارے؟"

"ہاں ——!"

"اور اپنی امّی کے؟"

"بیٹے ——!"

"اور اپنی مکّے والی امّی کے؟"

"بیٹے ——!"

"اور اپنے سردار دادا کے ؟"

"بیٹے ——"

"اور اپنے سردار چچا کے ؟"

"بیٹے ——"

"واہ سب کے بیٹے —— وہ کیسے ؟"

"وہ سب ہمیں بیٹا بیٹا جو کہتے ہیں۔"

"اچھا تو انیسہ کے کیا لگتے ہو تم ؟"

"بھائی ——"

"اور شمیم کے ؟"

"بھائی ——"

"اور عبداللہ کے ؟"

"بھائی —— عبداللہ بہت روتا ہے آپا۔"

"بڑا لڑکا ہے نا۔"

"بُرا —— ؟"

"نہیں تو کیا —— روتا جو ہے۔"

"امی کہتی تھیں اچھے لڑکے نہیں رویا کرتے۔"

"ہاں —— اس کا یہی مطلب تو ہے کہ بُرے لڑکے روتے ہیں۔"

"ہاں ——"

"تو پھر عبداللہ بُرا ہی تو ہوا۔"

"لیکن وہ ہمارا بھائی بھی تو ہے ـــــ امّی کہتی تھیں بھائیوں کو بُرا نہیں کہا کرتے۔"

"شاباش ـــــ!" اور حرث نے زور سے ابن عبداللہ کو اپنے سر کے ساتھ بھینچ لیا۔

حلیمہ سارا دن بے چین رہی۔

"کیا ضرورت تھی بچّوں کو لے جانے کی؟"

"اگر یہ ہو گیا۔"

"اگر بھوت چمٹ گیا؟"

"اگر باد صرصر چل پڑی۔"

"اگر وہ کہیں کھیل کود میں اِدھر اُدھر نکل گئے۔"

یہ اور اس قسم کے ہزاروں سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے اور اس کے خون کو کھولاتے رہے۔

اس نے یہی باتیں ایک دفعہ نہیں دن میں کئی دفعہ ہمسایوں سے کیں۔ بڑی بوڑھیوں کے سامنے حرث کی غیر ذمہ داری اور عجلت پسندی کی شکایت کی۔ لیکن مزا یہ تھا کہ جس سے بھی بات کرتی وہی اس کی طرف بے چینی پر ہنس دیتا بنو سعد میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی تھی۔ مرد اکثر اپنے لڑکوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اگر حرث نے ایسا کر دیا ہے تو کیا ہوا۔ لڑکوں کو صحرا کی ہواؤں اور تکلیفوں سے مانوس ہونا چاہیے۔ بڑے ہو کر انہیں چوڑیاں پہن کر

گھر میں نہیں بیٹھتا ہے۔

لیکن ان تمام جوابات سے حلیمہ کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ پہلے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔ اب وہ بات جاتی رہی۔ اب وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ اپنے آپ کو کوستی رہی اور حسرت پر غصہ نکالتی رہی۔ یہاں تک کہ جوں جوں سورج اُفق کی طرف جھکتا چلا گیا حلیمہ کا غصہ اتنا تیز ہوتا گیا ــــــ کہ اُس نے حسرت کو سزا دینے کی ٹھان لی۔

"آج کچھ نہیں پکے گا۔" اُس نے ارادہ کر لیا "یہ بہت سر چڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ حسرت میاں ــــ اور کچھ نہیں تو معصوموں ہی کو لے نکلے۔"

لیکن جب دھوپ ذرا کم ہوئی اور قبیلے کے خیموں میں زندگی کی ہلچل پیدا ہونے لگی تو حلیمہ کا ارادہ یکدم بدل گیا۔ اگر وہ اس طرح بیکار بیٹھی رہی، تو پہاڑ سا لمبا دن کیسے کٹے گا۔ اس سے تو اچھا ہے کچھ نہ کچھ کام کرے جس میں انتظار کرنے والا دل لگا رہے۔

اس خیال سے اُس نے خیمے کا جائزہ لیا۔ ایسا لمبا چوڑا سامان ہی کیا تھا۔ ضرورت کی چند چیزیں تھیں جو بدستور قرینے سے اپنی جگہ رکھی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود حلیمہ کو اس نظام میں خواہ مخواہ خامیاں نظر آنے لگیں۔ لیکن پھر خود بخود دل اچاٹ ہو گیا اور جس چیز کو صاف کرنے کے لئے اٹھایا تھا ہاتھوں سے پھسل پڑی اور حلیمہ دھپ سے بیٹھ گئی۔ شیما اور انیسہ دوپہر کا

کھانا کھا کر سوگئی تھیں اور ابھی تک بے خبر پڑی سو رہی تھیں۔ حلیمہ کے دل میں نہ جانے کیوں یکایک ان دونوں کو جگا دینے اور باہر دھوپ میں بھیج دینے کی زبردست خواہش پیدا ہوگئی۔

لیکن پھر خواہ مخواہ اُسے اُن پر رحم بھی آگیا معصوم بچیاں ——؟

آخر انہیں کیوں پریشان کرے وہ؟

لیکن اس کی پریشانی پر تو کسی کو رحم نہیں آیا۔ الٹا مذاق اڑایا گیا ہے اُس کا۔ پھر وہ کیوں کرے کسی پر رحم۔ لیکن جس طرح دماغ کے کسی انجانے کونے سے دونوں لڑکیوں کو جگا کر باہر دھوپ میں بھیج دینے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی اسی طرح دل کے کسی خاموش کونے سے کوئی انجانی طاقت اُبھری اور اس خواہش کا قلع قمع ہو گیا۔

حلیمہ اپنی چادر کا پلّو انگلیوں پر لپیٹتی اور اُسے بھینچتی ہوئی آہستہ آہستہ بنا مطلب دروازے کے قریب آئی۔ کمبل کا کونہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ دُور تک پھیلی ہوئی دھوپ ابھی تک آگ میں تپتے ہوئے سونے کی طرح دہک رہی تھی۔ درختوں کی ہری ہری ڈالیاں اداس اور خشک آسمان کے خلاف کھڑی اپنا مذاق اڑاتی معلوم ہوتی تھیں۔ ارد گرد کے خیموں میں سے بچوں کے رونے اور ماؤں کی لوریوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

بچوں کے رونے کی آواز سے حلیمہ کے دل پر چرکہ سا لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کہیں چھپ کر انیسہ اور شمیمہ پر کوئی چیز مار دے جس سے وہ دونوں رونے لگیں اور حلیمہ انہیں چپ کرانے اور چمکارنے میں مشغول ہو جائے لیکن وہ

یہ بھی نہ کر سکی۔

اور پھر دفعتہً کسی نے باہر سے آواز دی،

"پانی بھرنے نہیں چلو گی حلیمہ ——"

اور حلیمہ چونک کر جیسے بیدار ہو گئی ہو۔ ملحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اس کے ذہن میں "نہیں" کا لفظ گونجا۔ کھانا نہیں پکانا ہے۔ آج کوئی کھانا نہیں کھائے گا۔ تو پھر پانی بھرنے کی کیا ضرورت ہے۔

لیکن دفعتہً اُس نے "ہاں" کہہ دی —— نہیں کہتے کہتے اس کی زبان سے ہاں کا لفظ جیسے بہہ نکلا۔

اور صراحی کی طرف بڑھتے بڑھتے اُس نے اپنے اس جواب کا جواز ڈھونڈ لیا۔

"کھانا پکانے ہی کے لئے پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آخر اور بھی تو ہزاروں کام کرنے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ وقت آرام سے کٹ جائیگا۔

شمیہ اور انیسہ سوتی رہیں اور حلیمہ صراحی اٹھا کر چشمے کی طرف چل دی۔

خیمے اور چشمے کے درمیان کوئی لمبا فاصلہ نہیں تھا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسی چشمے کے اردگرد خیمے نصب کئے گئے تھے۔ حلیمہ دن میں کئی دفعہ اسی چشمے کے کنارے پر یونہی باتیں کرتی پہنچ جاتی۔ لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیمے اور چشمے کا درمیانی راستہ کھنچ کر لمبا ہو گیا ہے۔

اور اس کی وجہ تھی ——!

قبیلے کی دوسری نوجوان عورتوں اور کنواری لڑکیوں نے حلیمہ پہ وعدہ

فقرے چُست کئے کہ حلیمہ کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی تھی۔ ان طعنوں اور گرما گرم نوک جھونک کا مرکز، آمنہؓ کا یتیم بیٹا تھا۔ قبیلے والیوں کو نہ جانے حلیمہ کے دل کی بات کیسے معلوم ہو گئی تھی۔ نہ جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ عبداللہ کی ماں آمنہؓ کے بیٹے کے لئے دیوانی ہے۔ یہ عورتیں ایک تو یونہی بے باک اس پر قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے بے طرح بے تکلف۔ انہوں نے حلیمہ کی اس والہانہ محبت کو نمک مرچ لگا کر اس مزے سے بیان کیا کہ حلیمہ جھینپ گئی ــــ!

اُسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کی محبت کا یہ دیوانہ وار جذبہ بڑی حد تک قابلِ تمسخر ہی ہے۔ آخر محمدؐ عمر بھر کے لئے تو اس کے پاس نہیں رہ سکتے آج نہیں تو کل انہیں اپنے قبیلے میں جانا ہی ہوگا۔ اور پھر محمدؐ لڑکا تھے۔ انہیں دنیا کے سرد گرم سے آشنا کرنا حلیمہ کا سب سے پہلا فرض تھا لیکن حلیمہ اپنی محبت پر نہ صرف اپنے فرض ہی کو بلکہ اپنی اور اپنے قبیلے کی تمام گزشتہ روایات کو قربان کر رہی تھی۔

یہ باتیں حلیمہ تک رہتیں تو اچھا تھا لیکن قبیلے میں سے ایک ایک کو اس دیوانگی کا علم ہو گیا تھا۔ اس پر طرہ، آج کا دن ــــ حلیمہ کے پریشان سوالات اور بے چین غصہ۔ اس کی اُداسی اور پاگلوں کی سی اُلجھن، قبیلے کی عورتوں کو باتیں بنانے اور مذاق اڑانے کا موقع مل گیا تھا ــــ!

خیمے اور چشمے کا درمیانی راستہ کھنچتا ہی چلا گیا ــــ بڑھتا ہی چلا گیا۔

اور آخر جب یہ راستہ ختم ہوا تو ہنسی مذاق نے اور ہی صورت اختیار

کر لی۔ قبیلے کی بڑی بوڑھیوں کو نہ جانے کیا سوجھی۔ انہوں نے حلیمہ پر نصیحتوں کی بارش کر دی۔

"ایسا نہیں کرنا چاہیئے"

"یہ بُری بات ہوتی ہے بیٹیا"

"یہ تو ہمارا کاروبار ہوا میری جان"

ان نصیحتوں پر نمک مرچ لگانے والی جوان عورتیں موجود تھیں جو کلکاریاں مار مار کر ہنس رہی تھیں اور میٹھی میٹھی چٹکیاں لے رہی تھیں۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو حلیمہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔ وہ مذاق کرنے اور پھڑکتے ہوئے فقرے چست کرنے میں کسی سے کم نہ تھی۔ ایسی جھاڑ پونچھ کے جماتی تھی کہ ہنستے ہوئے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتیں۔ لیکن آج ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب نے مل کر اس کی دُکھتی رگ پکڑ لی تھی۔ جیسے اس کے دل کے راز ان لوگوں کے ہونٹوں پر سے لڑھک لڑھک کر ہواؤں میں بکھرتے جا رہے ہیں۔ اس نے ان بکھرتے رازوں کو سمیٹنے کی جدوجہد کی۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر دماغ پر زور دیا اور کوشش کی کہ ان چبھتے ہوئے فقروں کا کوئی ایک منہ توڑ جواب سوجھ جائے اور وہ ان سب کو خاموش کر دے لیکن اس کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اُسے غصّہ آنے لگا۔ عورتوں پر نہیں بلکہ اپنی کوششوں کی ناکامی پر۔

وہ چاہتی تھی کہ پھٹ پڑے، لڑ پڑے ان سب سے لیکن ان میں اس کی ہم عمر اور کم عمر ہی نہ تھیں بلکہ وہ بوڑھیاں بھی تھیں جنہوں نے اسے گودوں

پالا اور سینے پر کھلایا تھا۔ اس لئے اپنے غصّے کا اظہار بھی نہ کر سکتی تھی۔

عورتیں یہی سمجھتی رہیں کہ حلیمہ لاجواب ہو کر چُپ ہے۔ بڑی بوڑھیاں اس خوش فہمی میں مبتلا تھیں کہ حلیمہ ان کی ہر بات کو بڑے دھیان اور پورے غور سے سُن رہی ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی حلیمہ کے دل میں اٹھتے ہوئے طوفانوں کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے دل پر کتنا جبر کر رہی ہے اور دل و دماغ کی ساری قوتوں کو مرکوز کر کے کس طرح اپنی زبان پر قابو پائے ہوئے ہے اس بات کو کسی نے نہیں سوچا۔

اور فقرے چسُت ہوتے رہے ——— نصیحتوں کے دَل بادل اٹھتے رہے۔

یہاں تک کہ حلیمہ مجبور ہو کر رو پڑی۔

ہاں ——— حلیمہ رو پڑی۔ جس پر بڑے بڑے طوفان نشان چھوڑے بغیر گزر جاتے تھے۔ جو قبیلہ بنو سعد کی بہادر عورت مشہور تھی۔ جو ہر مصیبت اور ہر دُکھ کو مسکرا کر سہہ جاتی تھی، بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگی۔

اُس کے آنسوؤں نے ہر آواز کو بند کر دیا۔ عورتوں نے حیرت بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں دوسرے کو گناہگار سمجھ کر اپنے ضمیر کی آوازوں کو خاموش کر دینے کی ناشکور کوشش کرنے لگیں۔

بڑی بوڑھیوں نے اپنی اپنی نیک نیتی کو دلیل بنا کر اپنی باتوں کو جائز ثابت کرتے اور نوجوان لڑکیوں نے "ہم تو محض مذاق کر رہی تھیں" کہہ کر اُس کی

آنکھیں خشک کرنے کی کوشش کی۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی اصل کی وجہ نہ سمجھ سکا۔

حلیمہ کے دل کی دھڑکن کسی کان نے نہیں سنی۔ جو کہہ رہا تھا اگر میں محمدؐ سے محبت کرتی ہوں۔ تو اس محبت کو اسی نقطۂ نظر سے کیوں نہیں دیکھا جاتا جس سے میں دیکھتی ہوں۔ مجھے بیوقوف سمجھ کر کیوں مجھے نصیحت کی جا رہی ہے؟ مجھے دیوانی سمجھ کر کیوں مجھ پر قہقہوں کے انگارے اچھالے جا رہے ہیں؟

ریت کے وہ ذرّے جو جانے والیوں کے خوشی کے زور میں تیز تیز چلنے والے قدموں کی وجہ سے اڑ اڑ کر حیرت سے اُن کا منہ دیکھنے لگے تھے آنے والیوں کے شرم کی وجہ سے گھسٹتے ہوئے پاؤں تلے چڑچڑا کر رہ گئے۔ جانے والی عورتوں کا قافلہ جوش میں خیموں کو رگڑ کر گزر رہا تھا۔ آنے والیوں کی دھیمی آوازیں پھڑپھڑاتے ہوئے پردوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نیچے گر رہی تھیں۔ قبیلے والیوں میں سے ہر کوئی یہی سوچ رہی تھی کہ اسے کیا ضرورت تھی حلیمہ کو کچھ کہنے کی۔

لیکن جب حلیمہ اپنے خیمے میں داخل ہوئی تو اُس کے دل کا بخار چھٹ چکا تھا۔ آنسو دل کے بوجھ کو بھی اپنے ساتھ بہالے گئے تھے۔ وہ ہلکے قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی اندر آئی۔ انیسہ اور شیمہ دونوں بیدار ہو چکی تھیں لیکن دھیمی دھیمی کاہلی اب بھی اُن کے گدرائے ہوئے جسموں میں سرسرا رہی تھی۔ انہوں نے لیٹے ہی لیٹے ماں کی طرف دیکھا اور وجدانی طور پر ماں کے چہرے میں کوئی ایسا جذبہ محسوس کیا جس سے انہیں تسلی ہو گئی۔ اور وہ پھر ایک دوسرے

سے لپٹ کر آرام سے لیٹ گئیں۔

حلیمہ نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ دل کے قریب محبت کی ہلکی سی سنسنی محسوس کی۔ اس کا مسکرانے کو جی چاہتا تھا۔ دل خواہ مخواہ کہہ رہا تھا کہ دونوں لڑکیوں کو پیار کرے لیکن پھر خیال آ گیا اُسے۔ انیسہ اور شیمہ دونوں لڑکیاں تھیں، اور لڑکیوں کو ماں باپ کا پیار خواہ وہ کتنا ہی مناسب اور ضروری کیوں نہ ہو خراب کر دیا کرتا ہے۔ اس لئے اُس نے ہونٹوں پر اُمنڈتی ہوئی مسکراہٹ کو زبردستی روک دیا اور صراحی لے کر دوسری طرف چلی گئی۔

گو حرث نے ادھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر چھوٹے حضورؐ کا ذہن دوسری طرف منتقل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ چراگاہ میں قدم رکھتے ہی چھوٹی چھوٹی تیز سیاہ آنکھیں چراگاہ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہریاول پر پھر گئیں۔ کنوئیں کے اردگرد کھجوروں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کے پہلو میں دو چار ہری ہری کھیتیاں ہوائیں کھڑی جھوم رہی تھیں۔ باغ کے رکھوالے نے چرواہوں کو دیکھ کر دُور سے آواز لگائی تھی۔

"بکریوں کو کھیتوں سے دُور رکھنا ——— یہ مالک کا حکم ہے۔"

اور چرواہوں میں سے ایک نے بناوٹی مسکراہٹ سے کہا تھا،

"آپ فکر نہ کریں ——— ذرّہ برابر نقصان نہیں ہوگا۔"

رکھوالا بے فکر ہو کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔

ریوڑ بڑی ہوشیاری کے ساتھ کھیتوں سے پرے لے جایا گیا اور انہیں گھاس

کے چھوٹے سے میدان میں چھوڑا یا گیا جو کنوئیں سے کچھ ہی فاصلے پر مالک کی بکریوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

چرواہے اطمینان کے ساتھ ایک گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہو بیٹھے تھے۔

محمدؐ اپنے رضاعی باپ کے کندھے سے اتر کر اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ عبداللہ چھوٹی کنکریوں کو جمع کر کے دیوار بنانے لگا ــــ!

"رضاعی بھائی!" اُس نے اپنی موٹی سی انگلی اٹھا کر کہا، "تم تیلیاں اکٹھی کرو ــــ میں دیوار بناتا ہوں۔ تم اس پر چھت ڈالنا۔"

"پھر کیا ہو جائے گا؟"

"مکان بنے گا ــــ ہم دونوں اس میں رہیں گے۔

"ابّا اور امّاں کو بھی ساتھ رکھیں گے؟"

"ہاں ــــ ہاں!"

"لیکن ابّا اور امّاں تو اتنے بڑے بڑے ہیں۔ وہ اس مکان میں کیسے رہیں گے؟"

"تو ہم بھی بڑا مکان بنائیں گے ــــ میں نا رضاعی بھائی؟"

"اچھا ــــ!"

"تو پھر تیلیاں اکٹھی کرو۔"

اور محمدؐ ادھر ادھر سے تیلیاں چننے لگے۔ تنکے چنتے چنتے ببول کا ایک

کانٹا بھی ہاتھ آگیا۔ محمدؐ نے اس پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ بھی ہمارے مکان میں لگ سکتا ہے رضاعی بھائی؟" انہوں نے کانٹا عبداللہ کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں — چھوٹا ہے۔ کسی کام کا نہیں۔"

"کسی کام کا نہیں —!" محمدؐ نے حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھا، "تو یہ ہمارے کام کا نہیں ہے۔"

"بڑی بڑی تیلیاں ڈھونڈو — بڑا سا مکان ہوگا نا۔"

"او —" چھوٹے حضورؐ نے کانٹا پھینک دیا اور تیلیاں ڈھونڈنے لگے۔ ادھر عبداللہ کنکروں کی چھوٹی سی ڈھیری جمع کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں معمار مکان بنانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دیواریں بڑی محنت سے استوار کی گئیں اور پوری فنی سنجیدگی کے ساتھ ان پر چھت رکھی گئی لیکن مشکل یہ ہوئی کہ چھت کا ایک تنکا غلطی سے دیوار کے ساتھ اُلجھ گیا اور دیوار دھم سے زمین پر آرہی۔ دیوار کا گرنا تھا کہ عبداللہ کو غصہ آگیا۔ اس نے پورے زور سے مکان کو لات ماری اور رونے لگا۔

حارث تو قریب ہی تھا۔ عبداللہ کے رونے کی آواز سن کر بھاگا آیا۔

"کیا ہوا — ارے کیا ہوا — میرے باپ!"

"اس نے میرا مکان گرا دیا۔"

"او —"

"تنکا غلطی سے لگ گیا تھا۔ مکان گر پڑا۔"

"ایک دفعہ پھر بنا لو۔"

"ہم نہیں بنائیں گے ـــ کیوں گرایا اس نے۔"

اور عبداللہ ایسا مچلا کہ مچل مچل کے ہاتھوں سے نکلا جاتا تھا۔ حرث نے اور دوسرے آدمیوں نے بہلانے پھسلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن عبداللہ تھا کہ مان ہی کے نہیں دیا۔ آخر حرث کو بھی غصہ آگیا اس نے زور سے ڈانٹا اور ایک چانٹا بھی رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر عبداللہ یکدم چپ ہو گیا۔

لیکن تھپڑ پڑا عبداللہ کو اور اداس محمدؐ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی چھا گئی۔ ایسی سنجیدگی جس کو سب نے دیکھا اور دل سے محسوس کیا۔ چنانچہ ایک چرواہے نے محمدؐ کو گود میں اٹھا لیا اور چمکار کر پوچھا،

"آپ تو بہت اداس ہو گئے چھوٹے حضورؐ۔"

"غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی ـــ ابا نے میرے رضاعی بھائی کو کیوں مارا ـــ!"

"آپ کے رضاعی بھائی کو غلطی کی وجہ سے تو مار نہیں پڑی۔"

"تو پھر ـــ"

"مار تو پڑی ہے رونے کی وجہ سے۔ وہ مانتا جو نہیں تھا۔"

محمدؐ چپ ہو گئے اور چند لمحوں کے بعد جب پھر عبداللہ اسی طرح گھر بنانے میں مشغول ہو گیا تو وہ آہستہ سے بولے،

"چھت بھی پڑے گی اس پر رضاعی بھائی؟"

"کیوں نہیں پڑے گی۔"

"تنکے لاؤں ــــ؟"

"لاؤ ــــ!"

اور پھر کھیل شروع ہوگیا۔

لیکن اس کھیل میں بھی محمدؐ کے ذہن سے وہ بات نہ نکلی تھی۔ اس دنیا کا مالک اگر اللہ ہے تو پھر اس تک پہنچنے کے راستے کیوں سب کو معلوم نہیں ــــ؟ وہ اسی پر سوچتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے وہ بے چین سے ہوگئے اور حرث سے بولے،

"ابا گھر کب چلیں گے ہم لوگ؟"

"اداس ہوگئے بیٹا؟"

"نہیں ــــ اماں سے پوچھنا ہے۔"

"کیا ــــ؟"

"یہی کہ اللہ میاں تک پہنچنے کا راستہ بھوتوں اور دیوتاؤں ہی کو کیوں معلوم ہے۔ ہمیں کیوں معلوم نہیں۔"

"اور اگر تمہاری امی نہ جواب دے سکیں اس سوال کا ــــ" ایک دوسرے چرواہے نے کہا۔

"وہ ضرور دے سکیں گی جواب ــــ انہیں ہر بات کا پتہ ہوتا ہے۔"

"لیکن فرض کرو کہ نہ دے سکیں۔ تب کیا ہوگا۔"

"پھر ہم خود ہی جواب ڈھونڈ لیں گے۔" محمدؐ نے ایسی خود اعتمادی کے ساتھ کہا جو ان کے بچوں کے سے بھولے بھالے چہرے پر مضحکہ خیز معلوم ہوتی

تھی ــــــ!

"لیکن کیسے ڈھونڈو گے؟"

"یہ پتہ نہیں ــــــ لیکن ضرور ڈھونڈیں گے۔"

محمدؐ کی متانت اور سنجیدگی کچھ ایسی پیاری معلوم ہوئی کہ حرث نے دانت کچکچا کر انہیں پکڑا اور زور سے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔

"تم دونوں میاں بیوی پاگل ہو۔" ایک نے کہا۔

"جی، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔"

"اس لڑکے پر اس بُری طرح جان چھڑکتے ہیں ــــــ حد ہو گئی۔"

"تم کیوں جلے جاتے ہو ــــــ اسے ملکے جا لینے دو ــــــ ہم تم پر جان چھڑک دیں گے۔ کیوں کیا خیال ہے۔"

"مذاق تو رہا ایک طرف ــــــ حرث سچی کہنا ــــــ تمہیں واقعی یہ لڑکا بہت پیارا لگتا ہے۔"

"جی، اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔"

"پھر وہی مذاق ــــــ سچی سچی کہو۔"

"ہاں ــــــ لگتا ہے۔"

"عبداللہ سے بھی زیادہ؟"

"کبھی اس پر غور نہیں کیا ــــــ شاید زیادہ ہی پیارا ہو۔"

"مگر یہ تو بے انصافی ہے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔"

"پھر ——"

"مذاق نہیں ——" حرث نے بات کاٹی، "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ واقعی بے انصافی ہے میں جانتا ہوں۔"

"تو پھر کیوں کرتے ہو ایسی بات۔"

"مجبوری ——"

"تو تمہیں کچھ خیال آتا ہی نہیں۔"

"بھئی مجبوری کے کیا معنی ہوتے ہیں —— جواب دو کیا معنی ہوتے ہیں مجبوری کے۔ عجیب مسخرے ہیں آپ بھی۔"

"حد ہے بھئی یہ تو ——"

"لیکن" حرث نے سنجیدگی سے کہا، "سچ کہنا —— تمہیں پیارا نہیں لگتا۔"

"نہیں —— کوئی خاص نہیں۔"

"بولا نہ جھوٹ —— اور انیسہ کے سامنے کیوں گڑگڑا رہے تھے اس روز کہ لاؤ ہمیں دے دو۔ مجھے دے دو۔"

"مطلب یہ ہے کہ پیارا لگتا تو ہے لیکن تمہاری طرح میں دیوانہ نہیں ہوں اس کا۔"

"تو بھئی یہ اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ ہم دیوانے ہیں اس کے یہ دیوانہ ہمارا، کیوں چندا ہے نا ٹھیک۔" اور محمد فرطِ محبت سے سمٹ کر حرث کی بغل میں دبک گئے۔

جوں جوں شام قریب آتی گئی۔ حلیمہ کے ارادے بدلتے گئے۔ کہاں تو پہلے یہ جوش و خروش کہ حرث کو سزا دی جائے گی اور اسے تمام رات بھوکا سونے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر آہستہ آہستہ بچوں اور بالخصوص محمدؐ کا بہانہ رکھ کر کھانا تیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چولہے میں آگ جلائی گئی اور سوکھے گوشت کو ابال کر شوربہ بنانے کی تجویز ہوئی۔ لیکن لکڑیاں ابھی آگ پکڑ ہی رہی تھیں کہ اس خیال نے ایک اور خیال سے جگہ بدل لی۔ سوکھا گوشت ابل جانے پر بھی اتنا لذیذ نہیں ہوتا۔ بچے سارا دن جنگل میں پھرنے کے بعد گھر لوٹیں گے، ان کے لئے کوئی اچھی چیز ہونی چاہیئے۔ تازہ گوشت کی تلاش ہوئی۔ اپنے خیمے میں تو تھا نہیں۔ کسی ہمسائی کے پاس شاید ہو اس لئے خیمہ خیمہ پھرا گیا۔ ہر ایک سے پوچھا گیا اور بالآخر ایک دور کی رشتہ دار کے یہاں سے اونٹ کی کہان کا گوشت مل گیا۔ اس رشتہ دار کے خاوند نے یہ گوشت جوئے میں جیتا تھا اور تھوڑا بہت نہیں کم از کم پچیس سیر کا ٹکڑا حلیمہ نے کیونکہ عمر میں پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اس لئے گھر والی نے بڑی آن بان کے ساتھ ایک بہت بڑا مجرّب ٹکڑا کاٹ دیا تھا۔

اتنی مقدار میں گوشت دیکھ کر خیال نے اور بھی پر پرزے نکالے، کچھ تو تکے بھون لئے جائیں اور کچھ دیگچی میں ڈال کر بھون لیا جائے۔ مرچ مصالحہ خوب سا پڑا تو لطف آ جائے گا۔

حلیمہ اسی خیال میں مگن اپنے خیمے میں آئی اور کھانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شمیمہ اور انیسہ نے بھی گوشت کے اتنے بڑے ٹکڑے کو دیکھ لیا

تھا۔ اس لئے خوشی خوشی ہر کام میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ یہ لا وہ لا۔ اِدھر بھاگ اُدھر دوڑ۔ حلیمہ کا آدھا کام ان دونوں لڑکیوں نے ختم کر دیا تھا۔

اسی گہما گہمی اور مصروفیت میں سورج غروب ہو گیا۔ طویل لرزتی ہوئی شام صحرا پر کانپنے لگی اور حلیمہ کا دل گھبرانے سا لگا۔ اُن سب کے آنے کا وقت قریب تھا۔ ہاں ——— بالکل قریب۔ لیکن کیسے نہ ہوتا وقت قریب! وقت اپنی رفتار کیسے بھول جاتا۔

لیکن اس کے باوجود حلیمہ نہ جانے کیوں چاہتی تھی کہ ابھی ان کے آنے کا وقت نہ ہو۔ وہ خود حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے۔ آخر اس کے بچے اور اس کا خاوند ہی تو گھر آ رہے ہیں۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔

اور اسی کش مکش میں بکریوں کے گلے میں بجنے والی مترنم گھنٹیوں کی آواز سے خیمہ گاہ کی فضائیں گونج اٹھیں۔ بچوں نے شور مچا مچا کر اور کود کود کر اپنے اپنے باپ کا استقبال کیا۔ بیویوں نے بلند آواز سے بچوں کو پکار کر باڑیں کھولنے کا حکم دیا۔ بکری کے بچوں نے اپنی اپنی جگہ پر رسی تڑوانے کے لئے زور لگایا۔ چھوٹی چھوٹی دُمیں ہلا ہلا کر بلند ترین آواز میں میں میں پکار پکار کر اپنی ماؤں کا استقبال کیا۔ خیموں میں جیسے یکدم زندگی کا طوفان آ گیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن حلیمہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ دروازے کا کمبل اٹھا کر ایک طرف کر دے۔ بھاگ کر باہر نکلے اور اپنے دونوں بچوں کو سینے سے لگا لے لیکن نہ جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی۔ شاید

اس لئے کہ اگر وہ باہر نکلی تو قبیلے کی عورتیں پھر اس کا مذاق اڑائیں گی اور بڑی بوڑھیاں پھر خشک اور سرد نصیحت کے اولے برسائیں گی۔

یہی وجہ تھی شاید ـــــ اور شاید اسی لئے وہ وقت کو قریب آتا دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ حلیمہ جانتی تھی کہ دل کی دھڑکن اور اعصاب کی لرزش اسی وجہ سے ہے۔ لیکن وہ اس وجہ کو اپنے دل کے سامنے تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ کوئی اور ہی بہانہ ڈھونڈتی رہی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بہانہ اسے مل سکتا، کمبل ہلا، ایک چھوٹا سا ہاتھ دکھائی دیا، کمبل جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور محمدؐ دروازے پر آ گئے۔

"امی ـــــ!" پرجوش لرزتی ہوئی آواز خیمے میں گونج اٹھی۔ سرخ چہرے پر کانپتی ہوئی مسکراہٹیں ابھرتے ہوئے سورج کی کنواری شعاعوں کی طرح تابناک اور مسرت بار تھیں۔

کیا اب بھی حلیمہ چولہے کے پاس بیٹھی رہے؟

اب کون ہو گا دیکھنے والا اور اس کی محبت کا مذاق اڑانے والا؟"

لیکن وہ اس لئے تھوڑی گھبرا رہی تھی ـــــ وہ تو کوئی اور بات ہو گی۔

کچھ بھی ہو ـــــ!

حلیمہ بجلی کی تیزی سے اٹھی۔ اس نے لپک کر محمدؐ کو گود میں لے لیا۔

"میرے لال ـــــ میرے چاند۔" اس نے گلابی چہرے کو بوسوں سے سرخ کر دیا اور جب جوش کم ہوا تو اس نے اپنی ٹھوڑی گدگدے گالوں میں کھبوتے ہوئے کہا۔

"ابا کہاں ہیں تمہارے؟"

"چچا ابو ثوران کے پاس۔"

"ابو ثوران نہیں آئے ابھی تک۔"

"آ گئے ——"

"ڈر تو نہیں آیا تمہارا ستے ہیں۔" اور اس فقرے سے سوالات اور جوابات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ننھی ننھی توتلی باتیں۔ یہاں تک کہ حرث کی بلند آواز اور عبداللہ کی ریں ریں نے اس ملکوتی فضا کو پھر دنیا کا معمولی گھر بنا دیا۔

رات آئی —— محمدؐ نے گوشت نہیں کھایا۔ بس جی نہیں چاہا تھا۔ صرف دودھ پیا اور سارا کنبہ حسب معمول اپنے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

حرث سے کہانی کا مطالبہ ہوا لیکن حرث نے کہانی سنانے سے خوبصورتی کے ساتھ انکار کر دیا۔ آنکھوں کے کویوں سے وہ اپنے رضاعی بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اور پھر دفعتہً محمدؐ بولے،

"امّی ——!"

"بیٹا ——!"

"ابا کہتے ہیں اللہ میاں ہم سب کے مالک ہیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ میرے لال۔"

"پھر بھوتوں، جنوں، شیطانوں اور دیوی دیوتاؤں کے مالک بھی اللہ میاں

ہی ہوئے۔"

"ہاں بیٹا ۔۔۔!"

"پھر کیا وجہ ہے امّی ۔۔۔ کہ ان لوگوں کو تو اللہ میاں تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہوا اور ہمیں معلوم ہی نہ ہو۔"

"کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے ہیں۔"

"جیسے میں اور عبداللہ۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

"تو جس طرح ہمیں اپنے خیموں کا راستہ پتہ ہے، اسی طرح اللہ میاں کے بیٹی بیٹوں کو اللہ میاں کے ٹھور ٹھکانے کا پتہ ہوگا۔"

"ایسا ہی یہ لوگ کہتے ہیں۔"

"لیکن امّی ۔۔۔ ہم اللہ میاں کے کیا لگتے ہیں۔"

"غلام ۔۔۔!"

"جیسے ہمارے مکّے والے چچا کے غلام ہیں۔"

"ہاں ۔۔۔ ویسے ہی۔"

"لیکن ہمارے مکّے والے چچا کے غلاموں کو تو ہمارے چچا کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔"

"ہاں ۔۔۔!"

"پھر ہمیں کیوں اللہ میاں کے ٹھکانے کا پتہ نہیں۔"

"یہ تو اللہ میاں ہی جانیں۔ مالک کی باتیں مالک ہی جان سکتا ہے بیٹا

غلاموں کو کیا پتہ۔"

"کیوں جی ــــ ہم نے کیا کہا تھا؟" مسرت نے اُن دونوں کی باتیں سُن کر کہا۔

"امّی بھی نہیں جانتیں۔" محمدؐ نے اسی سنجیدگی سے کہا، جو ان کے چھوٹے سے بھولے چہرے پر مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی اور کروٹ بدل لی۔

"اب سو جاؤ ــــ بہت رات ہو گئی۔" حلیمہ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد سب سو گئے لیکن دو چھوٹی چھوٹی کالی آنکھیں خیمے کی چھت کو گھور رہی تھیں۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْکُرُوْنَ ۝

(ابراہیم ع)

اے ہمارے پروردگار — میں نے اپنی کچھ اولاد ایک وادی میں جہاں کوئی کھیتی نہیں۔ تیرے معزز گھر کے پاس بسائی ہے۔ اے ہمارے پروردگار یہ اس لئے ہے تاکہ یہ نمازیں پڑھیں۔ سو تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے روزی دے تاکہ یہ تیرے شکر گذار ہوں —

۱

آج ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکّہ کی ساری آبادی حرم کعبہ میں کھنچ آئی ہے۔ لوگ افق پر آنکھیں لگائے کھڑے تھے اور ہر ایک کے کان "وہ رہا چاند" کی آواز سننے کے لئے بیتاب تھے

مکّہ کے بوڑھے بچّوں نے یہ مہینہ آنکھوں میں کاٹا تھا۔ دن، گھنٹے اور لمحے گن گن کر بتائے تھے اور آخر کل جب چاند کی انتیسویں تاریخ تھی مکّہ کا ہر فرد اپنے مکان کی چھتوں اور صحن کعبہ میں کھڑا اُفق مغرب سے آنکھیں لڑاتا رہا۔ لیکن امید بھری نگاہیں گھرتی ہوئی رات کی کسمساتی تاریکیوں میں بھٹکتی رہیں اور آخر مایوس ہو گئیں۔ لوگ سر جھکائے، ہنستے اور افسوس کرتے چھتوں سے اتر آئے، صحن کعبہ سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب تو سب کو یقین تھا کہ تیس تاریخ کا چاند ضرور دکھائی دے گا۔ ہزاروں سال سے یہی ہوتا آیا تھا۔ انتیس کو نہیں تو تیس کو چاند ضرور دکھائی دے

جاتا تھا۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی لوگ چاند دیکھنے کے لئے بلند جگہوں پر جمع ہو گئے تھے۔ صحن کعبہ میں تو ہجوم کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر چپکے ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں آج وہ مبارک دن تھا جس میں دشمن قبیلہ کے لوگ کندھے سے کندھا ملائے حرم کعبہ میں جمع ہو گئے تھے۔ ہاشم کی اولاد اُمیہ کی اولاد کے قریب کھڑی تھی۔ بنو کنانہ بنو قیس والوں کے ساتھ تھے۔
گو یہ درست ہے کہ دشمن قبیلہ کا ایک فرد جب اپنے آپ کو اپنے حریف قبیلہ کے کسی فرد کے پاس پاتا تو اس کی طرف تنی ہوئی بھنوؤں یا ٹھٹھے سے مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ دیکھتا۔ گردن بلند کر کے سروں کے اس جنگل پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالتا اور اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے قریب تر پہنچنے کے لئے ہجوم کو چیرنے لگتا۔

یکایک عرفات کی بلندیوں پر سے غلغلہ اٹھا اور حرم کعبہ میں جمع لوگوں نے گھوم گھوم کر عرفات کی طرف دیکھا۔ عرفات کی خشک چوٹیوں پر بھی لوگ جمع تھے اور چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

صحن کعبہ میں کھڑے ہوئے لوگوں نے دیکھا عرفات پر کھڑے ہوئے لوگ کودنے اور اچھلنے لگے تھے۔ سینکڑوں بازو افق مغرب کی طرف بلند ہو رہے تھے اور خوشیوں کے نعرے فضاء مکہ میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح گونج رہے تھے۔

"عرفات والوں نے چاند دیکھ لیا" صحن کعبہ والوں میں سے ہزاروں آوازیں بلند ہوئیں اور آنکھوں کے ہزاروں جوڑے افق مغرب کی زردی مائل سرخیوں

کا کونا کونا اور چپہ چپہ ڈھونڈنے لگے۔

یکدم ایک طرف سے کسی نے پکارا،

"یا معشر قریش ـــ وہ رہا چاند" قریش نے ذی القعد کا چاند دیکھنے میں دوسروں پر سبقت کی ـــ

اور آن واحد میں ہزاروں انگلیاں اٹھیں۔ دور افق میں لٹکی ہوئی چاندی کی ہلکی سی لکیر پر نگاہیں جم گئیں۔ قریش کی برتری اور بزرگی کے ترانے حرم کعبہ میں گونج اٹھے۔

لوگ ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ ہاتھ ملائے گئے۔ ایک دوسرے کو مبارک سلامت کی دعائیں دی گئیں۔ حلیف قبیلے والوں نے نوزائیدہ چاند کی قسمیں کھا کھا کر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پرانے حلفوں کو تازہ کیا۔ دوستی اور مددگاری کے عہد و پیمان نئے سرے سے استوار ہو رہے تھے۔

ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ہر مشکل میں ساتھی بننے کے وعدوں کے ساتھ ساتھ پرانے دشمنوں سے دشمنی کرنے اور نسلوں کے پرانے انتقام لینے کی آگ کو بھی ہوا دی جا رہی تھی۔

"فلاں کے دادا نے فلاں وقت میرے دادا کے دائیں شانہ پر تلوار کا زخم لگایا تھا۔ میں ذی القعد کے نئے چاند کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے دادا کا بدلہ فلاں کے پوتے سے لوں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس شخص کے قبیلہ والے بول اٹھتے۔

"ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

پھر اس قبیلہ کے حلیفوں میں سے اگر کوئی آدمی وہاں ہوتا تو کہتا،

"قسم ہے ہبل کی جو کعبہ کے کنویں پر رکھا ہے۔ میں تمہارا حلیف ہوں

پڑے وقت پر تمہیں پیٹھ نہ دکھاؤں گا۔"

محبت اور نفرت کی اس ہماہمی میں لوگ محو تھے کہ یکدم ایک طرف

سے آواز سنائی دی۔

"یا اولاد ہاشم ـــــ"

اور مجمع میں گڑبڑ پھیل گئی۔ اولاد ہاشم ہی نہیں بلکہ عبدالمطلب کے

حلیف قبیلہ بنی جوزہ والے بھی بھاگ پڑے۔ لوگ سمٹ سمٹ کر کعبہ کی عمارت

کے گرد جمع ہونے لگے۔

کعبہ کے پاس عبدالمطلب کھڑے تھے۔ اُن کی سیاہ آنکھیں غصے سے

چمک رہی تھیں۔ وسیع ماتھے کی سلوٹیں پیشانی کے درمیانی حصے میں سمٹ آئی

تھیں۔ گردن کی رگیں تن گئی تھیں اور ہاتھوں کے پٹھے دائیں ہاتھ کو تلوار کے

دستے کی طرف کھینچ رہے تھے۔

عبدالمطلب کے بیٹے جو مجمعے میں چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے

لوگوں کو چیرتے ہوئے آئے اور اپنے باپ کے گرد جمع ہو گئے۔ بنی جوزہ

کے چند لوگ اُن کے ساتھ تھے۔

عبدالمطلب کے سامنے حرب بن امیہ کھڑا تھا۔ اُس کے ہونٹوں

پر طنز کی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں طعنے لرز رہے تھے۔

"اولادِ ہاشم جمع ہو گئی عبدالمطلب ــــ انہیں حکم دو کہ تمہارے چچا زاد بھائی کے بیٹے کے خون سے کعبہ کی بنیادوں کو سُرخ کر دیں۔"

"مجھے حرم کی عزت تم سے زیادہ پیاری ہے ابنِ امیّہ ــــ خدا کی قسم اگر یہ عزت پیاری نہ ہوتی تو یہ بوڑھے ہاتھ تمہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیتے۔"

"لیکن چاند حرب بن امیّہ نے سب سے پہلے دیکھا ہے۔ میں اس کا گواہ ہوں" امیّہ کے حلیف قبیلہ کے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"جھوٹ بکتے ہو" بنی جوزہ کے ایک آدمی نے کہا ــــ "میں اس وقت سردار عبدالمطلب کے پاس تھا جب انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کر کے کہا تھا، وہ رہا چاند۔"

حرب نے قہقہہ لگایا،

"جھوٹ کا گواہ جھوٹ ــــ" اُس نے طنزاً کہا اور اپنے چاروں طرف دیکھ کر کہا،

"اہلِ مکّہ جانتے ہیں کہ بڑھاپے کی وجہ سے عبدالمطلب کی آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں۔ وہ نئے چاند جیسی باریک چیز نہیں دیکھ سکتے۔"

"اس بڑھاپے کے باوجود عبدالمطلب کی بینائی تم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے ابنِ امیّہ ــــ"

"دعوے بے دلیل ہے ابنِ جوزہ" حرب نے قہقہہ لگایا۔ "بڑھاپا جوانی سے طاقتور نہیں ہو سکتا۔"

اس پر چاروں طرف سے فقرے اڑنے لگے۔ حرب کے حلیف اور مددگار عبدالمطلب کے بڑھاپے کا مذاق اڑانے لگے اور عبدالمطلب کے ساتھی عبدالمطلب کی برتری کے ثبوت دینے لگے۔ قریب تھا کہ یہ جھگڑا بڑھ کر لڑائی کی صورت اختیار کر لے کہ کاہن الخزاعی نے ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا،

"مکّہ والو۔۔۔! حرب بن عبدالشمس بن عبدالمناف بن قصیّ اور عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصیّ کا جھگڑا نیا جھگڑا نہیں ہے۔ یہ جھگڑا پشتوں سے چلا آرہا ہے۔ ہاشم اور امیہ کا جھگڑا کچھ اتنا پرانا نہیں جسے آپ بھول چکے ہوں آپ نے اپنے بزرگوں سے کئی دفعہ سنا ہوگا کہ ہاشم نے قوم کو ثرید کھلایا اور اس زمانے میں مکّہ والوں کو گندم کے آٹے کی روٹیاں کھلائیں جب کہ مکّہ میں سخت قحط پڑا ہوا تھا اور مکّہ والے بھوکوں مر رہے تھے۔"

"ہمارے باپ اُمیہ بھی سخاوت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے کاہن" حرب نے چمک کر کہا۔ "یہ مت بھولو کہ امیہ نے بھی قوم کی وہ شاندار دعوت کی تھی کہ مکّہ والوں کی کئی نسلیں انگلیاں چاٹتی رہیں گی۔"

"لیکن نقل نقل اور اصل اصل ہے ابن امیہ۔" کاہن نے اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "ہاشم نے قوم کو اس وقت کھانا کھلایا جبکہ قوم فاقوں مر رہی تھی۔ جب کہ مکّہ والوں کو روٹیوں کی ضرورت تھی۔ امیہ نے جب دیکھا کہ اس طرح دعوت کرنے اور اپنی فیاضی اور سخاوت کا ثبوت دینے سے ہاشم کی عزت عرب کے طول و عرض میں ہو رہی ہے،

تو اس نے بھی دعوت کا ڈھونگ رچایا لیکن ابن امیہ ہمارے بڑوں نے بڑی دیانتداری کے ساتھ ہم تک یہ بات پہنچا دی ہے کہ ہاشم کے ثرید میں جو لذت تھی امیہ پیدا نہ کر سکے۔ ہاشم کے ثرید کو قوم اب تک نہیں بھول سکی لیکن ــــ"

"خاموش رہو ــــ جھوٹ ہے یہ۔"

"یہ جھوٹ نہیں ہے، حقیقت ہے۔" کاہن نے مسکرا کر کہا، "اور اس کے بعد وہ دن بھی ہم میں سے کسی کو نہیں بھولا جب اُمیہ نے ہاشم کے خلاف اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے اس جگہ پکار کر کہا تھا ہاشم کون ہے ــــ کیا ہے۔ میں اُس سے ہر حالت میں بڑھ کر ہوں لیکن یہ دعویٰ بے دلیل تھا۔ جب بات پنچایت میں پیش کی گئی، تو مجھ سے پہلے مرنے والے نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ ہاشم امیہ سے ہر حالت میں افضل اور برتر ہے۔ تمہیں یاد ہوگا ابن امیہ ــــ تمہارے باپ کو سیاہ آنکھوں والی اونٹنیاں دینی پڑی تھیں کیونکہ وہ شرط ہار گیا تھا۔ اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ سخی ہاشم نے اُن اونٹنیوں سے خود ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا بلکہ انہیں مکہ کی تلہٹی میں قربان کر دیا تھا۔ ہاشم کی اولاد میں سے کسی نے اُس گوشت کو چھوا تک نہیں تھا۔ مکہ کے غریب اور مکہ کے آسمان میں اڑنے والی چیلوں، کوؤں اور گدھوں نے ہاشم کی اس سخاوت کی داد پیٹ بھر کر دی تھی۔ اور تم یہ نہیں بھول سکتے ابن امیہ کہ تمہارا باپ اس شرط کے ہار جانے کی وجہ سے دس سال شام میں جلا وطن رہا تھا۔"

حرب کی مٹھیاں تلوار کے دستے پر بھنچ رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر۔

پپڑیاں جم رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کا بس چل جائے تو وہ

کاہن الخزاعی کا سر قلم کر دے لیکن وہ مجبور تھا۔ تلوار کے دستے کو سہلانے

اور اپنے حلیفوں اور مددگاروں کی طرف چور آنکھوں سے دیکھنے کے سوا

وُہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔

"اور وہ دن تو تم یقیناً نہیں بھولے ہو گے حرب۔" کاہن حرب کی ہر

حرکت سمجھنے کے باوجود اس کی بے چارگی اور بے مزہ غصّے کو اور چمکا کر

مزے لینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہتا گیا،

—— "جب تم نے اپنے باپ کی نقل کرنے کی کوشش کی:"

چاروں طرف سے قہقہہ اڑا۔

"خاموش!" —— "بس!" کی آوازیں سنائی دیں اور جب یہ غلغلہ کم ہوا

تو کاہن نے کہنا شروع کیا،

"تم نے —— حرب بن امیہ نے —— عبدالمطلب بن ہاشم کو اپنے

مقابلے پر للکارا تھا۔ تم نے اپنے باپ کی طرح یہ دعویٰ بے دلیل اپنی قوم کے

سامنے پیش کیا تھا کہ تم —— ہارے ہوئے باپ کا شرمندہ بیٹا —— عبدالمطلب

سے برتر ہو۔ تمہیں یاد ہے —— تم نے کتنا شور کیا تھا۔ لیکن اس سب کا نتیجہ کیا

ہوا۔ تمہاری ہار ہوئی حرب ابن امیہ —— تم ہار گئے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ تم

عبدالمطلب سے کم تر ہو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس کی برابری کا دعویٰ کر سکو

اور یہ فیصلہ نفیل بن عبدالعزیٰ نے دیا تھا۔ جو عدی کے خاندان سے تھا اور

جس کا فیصلہ عرب بھر کے طول و عرض میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔"

"کاہن الخزاعی ـــــ یہ حرم ہے ورنہ تمہیں اس گستاخی کا مزہ چکھا دیا جاتا ـــــ"

"تم کاہن سے مخاطب ہو حرب ـــــ یاد رکھو میرے جنات تمہیں غارت کر دیں گے۔"

"جو بھی کچھ ہے۔" حرب نے سہم کر کہا ـــــ "تم اس وقت زیادتی کر رہے ہو۔ چاند میں نے پہلے دیکھا ہے۔"

"تم نے نہیں دیکھا ـــــ تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ میرا دعویٰ ہے عبدالمطلب کی بینائی تم سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ اس کا گواہ میں ہوں۔"

"ہبل کے تیروں سے فال لی جائے۔" عبدالمطلب نے کہا۔ "اس طرح اس جھگڑے کا فیصلہ ہوگا۔"

لیکن اب کافی رات ہو چکی تھی۔ مکہ میں چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ اس لئے ہبل کے تیروں سے فال لینے کا معاملہ عکاظ کے میلے کے بعد ملتوی کر دیا گیا۔ اس میلے کے بعد عبدالمطلب اور حرب کے اس جھگڑے کا فیصلہ ہوگا۔

ایک تو میلے کا جوش و خروش اور پھر حرب اور عبدالمطلب کا یہ عجیب و غریب جھگڑا، مکے والوں کی باچھیں کھلی پڑتی تھیں۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عکاظ کے میلے کے بعد ایک دوسرا میلہ لگے گا۔ شاید عکاظ کے میلے سے زیادہ پر لطف اور زیادہ سنسنی خیز۔

عبدالمطلب کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ اپنے لڑکوں کے ساتھ خوشی سے بلبے بلبے ڈگ بھرتے بوقبیس کی بلندیوں پر چڑھ رہے تھے۔ رات کی گہری تاریکیاں چاروں طرف گھر رہی تھیں۔ لیکن کل عکاظ کا میلہ تھا اور مکّہ کا ہر فرد خوشی سے مخمور ہو رہا تھا۔ بازاروں میں چراغاں ہو رہا تھا۔ دکانداروں نے اپنی اپنی دکانیں دُلہن کی طرح سجا رکھی تھیں اور زیتون کے تیل سے جلنے والی بڑی بڑی شمعیں دکانوں پر دھکڑ دھکڑ جل رہی تھیں۔

شراب بیچنے والوں نے اپنے پُرانے جھنڈے اتار دیئے تھے اور نئے جھنڈے ان کے دروازوں پر لہرا رہے تھے اور دکان پر لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ مخمور بازاروں میں اِدھر اُدھر چکر لگاتے ڈولتے بلند آواز سے اپنے قبیلے اور اپنی معشوقوں کی تعریف میں شعر پڑھتے پھر رہے تھے۔

عبدالمطلب نے اس نقشے کو دیکھ کر ہنستے ہوئے حارث سے کہا،

"عکاظ کا میلہ مکّے سے شروع ہو کر عکاظ میں ختم ہوتا ہے حارث۔"

"جی ــــ محترم" حارث نے جواب دیا۔

"تو اس کو عکاظ کی بجائے مکّہ کا میلہ کیوں نہ کہا جائے۔ یہ تو غلط نام ہے۔"

"بجا ارشاد ہوا ــــ اصل میلہ تو یہاں لگتا ہے۔"

"لیکن مکّہ والوں کے لئے اس دفعہ کا میلہ اچھا نہ رہا ــــ"

"ہماری تلواریں تیار تھیں" حارث نے کہا۔

"کاہن الخزاعی نے دانت کھٹے کر دیئے چچازاد بھائی کے۔"

"یہ لڑکا بہت گستاخ ہو گیا ہے۔"

"اس لڑکے کی عمر صرف چالیس سال کی ہے حضور ـــــ اس لئے گستاخی کافی پختہ ہے" ابولہب نے اپنے حریر کے جبّہ کو ایک شرابی کی قے سے بچاتے ہوئے کہا۔

عبدالمطلب ہنس پڑے۔

"خوب چوٹ کی ابولہب ـــــ"

لیکن ابولہب نفسیاتی طور پر داؤ قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ شرابی کی قے اپنا اثر کر چکی تھی۔ حریر کا جُبّہ تو بچ گیا تھا لیکن ابولہب کی ریشمی تہبند پر وافر مقدار میں چھینٹیں پڑی تھیں۔ اس لئے اُس نے والد کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے شرابی کو ڈانٹا،

"تجھ پر اور تمہاری جننے والی پر پھٹکار ہو" اور اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ کو پرے دھکیل دیا۔

شرابی نے لال لال آنکھوں سے ان سب کی طرف دیکھا اور تلوار کے دستے پر لڑکھڑاتا ہوا ہاتھ رکھ کر ڈولتی ہوئی ٹانگوں پر جمنے کی کوشش کی۔

"تجھے معلوم ہے تو کس کے ساتھ کلام کر رہا ہے۔ میں ابولہب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی کا ملازم ہوں۔ اگر میں نے اپنے آقا سے شکایت کر دی تو وہ اور اُس کے حلیف تجھے اور تیرے قبیلے کو موت

کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

ہچکیوں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں یہ الفاظ ادا کیے گئے۔ عبدالمطلب کو ہنسی آگئی۔ ابولہب نے جھک کر دیکھا۔ اس کا اپنا غلام نشے میں کھڑا ہچکولے کھا رہا تھا۔

"بدبخت ـــــ تو یہاں" ابولہب نے دانت پیس کر غلام کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"چھوڑ ـــ چھوڑ ـــ" غلام چلایا ـــ "یا محشر قریش ـــ یا محشر قریش" غلام پکارا۔

عبدالمطلب نے ہنس کر کہا۔

"چھوڑ دو ـــ ابولہب ـــ یہ تم سے بچنے کے لئے تمہاری ہی دہائی دے رہا ہے۔"

ابولہب نے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور غلام منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ زمین پر منہ رگڑ رگڑ کر رونے لگا۔

"یا محشر قریش ـــ یا محشر قریش"

لیکن عبدالمطلب اپنے بیٹوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

گھر پہنچ کر عبدالمطلب نے اپنی لڑکیوں اور کنیزوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں حرب کا سارا قصہ سنایا۔ عورتیں حرب کی شرمندگی اور ذلت پر خوب ہنستی رہیں۔ یہاں تک کہ خاصی دیر ہو گئی۔

لیکن حرب بن امیہ کے گھر کا نقشہ اور ہی تھا۔ وہ صحن کعبہ سے سخت

ذلیل ہو کر نکلا تھا۔ مکہ کے لوگوں نے اس پر طرح طرح کے فقرے چُست کئے تھے۔ بازاروں میں ان پر لوگوں نے انگلیاں اٹھائی تھیں۔ کچھ تو واقعی فقرے اڑاتے رہے۔ کچھ حرب کا اپنا تصور بھی تھا۔ جہاں کہیں لوگ کھڑے ہو کر باتیں کرتے نظر آتے حرب سمجھتا کہ اُسی کو موضوع بحث بنایا جا رہا ہے۔ بعض لوگ اسے ایک جلیل القدر اور مضبوط خاندان کا شیخ سمجھ کر عزت کے طور پر اُسے سلام کرتے تو حرب سمجھتا کہ اس پر طنز کی جا رہی ہے۔

اسی طرح کڑھتا جلتا وہ بالآخر اپنے گھر پہنچا اور جاتے ہی کنیزوں اور غلاموں پر برس پڑا۔ خواہ مخواہ بے مطلب۔ کسی کو محض اس لئے کوڑے لگا دیئے گئے کہ عکاظ کے میلے کی رات بھی اس کے کپڑے میلے ہیں۔ اس کا تخت کیوں صاف نہیں کیا گیا۔ اور جب غصہ مقہور و مغلوب غلاموں پر نکل چکا، تو اُس نے اپنی باندی کو حکم دیا کہ محلے میں جا کر محلے والوں اور دوسرے حلیفوں کو اس کے گھر میں آنے کی دعوت دے۔

باندی لشتم پشتم سر پر اوڑھنی ڈھکتی ہوئی بھاگی اور حرب کے احکام پھر گھر میں گونج اٹھے۔

تین بکریوں کو ذبح کرو ــــــ ان کا گوشت بھونو ــــــ آج مہمان آنے والے ہیں۔

اور غلام باندیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی، گرتی پڑتی بھاگیں۔ بڑے بڑے چولہوں میں کیکر اور پیلو کے موٹے موٹے تنے جھونک دیئے گئے۔ آگ کے شعلے کڑکڑاتی ہوئی لکڑیوں میں سے بلند ہونے لگے۔

باہر باڑھے میں بندھی ہوئی بکریاں، آرام سے آنکھیں بند کیے سجگالی میں مصروف تھیں۔ غلام جنہیں کوڑوں کی شدید ضربوں نے ناگ کی طرح غضب ناک بنا دیا تھا، آندھی کے طوفانی جھونکوں کی طرح باڑوں میں داخل ہوئے۔ کسی بکری کو ٹھوکر مار کر اٹھایا۔ کسی کے سینگ پکڑ کر اس کی گردن مروڑ ڈالی۔ کسی کو مکا مار کر لپک جانے پر مجبور کر دیا اور اس طرح باڑھ بھر میں بکریوں کی چیخ و پکار سے کہرام مچ گیا۔

دو بکریاں —— معصوم اور بے گناہ۔ غلاموں کے مضبوط ہاتھوں سے کھچ کھچ کر کراہتی ہوئی باہر آئیں۔ وہ حیران تھیں۔ شاید سمجھنے سے قاصر تھیں کہ اس طرح ایکا ایکی کیوں انہیں نیند سے جگا دیا ہے اور پھر باہر چھری غضب ناک ہاتھوں کی پوری قوتیں اور شدتیں اپنے اندر لیے ہوئے ان کی گردن پر پھر گئی۔ غلاموں نے آقا کا غصہ بے زبان بکریوں پر نکال لیا۔

اور تھوڑی دیر کے بعد حرب کا مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ حرب کی بیویاں مہمانوں کو شراب پلا رہی تھیں۔ بھنے ہوئے گوشت کے تکے غلاموں کے ہاتھوں پر پلیٹوں میں سجے چلے آ رہے تھے۔ منہ کا مزا بدلنے کے لئے دودھ میں پکے ہوئے ستو اور کھجوروں کو پیالوں میں بھرا ہوا تھا۔ ایرانی شیشے کی بڑی بڑی صراحیوں میں تیز گرم پانی تھا —— ایسی ہی خوبصورت صراحیوں میں سیاہ رنگ کی تیز شراب تھی۔ جب حرب کی بیویاں صراحیوں میں سے شراب پیالوں میں الٹتیں اور اس میں گرم پانی ملاتیں تو شراب میں جوش آجاتا اور مہمان اس اُبلتی جوش کھاتی، بلبلے اڑاتی شراب کو لمبے لمبے گھونٹوں میں پی جاتے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ منہ کی کڑواہٹ دور کرنے کے لئے گوشت کے نمکین تکے کھائے جا رہے تھے۔

شراب کا دور شروع ہونے سے پہلے بڑی سنجیدگی اور معاملہ فہمی سے آج کے جھگڑے پر غور ہو رہا تھا۔ سب مہمان بیک آواز اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ چاند سب سے پہلے حرب بن امیہ نے دیکھا تھا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جو موقع پر موجود نہ تھے۔ کئی ایسے تھے جو صحن کعبہ میں تو موجود تھے لیکن حرب سے کئی گزوں کے فاصلے پر تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو سرے سے اس وقت مکے میں تھے ہی نہیں لیکن بایں ہمہ سب قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے خود سب سے پہلے حرب کی انگلی کو اٹھتے دیکھا ہے اور حرب کی آواز کو کہتے سنا ہے،

"وہ رہا چاند ــــ!"

لیکن جب شراب کا دور چلا تو سنجیدگی ختم ہو گئی۔ فحش گالیاں اور گندی قسمیں شروع ہو گئیں۔ حرب کی تعریف میں قصیدے کہے جانے لگے۔ شراب نے سب کو شاعر بنا دیا تھا۔

اور جب نشہ اپنے عروج پر پہنچ گیا تو حرب کی بیویاں گھر کے اندر چلی گئیں کیونکہ زبان درازی بڑھ کر دست درازی کے خطرناک مقام پر پہنچ چکی تھی۔

ایک شرابی نے پیالہ اٹھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھومتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے بولا،

"حرب بن امیہ! تم مکہ ہی کے نہیں بلکہ کل عرب کے رئیس ہو۔ قریش کے

سردار نہیں دنیا کے سردار ہو۔ تم نے ہمیں وہ شراب پلائی ہے جو گرم پانی پی کر غصّے سے اُبل پڑتی ہے۔"

"تمہاری سخاوت،" دوسرے نے اسی طرح کھڑے ہو کر کہا، "زمین پر ہی نہیں آسمان پر بھی مشہور ہے۔ سمندر کو تم نے پانی بخشا، پہاڑوں کو تم نے بلندی عطا کی ــــــ حرب بن امیّہ میں تمہارے سامنے سجدہ کرتا ہوں۔" اور شرابی دھڑام سے منہ کے بل حرب کے سامنے گر پڑا۔

"بہک گیا پاگل۔" حرب جو خود خاصے نشے میں تھا بولا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ چاند پہلے حرب نے دیکھا یا عبدالمطلب نے؟" ایک شرابی جو شراب پی کر بالکل چپ ہو گیا تھا بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔

"حرب نے۔" آوازیں آئیں۔

"اُوہنوں،" فلسفی نے پیالہ دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "اُوہنوں! عبدالمطلب نے۔"

"خاموش بدلگام ــــــ تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔" ایک اور ہمت کا پورا اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

اور اس طرح سے جھگڑے کی ابتداء ہوئی۔ شرابی ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ چند لمحوں میں ایران میں بنی ہوئی شیشے کی خوبصورت صراحیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ کسی کا سر پھٹا، کسی کا بازو ٹوٹا اور یہ مجلس بالآخر برخاست ہوئی۔

لیکن سب مہمانوں نے جاتے جاتے حرب کی تعریف کی۔ سب نے اس کی سخاوت اور دریادلی کا دل سے اعتراف کیا۔

شاید اسی لئے جب حرب لڑکھڑاتا ہوا سونے کے لئے اپنے کمرے میں آیا تو اُس کے ہونٹوں پر ایک تابناک مسکراہٹ لرز رہی تھی۔ وہ شاید یہی سوچ رہا تھا کہ اُس نے قوم کے سامنے عبدالمطلب کو ذلیل کر کے اپنی شرافت اور برتری کا سکہ مکے والوں پر بٹھا دیا ہے۔

۲

دوسرے دن صبح ابھی سورج پوری طرح سے بلند نہیں ہوا تھا لیکن مکہ کے بازاروں میں چہل پہل تھی۔ مکانات کے دروازوں کے سامنے اونٹ خچریں اور گدھے لادے جا رہے تھے۔ لینا پکڑنا اور باندھنا کسنا کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بچے اور جوان بڑے جوش و خروش سے سامان باہر لا رہے تھے اور بار برداری کے جانوروں پر باندھ رہے تھے۔ بوڑھے اس ہماہمی سے الگ ایک طرف کھڑے ہو کر اپنی بلند ترین آوازوں میں ہدایات دے رہے تھے۔

ابو لہب بھی آج صبح ہی صبح اپنے والد عبدالمطلب کے گھر آ گیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ پورے کا پورا کنبہ عکاظ کے میلے میں جائے گا۔ بچے اور عورتیں بھی سیر کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ ابو لہب کچھ تجارت بھی کرے گا۔ اس کے علاوہ محمدؐ کی پیدائش کی خوشی میں ابو لہب نے جو لونڈی آزاد کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے

گھر کے کاروبار میں وقت ہو رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ابو لہب کی ایک نہیں
کئی لونڈیاں اور غلام تھے۔ لیکن گھر کے کام بھی تھوڑے نہ تھے۔ بڑا کنبہ اور
پھر قریش کے عظیم القدر سردار کے امیر و کبیر بیٹے کا گھر۔ مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا
تھا۔ دن میں پانچ سات بکریوں کا ذبح ہو جانا معمولی بات تھی۔ اس لئے کام
کرنے والوں میں سے اگر ایک بھی کم ہو جاتا تو اس کی کمی نمایاں طور پر محسوس ہونے
لگتی تھی۔ اس لونڈی کے آزاد ہو جانے کی وجہ سے ابو لہب کے گھرانے میں
نمایاں کمی محسوس ہو رہی تھی اور اس کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کی
جگہ ایک اور کنیز یا غلام خرید لیا جائے۔ ابو لہب دو تین سال سے اس کو
ٹالتا آ رہا تھا۔ لیکن اس سال اس نے ایک کنیز خریدنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ خیال
تھا کہ عکاظ کے میلے میں شام یا ایران یا روم کی طرف سے غلاموں کا کوئی
تاجر ضرور آئے گا۔ اور سستے داموں اچھی کنیز ہاتھ لگ جائے گی۔

آج سے پہلے عبدالمطلب بھی عکاظ کے میلے میں جانے کی تیاریاں بڑے
زور و جوش کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ ابھی ذی القعد کا چاند نکلنے میں پورے
دو مہینے باقی تھے۔ جب سے عبدالمطلب میلے میں جانے کا اعلان کر رہے تھے
بچوں اور عورتوں کو بھی پوری طرح سے تیار کر لیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بنو سعد
کے خیموں میں قاصد بھی بھیجنے کا مشورہ ہوا تھا کہ چند دنوں کے لئے محمدؐ کو بلوا لیں
وہ تو آمنہؓ نے منع کر دیا۔ آمنہؓ کا خیال تھا کہ مکہ کی آب و ہوا کچھ اچھی نہیں ہے
اور بچے کے پروان چڑھنے کے لئے کھلی اور صاف ستھری آب و ہوا کی سخت
ضرورت ہے۔ عبدالمطلب آمنہ کی اس دلیل سے آدھے منے سے ہو کر بولے،

"میلے کا لطف آدھا رہ جائے گا۔"

"لیکن بچے کی صحت و سلامتی اور توانائی زیادہ ضروری ہے۔" آمنہ نے کہا۔

اور عبدالمطلب نے قاعد کو بنو سعد کے خیموں میں جانے سے روک دیا لیکن اس کے باوجود عبدالمطلب کے گھرانے میں دو مہینے متواتر میلے کے چرچے ہوتے رہے۔ حمزہ ابھی بچہ تھے پہلے انہوں نے میلہ کبھی دیکھا نہ تھا اس لئے زیادہ پُرجوش تھے۔ ہر روز اپنی والدہ سے میلے کے متعلق پوچھتے اور جانے کے دن گنا کرتے تھے۔

لیکن چاند دیکھنے کے بعد حرب بن امیہ کے ساتھ جو قصہ ہو گیا تھا اس کی وجہ سے عبدالمطلب کا جوش و خروش بڑی حد تک سرد پڑ گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قریش کے ہر آدمی نے اُن کی حمایت کی تھی اور خود کاہن الخزاعی نے سارے مکہ کے سامنے ان کی عزت و عظمت کا اقرار کیا اور دوسروں سے کرالیا تھا۔ اس کے باوجود عبدالمطلب سمجھ رہے تھے کہ حرب اگر ان کی عزت پر صحن کعبہ میں حملہ کر سکتا ہے تو میدان عکاظ میں کیوں اس حرکت سے باز رہیگا اور پھر میدان عکاظ کعبہ کی طرح حرم تو نہیں۔ بہت ممکن ہے اسی ذرا سی بات پر تلواریں کھینچ جائیں اور بھائی کے ہاتھوں بھائی کا نقصان ہو جائے۔ کچھ تو یہ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عبدالمطلب حرب کی اس دریدہ دہنی اور گستاخی کو فال بد سمجھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بُرے دن جب آتے ہیں تو معمولی آدمی پگڑی پر ہاتھ ڈالنے سے نہیں چوکتے۔ سورج جب غروب ہونے کے

قریب ہوتا ہے تو چھوٹے چھوٹے تنکے اپنے سایوں کو لمبا کر کے بڑے
بڑے درختوں کی بلندیوں پر قہقہے لگانے لگتے ہیں۔ یہ بُرے دنوں کی علامت
ہے کہ حرب ایک دفعہ شکست فاش کھا کر دوبارہ پھر اُن کے منہ لگنے کی
جرات کرنے لگا ہے۔

عبدالمطلب کے اس خیال کو دُور کرنے کی ان کے بیٹوں نے لاکھ
کوشش کی تھی لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ ایک ہی بات کہے جاتے تھے کہ عکاظ
میں کسی بھی قیمت پر نہ جائیں گے۔ عورتیں اور خصوصاً حمزہ نے مچل مچل کر انہیں
منانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہیں سنی اور ہر بات کا ایک
ہی جواب دیتے رہے۔

"عبدالمطلب کی اولاد اس سال عکاظ میں نہیں جائے گی"

ابولہب کو ارادے کی اس فوری تبدیلی کی بھنک پڑ گئی تھی۔ گو اُسے
مکمل حالات کا تو علم نہ تھا۔ تاہم اس کی ایک لونڈی نے بی بی آمنہ کی کنیز سے
سُن لیا تھا اور اپنے مالک تک پہنچا دیا تھا۔ ابولہب صبح ہی صبح اسی لئے
آئے تھے۔

بچے عورتیں اور دوسرے مرد ابولہب کی آمد پر پھر خوش ہو گئے۔ انہیں یقین
تھا کہ ابولہب سردار قریش کو منالیں گے۔ لیکن ابولہب کے اصرار کا جواب بھی
وہی انکار تھا۔ ابولہب نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ عکاظ میں اُسے کافی
منافع کی امید ہے، اچھی کنیز مل جانے کی توقع ہے، حرب کو آنکھ ملانے کی
جرات نہ ہوگی، کسی دوسرے کو آپ کے سامنے آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ

ہوگی۔ یہ ہوگا اور وہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس کی یہ ساری کوششیں بیکار گئیں۔ وہی ٹکا سا جواب بوڑھے ہونٹوں پر دھکتا رہا۔

"عبدالمطلب کی اولاد ذبح نہیں جائے گی۔"

آخر بڑی بحث اور کافی تو تو میں میں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ عبدالمطلب اپنے بیٹوں کے ساتھ کعبہ تشریف لے جائیں اور ہبل کے تیروں سے فال لیں اگر ہبل نے اجازت دے دی تو عبدالمطلب کو میلے میں شرکت کرنے سے انکار نہ ہوگا اور اگر اس خدائی آواز نے نفی میں جواب دیا تو کسی کو میلے میں شرکت کرنے پر اصرار کرنے کا حق نہ رہے گا۔

سب کے سب کعبہ کی طرف روانہ ہوئے۔

ہبل کعبہ کا سب سے بڑا بت اور مکہ کیا کل عرب کا معبود معظم کعبہ کے وسط میں ایک کنوئیں پر رکھا ہوا تھا۔ نذر نذرانہ جو کچھ بھی اس بت پر چڑھایا جاتا تھا اس کنوئیں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس کے پاس سات پانسے رکھے رہتے تھے اور ہر پانسے پر ایک تحریر کندہ تھی۔ ایک پر لفظ دیت لکھا تھا جب قریش میں دیت پر اختلاف رائے ہوتا تو اس بت کے پاس آتے اور پانسوں کو ملا کر پھینک دیتے۔ جس شخص کے نام "دیت" کا پانسہ نکلتا اسے دیت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اسی طرح دوسرے پانسے پر "ہاں" کا لفظ کندہ تھا تیسرے پر "نہ" چوتھے پر "تم میں سے" کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ پانچویں پر "ملا ہوا" رقم تھا۔ چھٹے پر "تمہارے غیروں میں سے" اور ساتویں پر "پانی" کا لفظ کندہ تھا ـــــــ!

یہ ساتوں پانسے مکہ والوں کی بالخصوص اور عام عربوں کی بالعموم قسمتوں کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ عبدالمطلب بھی اپنے بیٹوں کو لے کر اسی غرض سے گھر سے نکلے تھے۔ اگر پانسہ "ہاں" پر پڑا تو یہ سب عکاظ کے میلے میں جائیں گے اور اگر "نہ" پر نکلا تو عبدالمطلب کی رائے غالب رہے گی۔

یہی وجہ تھی کہ گھر سے نکلتے وقت جوانوں اور بچوں نے دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ پانسہ "ہاں" پر پڑے اور وہ میلے میں چلے جائیں۔ عبدالمطلب کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔

کعبہ میں پہنچ کر عبدالمطلب بڑی عقیدت کے ساتھ ہبل کے پاس پہنچے جو تھوڑا بہت نذرانہ ساتھ لائے تھے عقیدت کے ساتھ بت کے کنوئیں میں ڈالا اور خضوع و خشوع سے آنکھیں بند کر کے بلند آواز سے کہا،

"اے ہمارے رب! ہم تیری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ میرے بچے عکاظ کا میلہ دیکھنا چاہتے ہیں لیکن میں اپنے دشمنوں کی کینہ توزی سے پناہ چاہتا ہوں ـــــ اے میرے رب! تو جانتا ہے کہ میں بزدل نہیں۔ میں نے تلواروں کے سائے میں عمر گزاری ہے۔ میں اپنے باپ ہاشم اور اپنے دادا عبد مناف اور اس کے باپ قصی کی طرح میدانِ جنگ کو بچوں کا کھیل سمجھتا ہوں لیکن تو اس راز سے بھی بے خبر نہیں کہ حرب بن امیہ عبدشمس کا بیٹا ہے اور عبدالشمس میرے دادا عبد مناف کا بھائی تھا۔

اے میرے رب! میں نہیں چاہتا کہ ایک جسم کے دو بازو
ایک دوسرے کو کاٹ دیں اور دیکھنے والے تماشہ دیکھیں
اور سننے والے ہنسیں۔ میں اس جوش فضول سے پناہ چاہتا ہوں
حرب بن امیہ اگر مجھے دشمن سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ لیکن وہ
میرے دادا کے بھائی کی اولاد ہے۔ میں اس کی بہتری چاہتا
ہوں۔ اے میرے مالک! تو مجھے راستہ بتا۔ تو بتا کہ تیرے
بندوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اگر میدانِ عکاظ میں جانا ہمارے
لئے مفید ہو، تو میرے مالک "ہاں" کہہ دے اور اگر تیرے
اس غلام کا خیال درست ہو تو "نہیں" فرما کہ ہمیں راستہ دکھا
—آمین!"

عبدالمطلب نے آنکھیں کھولیں اور پانسہ پھینکنے والے کو اشارہ کیا۔
پانسہ پھینکنے والے نے کاروباری نگاہوں سے اردگرد بکھری مضطرب نگاہوں
کو دیکھا۔ ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ پانسوں کو ہاتھ میں ال کر ملا دیا اور
ہبل کی جے کار پکار کر پانسہ پھینک دیا۔

"دیت" اس نے ایک پانسہ اٹھایا۔

"تم میں سے" دوسرا پانسہ پڑھا گیا۔

اور لرزتے ہوئے دلوں نے کلیجے تھام لئے جب پانسہ پھینکنے والے
نے تیسرا پانسہ پکڑ کر بلند آواز سے کہا، "نہیں" اور پھر اس آسمانی حکم کی تفسیر کرتے
ہوئے بولا،

"سردار قریش کا میدانِ عکاظ میں جانا مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اس سے اعراض فرمائیں۔"

پانسہ پھینکنے والے کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ چھا گئی اور اس نے سینے تلے سیکھے اور مشق کیے ہوئے انداز میں جھک کر کہا،

"اور کیا خدمت کر سکتا ہوں سردار قریش۔"

نوجوانوں کے چہرے اتر گئے۔ ابولہب خاموش ہو گئے اور گردن جھکا کر ایک طرف چل دیئے۔ عبدالمطلب نے مسکرا کر پانسہ پھینکنے والے کا شکریہ ادا کیا اور "چلو ــــ نکلو" کہتے حرم سے باہر آ گئے۔

خدائی آواز نے بھی ان کی تصدیق کر دی تھی۔

رات اتنی کثرت سے شراب پی گیا تھا وہ ــــ حرب کو اپنے آپ پر حیرت تھی۔

سورج نصف النہار پر پہنچا تھا جب اس کی خاص کنیز نے اسے بیدار کیا۔ اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ دماغ پر ایک بوجھ سا تھا اور منہ کا مزا بہت خراب ہو گیا تھا۔

مالک کو بیدار پا کر کنیز نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں پر گرے ہوئے پردے اٹھا دیئے۔ دوپہر کی گرم دھوپ چھم سے کمرے میں آ گئی۔ کنیز واپس چلی گئی۔ اور حرب یونہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کاہلی اس کی رگوں میں اب بھی دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ اس کا خمار آلود ذہن گزشتہ رات کے واقعات کو ابھارنے لگا۔ چاند کے دیکھنے پر جو تکرار ہوئی تھی۔ وہ اُسے یاد آگئی۔ حرب کے دل کے قریب ہلکا سا دھکا لگا۔ چاند ــــــ!

ہاں اُسے یاد آگیا ــــ لیکن چاند تو سب سے پہلے عرفات کی بلندیوں پر کھڑے ہوئے لوگوں نے دیکھا تھا۔ اس میں نہ حرب نے پہل کی تھی اور نہ عبدالمطلب نے۔

لیکن حرم کعبہ میں ــــــ؟

ہاں اسے آہستہ آہستہ یاد آنے لگا۔ وہ کعبہ کے دائیں ہاتھ پر کھڑا تھا۔ اور بائیں ہاتھ پر عبدالمطلب تھے۔ اُسے یاد آگیا تھا عبدالمطلب نے یک بیک چمک کر کہا تھا ــــــ،

"وہ رہا چاند"

اُسے یاد تھا ــــ وہ صاف بلند رعد کی طرح گرجتی ہوئی آواز عبدالمطلب کی تھی جس نے اس کی رگ رگ کو جھنجھنا دیا تھا اور یکایک اپنی کمتری کا خیال زہر بجھی سوئیوں کی طرح اس کے ذہن میں گڑ گیا تھا۔ اس قریشی کے وہ الفاظ اس کے ذہن میں انگاروں کی طرح دہک اُٹھے ــــــ

"عبدالمطلب تم سے ہر حالت میں افضل ہے حرب"

قریشی نے افضلیت کا فیصلہ دیتے وقت کہا تھا،

"اس کا قدم تم سے اونچا ہے۔ آواز تم سے زیادہ بلند، صاف اور بارعب ہے، اس کا سر تمہارے سر سے بڑا ہے۔ اس کا رنگ تمہارے رنگ سے

زیادہ صاف اور خوبصورت ہے۔ وہ تم سے زیادہ سخی ہے اور وہ ہاشم کا بیٹا ہے جو تمہارے باپ سے زیادہ سخی اور افضل تھا۔۔۔"

یہ الفاظ یک دم اس کے ذہن میں بیدار ہو گئے تھے۔ بجلی کا کوندا اتنی تیزی سے چمک کر غائب نہیں ہو سکتا، جتنی تیزی سے یہ الفاظ اس کے ذہن کے گوشے گوشے میں ابھر کر اس کے خون کو کھولا گئے تھے۔ اور اب پھر چاند دیکھنے میں عبدالمطلب نے سبقت کی تھی۔ حرم کعبہ میں ہزاروں آدمی جمع تھے اُن میں سے کسی ایک کو بھی چاند نظر نہیں آیا تھا۔ یہ شرف بھی دیوتاؤں نے عبدالمطلب ہی کو دیا تھا۔

حرب کو یاد تھا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کے سینے میں لاکھوں تیر ڈوب گئے ہیں ۔۔۔ جلتے ہوئے اور جلاتے ہوئے تیر۔

اور جس طرح سمندر کی لہروں میں ڈوبتا ہوا انسان تنکے پر ہاتھ مارتا ہے اسی طرح حرب نے اس دفعہ تنکے پر ہاتھ مارا تھا۔ ادھر عبدالمطلب کی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی حرب نے اپنی انگلی اٹھا کر پکار دیا۔

"یا معشر قریش وہ رہا چاند۔۔۔"

"قریش نے ذی القعدہ کا چاند دیکھنے میں دوسروں پر سبقت کی۔" اور حرب دوسروں کے سامنے اعتراف کرنے سے چاہے کتنا ہی کیوں نہ گھبرائے وہ اس وقت اپنے بستر پر لیٹا مکہ کی چمکتی ہوئی دھوپ کو آنکھوں میں سمیٹ کر اپنے دل کے سامنے یہ تلخ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ اس نے اب تک ذی القعدہ کا چاند نہیں دیکھا ہے۔

جھوٹ ـــــ؟

نہیں ــــ! سیاست!!

حرب نے اپنے دل کو اس جواب سے مطمئن پا کر میٹھا موٹر لی لطف اس کی پنڈلیوں اور رانوں میں رینگ رہا تھا۔

اور پھر اُسے اس تکرار کا ایک ایک لفظ یاد آ گیا کاہن الخزاعی کی وہ تلخ باتیں جو سچ ہونے کے باوجود سخت وکرخت تھیں۔ بھالوں کی نوکوں کی طرح اس کے دماغ میں تیرنے لگیں۔

اور پھر رات کی شراب نوشی۔ حرب نے انگڑائی لی۔ شرابیوں کی زبان پر اس کی سخاوت و شجاعت کے فسانے تھرک رہے تھے۔ ایک کاہن الخزاعی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ قریش کے کئی افراد اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ شراب پی کر ہی سہی، پر تھے تو۔

اُس کی خاص کنیز گرم پانی کی صراحی لے کر اندر آ گئی۔

"آقا غسل فرمائیں گے۔"

"ناشتہ" حرب نے مختصراً کہا اور اسی طرح بستر پر دراز رہا۔

ناشتے میں کیا کچھ نہیں تھا؟ کھجوریں، یمن کے تازہ اور میٹھے انگور اور کالی ــــ بلبلے اچھالتی ہوئی شراب۔ رات کا نشہ دور کرنے اور کسل زائل کرنے کا بہترین طریقہ صبح نہار منہ شراب پینا تھا۔

حرب اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

"رات دعوت کیسی رہی۔"

"امیہ خاندان کی شان و شوکت اور دولت و صولت کے شایان تھی آقا!"

"ہوں!" حرب خوش ہو گیا۔

"ہمارا بیٹا ابو سفیان کہاں ہے؟"

"لونڈی چھوٹے آقا کو پیش کرے؟"

"ہاں —— میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لونڈی چلی گئی اور حرب نے زیر لب مسکرا کر دھیمی آواز میں کہا،

"امیہ خاندان کی شان و شوکت اور دولت و صولت" اور ایک ہلکا سا قہقہہ اس کے حلقوم میں اٹک اٹک کر غرغرایا۔ جس طرح صراحی کی قلقل اٹک اٹک کر گھنگتی ہے۔

حرب نے انگور کا ایک خوشہ اٹھا کر اسے دائیں بائیں گھما کر دیکھا اور ہونٹوں سے اس کے دانے توڑنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد ابو سفیان داخل ہوا ——

"ابا حضور آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔"

"اہا ہا ہمارا بیٹا —— کھانا کھا لیا ہمارے بیٹے نے" حرب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"عکاظ کے میلے میں کب چلئے گا ابا حضور"

اور حرب کے چہرے پر ہلکی سی نامعلوم سلوٹیں جز بز ہو گئیں۔ عکاظ کے میلے میں بھی تو غیر نہ ہوں گے۔ وہی قریشی اور عرب کے دوسرے قبائل۔ بہت ممکن ہے کہ عبدالمطلب سے پھر ٹکر ہو جائے اور پھر ویسی ہی بے لطفی

ہو۔ اس لئے حرب نے جلدی ہی فیصلہ کر لیا۔

"اس دفعہ نہیں ـــــ اگلی بار چلیں گے۔"

"لیکن آقا حضور،" ابوسفیان نے کہا۔ "اس دفعہ تو عکاظ کے میلے میں قبیلہ فہم کے شاعر ثابت بن جابر کی دوڑ ہو گی۔ اور سنا ہے اس کے مقابلے میں قبیلہ ازد کا شنفرا قبیلہ فہم کا عمرو بن براق ہوں گے۔ بڑے زوروں کی دوڑ ہو گی۔"

"میلہ تو اس دفعہ بڑا اچھا ہے۔ گھوڑوں کی دوڑ بھی سنا ہے ہونے والی ہے۔ اس پر شرطیں وغیرہ لگیں گی ـــــ لیکن طبیعت نہیں مانتی ـــــ جانے کو جی نہیں چاہتا بیٹا۔"

کنیز پھر حاضر ہوئی۔

"ایک غلام تخلیئے میں حضور سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

"حبشی ـــــ؟"

"حضور ـــــ!"

"فوراً بھیج دو۔"

موٹے ہونٹوں والا حبشی داخل ہوا اور متوحش نگاہوں سے ابوسفیان کی طرف دیکھ کر بولا،

"حضور کے حکم کے مطابق میں وہاں گیا تھا۔"

"پھر؟"

"ان لوگوں نے عکاظ کے میلے میں جانے کا ارادہ ـــــ"

"کر لیا ہے۔" حرب نے بیتاب ہو کر سوال کیا۔

"نہیں آقا ــــ بدل دیا ہے ــــ کہتے ہیں ہبل کے تیروں سے مشورہ کیا گیا تھا ــــ"

حرب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں چھا گئیں۔ آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔

"یہ پھل اور شراب لے جاؤ ــــ یہ تمہارا حصّہ ہے۔"

"آقا کی عنایت کو غلام ابدالاباد تک یاد رکھے گا۔"

غلام نے جھک کر چیزیں اٹھائیں اور اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔

"ہاں تو ابو سفیان!" حرب نے بیٹے کے کندھے کو زور سے تھپک کر کہا، "عکاظ میں دوڑ دیکھنے کے قابل ہو گی۔"

"شہر میں تو اس دوڑ کے بڑے چرچے ہو رہے ہیں۔"

"اور گھوڑوں کی دوڑ بھی ہے۔ اس کے علاوہ شاعروں کی چونچیں بھی، معلوم ہوتا ہے اس دفعہ سننے کے قابل ہوں گی۔ سنا ہے اربد بن شماع بھی اس دفعہ آ رہا ہے میلے پر۔"

"پھر تو ابا حضور ضرور چلیے ــــ بڑا لطف رہے گا وہاں۔"

"اور سنا ہے عرب کے بڑے بڑے نامی تیر انداز آ رہے ہیں۔"

"ابا حضور حکم دیجیے میں تیاری کراؤں۔"

"میرا تو جی نہیں چاہتا ــــ ہاں تم مجبور کرتے ہو تو چلے چلتے ہیں۔"

"تو پھر تیاری کراؤں ــــ"

"ہاں ـــ غلاموں کی وافر تعداد ساتھ ہونی چاہیئے۔ خیموں اور قناتوں کا انتظام کر لو۔ آج ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا بیٹا ہماری مدد کے بغیر کس طرح سفر کا انتظام کرتا ہے۔"

اور حرب کو یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ اس کا بیٹا سفر کا انتظام کرنے میں بڑا ہوشیار ہے۔

اونٹ بڑے سلیقے سے لادے گئے تھے۔ خیمے ایک اونٹ پر لادے گئے تھے اور دوسرے اونٹ پر فرش فروش، پردے اور تکیئے بندھے تھے۔ تیسرے پر کھانا پکانے، کھانے اور شراب پینے پلانے کا سامان تھا۔ عورتوں کے لئے بادرفتار اونٹنیوں پر محمل کس دیئے گئے تھے۔ حرب کے لئے اس کا اپنا سیاہ رنگ کا گھوڑا تھا اور ابوسفیان کے لئے بھی اسی نسل کا گھوڑا زین سے سجا سجایا اور کسا کسایا کھڑا تھا۔ خچر اور گدھے غلاموں کے لئے موجود تھے اور حرب کے حلیفوں کا جم غفیر ہتھیاروں سے سج کر سفر کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

یہ سب تیاریاں کرتے کرتے شام ہو گئی تھی۔ حرب چاہتا تھا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے کوچ کر دیا جائے۔ ایسا کیوں چاہتا تھا وہ ـــ؟ بعض نے پوچھا بھی۔ لیکن حرب نے اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

لیکن جتنی جلدی کی جا رہی تھی اتنی ہی دیر ہوتی جاتی تھی۔ اور کچھ نہیں تو محمل کے بند ہی ٹوٹ گئے اور پھر کسنے میں آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اسی طرح

چھوٹے چھوٹے کاموں میں کافی وقت ضائع ہوگیا۔ اور حرب جو چاہتا تھا وہ نہ ہوسکا۔ اندھیرے نے دھیرے دھیرے آہی لیا اس قافلے کو۔

لیکن حرب اس تاریکی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے والا نہ تھا۔ اس نے اپنی بلند ترین آواز میں شمع برداروں کو پکارا۔ زیتون کے تیل کے کپڑے لٹھ اٹھائے گئے اور شمعیں دھکا دھک جل اٹھیں۔

زیتون کی خوشبوؤں سے مکہ کے بازار مہک اٹھے اور شمعوں کی روشنی میں یہ جلوس حرب بن امیہ کے بازار سے نکل کر عبدالمطلب کے بازار کی طرف ہولیا۔

ابوسفیان بھی حیران تھا۔ سیدھی سڑک اس چوک کو جاتی تھی۔ جہاں سے شام وغیرہ کو سڑکیں پھٹتی تھیں۔ پھر اتنا لمبا چکر لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اس نے اس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اچھا ہی ہے ذرا سیر رہے گی۔ اور نہیں تو مکہ کی سیر ہی سہی۔

اس کے علاوہ میلے میں شامل ہونے کی سنسنی اس کی جوان رگوں میں مچل رہی تھی۔ اس گرماگرمی کے موقع پر کسی اور خیال کا آنا ہی ناممکن تھا اور اگر آ بھی جاتا تو اس کو اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی۔

دھکڑ دھکڑ جلتی ہوئی شمعوں کی چندھیاتی ہوئی روشنی میں تلواریں ڈھالیں اور نیزوں کی انیاں چمک رہی تھیں۔ غلام بلند آواز سے بظاہر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ راہ چلتے اس عجیب جلوس کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور پوچھ بیٹھتے۔ اور غلام اتنی بلند آواز میں جو مکانوں کے اندر پہنچ جائے کہتے

"سردار قریش حرب بن امیہ عکاظ کے میلے کو رونق بخشنے کے لئے
تشریف لے جا رہے ہیں۔"

اسی طرح اعلان ہوتا رہا اور بالآخر یہ جلوس عبدالمطلب کے گھر کے
قریب پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر غلاموں کی آوازیں اور بھی بلند ہو گئیں۔ حرب کا سینہ
تن گیا ——— خاندان عبد شمس کے حلیفوں کی تلواریں، نیزے اور ڈھالیں بلند آواز
سے کھنکھنانے لگیں۔ دروازے کے عین سامنے پہنچ کر حرب نے ایک راہگیر
کو مخاطب کیا اور پوچھا ———

"کیا اولادِ ہاشم عکاظ کے میلے میں نہیں جائے گی؟"

"نہیں ———"

"او ———" حرب نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اُسے معلوم تھا
کہ اس فقرے کی تشریح کرنا غلاموں اور حلیفوں کا کام ہے اور اُنہوں نے اپنا
فرض پورا کر دیا۔

"جہاں خاندانِ شمس ہو وہاں ہاشم کا خاندان نہیں جایا کرتا۔"

اور دوسرا کہتا ———

"سورج کے سامنے ستارے نہیں ٹکا کرتے۔"

عبدالمطلب کے گھر کی کھڑکی تیزی کے ساتھ بند ہو گئی۔

حارث تیز تیز قدموں سے کمرے میں چل رہا تھا۔ عبدالمطلب کمبل بچھے
تخت پر بیٹھے تھے۔ حارث نے نفرت اور غصے سے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا،
"کاش آپ اجازت دے دیتے ——— میں ان بدبختوں کا خون

کر دیتا۔"

اور عبدالمطلب اپنی سفید لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے،

"میں نہیں چاہتا کہ عبد مناف کے گھرانے کی تلواریں دشمنوں کی بجائے ایک دوسرے کے خون میں ڈوب جائیں۔ میری زندگی میں ایسا نہ ہوگا حارث ——— ہاں میری موت کے بعد تم لوگوں کو اختیار ہے۔"

حارث کے پاؤں تیزی سے فرش پر پڑنے لگے اور دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اونٹوں کی بلبلاہٹوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

۴

مکہ سے جانب مشرق تین دن کے سفر پر عکاظ کا وسیع میدان تھا۔ یہ میدان اپنی قسم کا نرالا ہی تھا۔ اس میں کہیں خشک چٹیل میدان تھے جو گو ریتلے نہیں تھے لیکن کبھی سبز گھاس کی صورت بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ پختہ کوٹی پٹی زمین کے بڑے بڑے چھتے کہے جا سکتے تھے۔ اور ان چکیتوں کے ارد گرد لہلہاتے ہوئے کھجوروں کے درخت تھے جن میں سردیوں کے دنوں میں جب بارش کثرت سے ہوتی تھی ہری ہری گھاس چاروں طرف پھیل جاتی تھی۔ اس گھاس میں پھولوں کے خودرو پودے پیدا ہو جاتے۔ جن پر اُثمام اور ثمامہ جیسے خوشبودار پھول لگا کرتے تھے۔ اس میدان میں ایک چشمہ بھی تھا، جو ان نخلستانوں کو سیراب کیا کرتا تھا اس چشمے کا نام عکاظ تھا اور اسی [illegible] سے اس میدان کا نام بھی عکاظ ہو گیا تھا۔

حرب کا قافلہ جب مکے کی حدود سے برآمد ہوا تو شمعوں کا تیل ختم ہو چکا تھا اور شمعیں اپنی موت آپ ہی مر چکی تھیں۔ اس لئے یہ کارواں بلند آواز سے

ہدی گاتا، ہنستا اور باتیں کرتا ستاروں کی روشنی میں بڑھتا گیا۔ تمام رات چلنے کے بعد پو پھٹنے کے قریب پہلا پڑاؤ ڈالا گیا۔ حسن اتفاق سے اُن کی ملاقات قریش کے ایک اور قافلے سے ہو گئی جو اُن سے پہلے صبح ہوتے ہی مکہ سے نکل پڑا تھا۔

یہ ملاقات بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ حرب اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار قافلے کے آگے آگے جا رہا تھا کہ عقب سے ایک بھر بھری چٹانوں کے درمیان گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی میں سے آواز سنائی دی۔

"کون ہو تم؟"

اور حرب نے اپنی کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم کون ہو جو ہمارا پتہ پوچھتے ہو؟" اور اس کے ساتھ ہی حرب کے ساتھیوں کی تلواریں میانوں سے نکل کر غروب ہوتے ہوئے ستاروں کی اونگھتی سی روشنی میں چمک گئیں۔

"سردار حرب ـــــ! میں نے آپ کی آواز پہچان لی" اور بھر بھری چٹانوں کی تاریکیوں میں سے ایک انسانی جسم سائے کی طرح آگے بڑھا۔

"میں سردار خویلد بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی کا غلام ہوں۔ اور اپنے آقا سردار خویلد بن اسد کے حکم سے اس جگہ مامور ہوں تاکہ کوئی دشمن آقا کو غفلت میں پا کر انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

سردار حرب دل ہی دل میں مسکرایا۔ اتنی چھوٹی سی بات کہنے کے لئے اس غلام نے کتنی لمبی کہانی چھیڑ دی تھی۔ شاہی غلاموں کی یہ عجیب عادت حرب

نے کئی دفعہ محسوس کی تھی۔ چھوٹی سی بات کہنے کے لیے یہ لوگ الفاظ کے پیچ
پیچ میں گم ہو جاتے تھے اور پھر لطف یہ تھا کہ گفتگو کہاں سے شروع ہوئی تھی
یہ بھول جاتے تھے۔ بہر حال اُس نے چند لمحوں کے لیے صبر کر کے اس طویل تقریر
کو سُنا اور پھر پوچھا،

"تمہارے آقا نے بھی یہیں قیام کیا ہے۔"

"سردار حرب نے بالکل ٹھیک سمجھا۔" غلام نے ادب سے سر جھکا
کر کہا ـــــ "میرے آقا و مولیٰ سردار خویلد بن اسد کا قافلہ پاس ہی ہے۔ میں ان
کو حضور کی آمد کی اطلاع دے چکا ہوں لیکن یہ اطلاع ایک دوست کی آمد
کی اطلاع نہ تھی۔ میں نے پکارا تھا،

"ہوشیار! میں ریت پر کھسکتے ہوئے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں
سُن رہا ہوں۔"

اور پھر جب دُور سے افق پر ریت کا بادل سا اٹھا تھا اس وقت
بھی میں نے پکارا تھا ـــــ

"میں گرد اٹھتی دیکھ رہا ہوں ـــــ"

"انہیں ہماری آمد کی اطلاع دو۔" حرب نے پریشان ہو کر اپنی تلوار
کے دستے سے غلام کو ٹھوکر تے ہوئے کہا۔

اور غلام گرتے گرتے سنبھلا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ منہ
کے گرد رکھ کر صاف گونجتی ہوئی آواز میں بولا،

"سردار حرب بن امیہ بن عبدالشمس بن قصی تشریف لائے ہیں خطرے

کا کوئی مقام نہیں"۔

اس کی آواز دُور دُور ریگستان میں گونج اٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نقیب کھڑے ہیں جو اس کے الفاظ کو دہراتے جا رہے تھے اور بالآخر یہ آواز دور پہاڑیوں اور درختوں میں گونج کر ڈوب گئی۔ حرب کا نہ جانے کیوں سیروں خون بڑھ گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صبح صبح جب کہ ابھی رات کی شبنم اردگرد کی ریت پر موتی کے قطروں کی طرح بکھری ہوئی تھی اور ستارے ابھی تک نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے اس کا نام و نسب ریگستانِ عرب کی کھلی فضاؤں میں گونج اٹھا تھا۔ شاید فالِ نیک سمجھا تھا حرب نے اس اعلان کو۔ اُسے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا تھا، وہ بہت بڑا آدمی ہے۔

اور پھر دُور سے ایک اور آواز سنائی دی،

"لبیک یا اخی ـــــ لبیک" اور ایک گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔

سردار حرب نے گھوڑے سوار کو آواز ہی سے پہچان لیا تھا۔ یہ سردار خویلد بن اسد تھے جو سردار حرب کی پیشوائی کے لیئے بڑھ رہے تھے۔

حرب نے گھوڑے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنے گھوڑے کو بھی ایڑ لگائی اور تھوڑی دیر کے بعد خویلد سے مل گئے۔ دونوں اس طرح بغل گیر ہوگئے جیسے مدت کے بچھڑے ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اب سے صرف چھتیس بلکہ اس سے بھی کم گھنٹے پہلے یہ دونوں صحنِ کعبہ میں موجود تھے اور خویلد دل ہی

دل میں عبدالمطلب اور حرب کی جھڑپ پر ہنس رہا تھا۔

اس پُرتپاک ملاقات کے بعد سردار خویلد نے حرب کو معہ اہل و عیال اپنے پڑاؤ میں چلنے کی دعوت دی۔ لیکن حرب نے اس دعوت کو ٹالنے کی غرض سے کہا،

"میں عکاظ کا میلہ دیکھنے کے لئے جا رہا ہوں۔ یہاں پڑاؤ کرنا ضروری ہے۔ اس لئے یہ دعوت غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہے۔"

لیکن خویلد نے اصرار کیا۔

"صبح کا کھانا میرے یہاں ہے۔ میں بھی عکاظ کے میلے ہی میں جا رہا ہوں ایک وقت کی دعوت مجھے امید ہے آپ پر بار نہ ہو گی۔"

اور حرب مان گیا۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی۔ سورج نے آنکھ بھی نہ کھولی تھی کہ جنگل کی فضا میں خیمے گاڑنے کی ٹھکا ٹھک گونج اٹھی۔ گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں اُٹھتے اور بیٹھتے ہوئے اونٹوں کی کراہوں میں مل جل کر صحرا کی خاموشیوں میں طوفان سا برپا کرنے لگیں ___ غلاموں نے لاؤ، اٹھاؤ، رکھو، دھرو کا وہ غل مچایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ان آوازوں کے پہلو بہ پہلو خویلد کے خیمے سے بھی شور اٹھا۔ عبدالشمس کے خاندان کی دعوت تھی اور دعوت کرنے والا مکے کا مشہور تاجر خویلد تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا کم تھا۔ خویلد نے اپنے مہمانوں کی عزت اس حد تک کی کہ خاص اپنی سواری کی ناقہ ذبح کروادی اور غلاموں کو حکم دیا کہ اس ناقہ کا گوشت بھون بھون کر حرب کے ساتھیوں کو کھلائیں۔

باہر تیاریوں کا شور تھا۔ اور خیموں کے اندر میزبانوں نے مہمانوں کے استقبال کی خوشی میں آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ خویلد کی بیویاں حرب کی بیویوں کا استقبال اتنے جوش اور اتنی بلند آواز میں کر رہی تھیں کہ باہر ادھر اُدھر بھاگنے والے غلاموں نے اپنی مصروفیت کے باوجود ان سب کی باتیں سن لی تھیں البتہ خدیجہ خاموش تھی۔

خدیجہؓ کی عمر تو خاصی تھوڑی تھی ـــــ ہوگی پندرہ سولہ کی ـــ لیکن بلا کی ذہین لڑکی تھی۔ اُس نے ادب کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کیا۔ رسمی باتوں کا جواب پوری سنجیدگی اور متانت سے دیا۔ حرب کے لڑکے کو مدبرانہ انداز سے پیار کیا اور پھر بڑی بوڑھیوں کو باتیں کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اُن کے کھانے دانے کو دیکھنے کے لئے چلی گئی۔ خدیجہ کے چلے جانے کے بعد حرب کی بیویوں نے خدیجہ کے بارے میں ایک دوسرے سے زیر لب باتیں کیں۔

"بڑی خوبصورت ہے۔"

"پچھلے دنوں میں نے اُسے دیکھا تھا، بالکل چھوٹی تھی۔ اب تو دیوتاؤں کی مہربانی سے بڑی جوان ہو گئی ہے۔"

"زیتون کی شاخوں کی طرح سیدھی اور خوبصورت نکلی ہے۔"

"بڑی خوش خلق اور ملنسار ہے۔ میرے سفیان کو کتنی اچھی طرح سے پوچھا ہے۔"

"اور مجھے کیسے سلیقے سے بٹھایا ہے۔"

"کتنی میٹھی باتیں کی ہیں۔"

"خویلد خوش نصیب ہے کہ اُسے ایسی لڑکی ملی۔"

اور ہزاروں اس قسم کی باتیں جو ہونٹوں سے نکلیں اور مشتاق کانوں میں ڈوب گئیں۔

باہر مردانے میں خویلد حرب سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ نے تو عکاظ میں آنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔"

"جی ہاں۔۔۔" حرب نے نہ جانے کیوں انگوروں کے خوشے سے کھیلنا ضروری سمجھا۔۔۔ "میں تو آخر وقت تک تیار نہیں ہوا تھا۔ ابوسفیان کا بہت جی چاہ رہا تھا۔ کہتا تھا ثابت بن جابر کی دوڑ دیکھنا ہے۔ میں نے انکار کر کے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ بلا کا تیز دوڑتا ہے۔ صاحب یہ ثابت بن جابر کم بخت بجلی ہے بجلی۔۔۔ یہ انگور نوش فرمائیے۔"

"شکریہ۔۔۔ اور شعر بھی کیا کہتا ہے۔"

"جی ہاں خوب کہتا ہے۔۔۔ بڑا حاضر دماغ آدمی ہے۔"

"حاضر دماغی میں تو اس کا جواب نہیں۔ وہ قبیلہ لیہان والوں کے ساتھ جو قصہ ہو گیا تھا، وہ تو آپ نے سنا ہو گا۔"

"لیہان والوں کے ساتھ۔" خویلد نے داڑھی میں انگلی پھیر کر سوچتے ہوئے کہا۔ "لیہان والوں کے ساتھ تو شاید ثابت کی پرانی دشمنی چلی آتی ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔ بڑی خطرناک دشمنی ہے اور اسی دشمنی کی وجہ سے تو وہ

قضیہ ہو گیا تھا:

"اچھا ـــــ" خویلد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "عجیب بات ہے مجھے اُس واقعہ کا علم ہی نہیں"

"یہ تو بڑا مشہور واقعہ ہے اور ثابت نے اس پر ایک زبردست نظم بھی کہی ہے"

"اتفاق کی بات ہے ـــــ میرے کان اس قصّے سے نا آشنا ہیں"

"واقعہ یہ ہوا تھا" حرب اپنے آپ کو خویلد سے افضل سمجھنے لگا تھا صرف اس لئے کہ اسے اس قصّہ کا پتہ ہے اور خویلد کو نہیں۔ اس لئے اس نے بڑی تمکنت کے ساتھ کہنا شروع کیا "واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن یہ ثابت صاحب شہد اکٹھا کرنے کی غرض سے ایک کھائی میں اتر پڑے۔ آپ جانئے غریب سا قبیلہ ہے ایسی ہی چیزوں پر گزر بسر ہوتی ہے ان لوگوں کی۔ اُن کے قبیلہ کے چند آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ثابت نے ان لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ تم ذرا چوکنے رہنا۔ شاید لیہان والوں میں سے کوئی ٹپک پڑے۔ بڑبولے تو ہوتے ہی ہیں یہ لوگ۔ سینہ ٹھونک کر کہہ دیا، ارے تم فکر مت کرو۔ ثابت ایک رسی کی مدد سے کھائی میں اتر پڑا۔ اُدھر لیہان والے بھی تاک میں تھے۔ انہوں نے موقع سمجھا غنیمت اور صاحب ہُبل آپ کا بھلا کرے تلواریں سونت کر آ گئے۔ لیہان والوں کو آتا دیکھا کہ ثابت کے ساتھی دُم دبا کر بھاگ گئے۔ اب لیہان والے تو سمجھتے تھے کہ ثابت ان کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے رسی ہلا کر کہا،

"ثابت یا تو ہتھیار ڈال دو اور ہار مان لو ورنہ مار دیئے جاؤ گے"
ثابت تھا حاضر دماغ، اُسے جھٹ سوجھ گئی ترکیب۔ اس نے
کیا کیا کہ چٹان پر شہد انڈیل دی۔ اس پر سینہ رکھ کر نیچے کو پھسلنا شروع کر دیا
اور اس طرح شہد پر پھسلتا پھسلتا ایک خراش یا زخم کھائے بغیر زمین پر آگیا۔
زمین پر پہنچنا تھا کہ پھر اسے کون پا سکتا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بھاگا اور
صحیح سلامت اپنے خیموں میں آگیا۔
"بھئی بہت خوب ــــ بہت اچھے۔" خویلد نے کہا، "کمال کر دیا
صاحب۔"
"اتنا حاضر دماغ آدمی ہے وہ۔"
خویلد پھر اس کی تعریف کیا چاہتے تھے کہ خیمے کا پردہ اٹھا اور
ایک متین صورت نوجوان ظاہر ہوا۔
"ورقہ ــــ" خویلد نے کہا، "تم صبح سے کہاں تھے؟"
اور پھر حرب سے مخاطب ہو کر بولے،
"آپ انہیں جانتے ہوں گے۔ یہ میرے بھائی نوفل کے فرزند ورقہ ہیں۔"
"نام تو کئی دفعہ سنا ہے لیکن ملاقات کا شرف نہیں ہوا ــــ میں ہوں
حرب بن امیہ بن عبدالشمس۔"
دونوں بغلگیر ہو گئے۔
"ان حضرت کو دین دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں۔" خویلد نے ورقہ کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا، "کعبہ میں نہیں جاتے۔ کہتے ہیں مجھے تکلیف ہوتی ہے جب

میں دیکھتا ہوں کہ انسان پتھروں کے سامنے سر جھکا رہا ہے۔"

حرب نے جلدی سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا،

"مجھے اس گفتگو سے معاف کیجئے۔ کعبہ کے دیوتاؤں کے متعلق ایسی باتیں میں نہیں سن سکتا۔"

"لیکن یہ تو عجیب و غریب باتیں سناتا ہے۔"

"جی ہاں اپنے اپنے خیالات ہوتے ہیں میرا تو ایمان ہے کہ کعبہ میں رکھے ہوئے دیوتا تو رہے ایک طرف عرب کے کسی بھی دیوتا کے بارے میں کوئی بے دینی یا گستاخی کی بات ہو جائے تو آدمی کو بھوت چمٹ جاتے ہیں ۔۔۔!"

ورقہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا دیئے اور فرمایا،

"انسانی ذہن جب ذلتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے تو ایسے اوہام خودبخود پیدا ہو جایا کرتے ہیں ورنہ سب سے پہلے عربوں کے جدِ اکبر حضرت ابراہیمؑ کو بھوت، چھلاوے اور جن پریشان کرتے۔"

"یہ کمال بات کرتے ہو بھتیجے ۔۔۔! ارے بھائی اُن دنوں میں دیوتا تھے ہی کب۔ ان سب نے تو جدِ اعلیٰ کے بعد ہی عرب کی سرزمین میں قدم رکھا ہے۔"

"رکھا نہیں ۔۔۔ لائے گئے تھے بڑے بھائی" ورقہ نے کہا "جدِ اعلیٰ کے دین کو ان کی تشریف آوری نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔"

"بھئی تمہاری یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر ہُبل یا لات یا عزیٰ

یا کسی اور دیوتا کے سامنے عبودیت کا اقرار کر لینے سے دین ابراہیمی میں کونسا رخنہ پڑ جاتا ہے ـــــ بھتیجے ہم تو یہ نہ سمجھ سکے ؛

"یہ عرب کے دیوتا نہیں چچا حضور ـــــ! ان بتوں کو باہر سے لا کر عربوں کے سر خواہ مخواہ منڈھ دیا گیا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ عمرو بن لحی کسی کام کی غرض سے شام کو گیا تھا۔ وہاں کے باشندے عمالیق کہلاتے تھے۔ وہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ عمرو نے دیکھا تو سخت حیران ہوا۔ اس نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم یہ گھڑے، ادھ گھڑے اور اَن گھڑے پتھروں کو کیوں پوجتے ہو وہ تو جاہل تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ پتھر کا رتبہ انسان کے رتبہ سے بہت کم ہے۔ انہوں نے ایک ڈھونگ سا بنا رکھا تھا۔ عمرو سے بھی کہہ دیا کہ جب بارش نہیں ہوتی، یا قحط پڑتا ہے یا کوئی بیماری آتی ہے یا مصیبت میں گھر جاتے ہیں تو ہم ان بتوں سے دعا مانگتے ہیں اور یہ دیوتا ہماری التجاؤں کو سن کر ان تمام مصائب کو ٹال دیتے ہیں۔ عمرو تو پہلے ہی سے کمزور ایمان کا تھا۔ جھٹ سے اس ڈھونگ کا قائل ہو گیا اور اُن سے ایک دیوتا ادھار مانگ لایا۔ وہ دیوتا کعبہ میں لا کر نصب کر دیا گیا۔ اس کا نام ہبل ہے۔ اُس کا ہم عربوں کے ساتھ کیا تعلق ہے۔"

"تو گویا تم ان دیوتاؤں کے اس لئے خلاف ہو کہ یہ عربی نہیں بلکہ غیر عربی ہیں ـــــ!"

"صرف یہی نہیں بلکہ ان کے سامنے سر جھکانا ہماری شان کے خلاف ہے چچا جان۔ یہ تو عمالقہ کی جہالت کی نشانی تھی۔ انہوں نے مدت ہوئی اسے چھوڑ

دیا اور ہم لوگ ان کی جہالت کی اس یادگار کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ عرب جیسی ذکی الفہم اور تیز دماغ قوم کے لئے یہ باعث بدنامی ہے۔ یہ ہماری توہین ہے۔" ورقہ بن نوفل جوش میں آگئے تھے۔

"میاں صاحبزادے!" حرب نے تلملا کر کہا، "ہمارے بزرگ اور بڑے بوڑھے کم از کم اتنے عقلمند ضرور تھے کہ انہیں تمہاری عقل و دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے جو بھی کچھ کیا ہوگا خوب سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔ اسی میں ہماری فلاح ہے تم یہ باتیں کہہ کر صرف دیوتاؤں ہی کی نہیں بلکہ ہمارے ان بزرگوں کی توہین کرتے ہو جن کا خون ہماری رگوں میں چل رہا ہے اور میاں ہم گو بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن اپنے بزرگوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتے ——— کیوں سردار خویلد؟"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ لیکن صرف یہی نہیں۔ آج کل کے نوجوانوں کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ مذہب پر بھی نکتہ چینی کرنے سے نہیں گھبراتے یہ لوگ۔ کبھی سچی بات ہے ہمارے تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔"

"آپ کی مرضی ہے ——— میں تو جو محسوس کرتا ہوں وہ میں نے عرض کر دیا ہے۔"

"عرض سوچ سمجھ کر کیا کرتے ہیں میاں برخوردار ———" حرب نے کہا، "ہمیں تمہاری نیت پر شبہ نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اتنا کہنے کا مجھے ضرور حق پہنچتا ہے کہ مذہب بڑا نازک مسئلہ ہے۔ اس کو سمجھ جانا اور اس کی پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھا لینا ہمارا تمہارا کام نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ بزرگوں نے کیا ہے بس وہی

کئے جاؤ۔ اس میں نقصان کا کم از کم خطرہ نہیں ہے۔"

"سُن لو بھتیجے ——— سردار حرب بھی وہی فرما رہے ہیں جو میں تمہیں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں۔"

حرب کی تعریف ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک قدم اور بڑھایا۔

"ایسی باتوں پر تلواریں چل جایا کرتی ہیں۔ عوام میں ایسی بات کبھی نہ کہنا مجھے تو تمہاری زندگی کا خطرہ ہے۔"

غلام نے آکر بصد ادب کہا،

"کھانا تیار ہے آقائے نامدار۔"

"دستر خوان بچھاؤ ——— !"

ورقہ کی بات آئی گئی ہو گئی۔ جیسے کبھی ہوئی ہی نہ تھی۔ دستر خوان بچھایا گیا اور مہمان ایک ہی جگہ بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے دوران میں میلے میں پیش آنے والی ہزاروں قسم کی باتوں پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ گزشتہ میلوں کا ذکر چلا اور آخر کھانا ختم ہو گیا۔ حرب نے اپنے میزبان سے اجازت چاہی اور آرام کرنے کی غرض سے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ ارادہ تھا کہ سورج کے غروب ہوتے ہی سفر شروع کر دیا جائے گا۔

ابھی سورج کے غروب ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ اور حرب بن امیّہ کے خیموں میں ابھی مکمل سکوت تھا۔ رات کے سفر اور تکان نے سب کو نڈھال کر دیا تھا۔ اس پر خویلد کے خیمے پاس تھے اس لئے کسی طرف سے خطرے کا کوئی

امکان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حرب بن امیہ کا قافلہ خوب پاؤں پھیلا کر سویا تھا بچے اور عورتیں اپنی اپنی جگہ اوندھے سیدھے پڑے تھے اور حرب اپنے خیمے میں ریشمی تکئے کو باہوں میں دبائے دھیمے دھیمے خراٹے لے رہا تھا۔

لیکن اس کی آنکھیں یکایک کھل گئیں۔ گو حرب صحرائی زندگی بسر نہیں کر رہا تھا۔ اور شہر کی خوش حالیوں اور بے فکریوں میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے وہ خاصا بے پرواہ ہو چکا تھا لیکن اس کی نیند میں ایک بہت بڑی صفت تھی۔ اس کی نیند ہرن کی سی نیند تھی، جو ذرا سی آہٹ پر کھل جاتی تھی۔ حرب کی آنکھیں چونک کر کھل گیئں۔ اس نے لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اس آواز پر توجہ دی۔ اور چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اونٹوں کے بٹھانے، خچروں کے موڑنے، غلاموں کے بھاگنے اور اس تمام گڑبڑ میں خویلد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جو کسی کا استقبال کر رہا تھا حرب نے غور سے سننے کی کوشش کی لیکن نوآمد کا نام شاید پہلے لیا جا چکا تھا حرب دیر سے اٹھا تھا لیکن اس کے باوجود حرب کا دل دھک سے رہ گیا۔

عبدالمطلب ــــ؟ شاید وہی؟ اگر وہ ہوئے تو؟

تو کیا؟ ــــ حرب نے سر جھٹک کر اپنے خیال کا آپ ہی مذاق اڑایا ــــ عبدالمطلب اگر آ بھی جائیں تو کیا ــــ اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ آخر میلے پر حرب کا اجارہ تو نہیں، یہ تو عام جگہ ہے۔ جس کا جی چاہے آئے ــــ!

اس نے گلا صاف کیا اور غلام کو آواز دی،

"کوئی نیا قافلہ آیا ہے کیا؟"

"جی آقا ـــــ" غلام خود بھی ابھی سو کر اٹھا تھا۔ نیند ابھی تک اس کے گلے میں خرخرا رہی تھی۔

"کون ہیں یہ لوگ؟"

"عدی کی اولاد عکاظ کا میلہ دیکھنے جا رہی ہے آقا۔"

"اولادِ عدی؟"

"جی آقائے محترم ـــــ فضیل بن عبد العزیٰ اپنے بیٹے، پوتوں اور بھتیجوں کے ساتھ آیا ہے۔"

"اور سردار خویلد نے اُسے اپنے خیموں میں دعوت دی ہے؟"

"بجا فرمایا حضور نے۔"

"سفر کی تیاری کرو ـــــ ہم فوراً سفر کریں گے۔" حرب نے غلام کے حیران کانوں میں یہ فوری حکم جلتے ہوئے سیسے کی طرح انڈیل دیا۔

"ابھی ہو گی سفر کی تیاری۔"

"فوراً ـــــ اتنا غبی ہے تُو ـــــ جاؤ اور خیمے میں اعلان کر دو، ابن امیہ اس جگہ پر ایک لمحے کے لئے نہیں ٹھہر سکتے۔"

"آقا ـــــ!" غلام جھک کر آداب بجا لایا اور واپس چلا گیا۔

حرب پھرتی سے بستر میں سے نکلا اور کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ باہر غلام دوسرے غلاموں اور قافلے والوں کو جگا رہا تھا اور حرب کا حکم سنا رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد خیمے کے پردے اٹھے اور خویلد داخل ہوا۔

"یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔"

"سردار خویلد، امیہ کی اولاد اسے بے عزتی تصور کرتی ہے۔"

"لیکن بات کیا ہے۔"

"مجھے اپنے غلام سے معلوم ہوا ہے کہ اولادِ عدی کے خیمے ابنائِ عبدالشمس کے خیموں کے پہلو میں گڑ رہے جا رہے ہیں۔"

"آپ کے غلام نے غلط اطلاع نہیں دی لیکن مجھے اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ آخر نفیل ہمارا کوئی غیر نہیں ہے۔ ہماری رگوں میں دوڑنے والا خون وہی ہے جو اُس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ نفیل بن عبدالعزیٰ زباح کا پوتا ہے جو عبداللہ بن قرۃ بن زراح ابن عدی بن کعب بن لوئی بن فہر بن مالک کا بیٹا تھا ـــــ اس حساب سے آپ کا نسب ـــــ"

"نویں پشت سے مل جاتا ہے ـــــ آپ کو یہ معلوم کر کے شاید حیرت نہ ہو گی کہ اپنے نسب نامے کو میں خوب جانتا ہوں۔" حرب نے بات کاٹ کر کہا۔

"میرا مطلب تھا آپ ایک ہی دادا کے پوتے ہیں۔"

"جی ہاں ـــــ لیکن سردار خویلد ہمارے نسب نامے کا اتنا صحیح علم رکھتے ہوئے بھی شاید آپ نہیں جانتے کہ دشمنی میں پہل عدی کی اولاد نے کی تھی۔ کلاب کی اولاد نے نہیں۔ اور پھر بہت ممکن تھا کہ عدی کی اولاد اُن پرانے زخموں کو بھول جاتی کہ خود نفیل نے میری عزت پر حملہ کر دیا۔ میں نے عبدالمطلب پر تفوق کا دعویٰ کیا تھا۔ بے بنیاد دعویٰ نہیں تھا یہ سردار خویلد۔ آپ جانتے

ہیں۔ آپ زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کریں یا نہ کریں لیکن میں جانتا ہوں
اور آپ بھی ضرور اپنے دل میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوں گے کہ میں
ہر لحاظ سے عبدالمطلب سے افضل ہوں۔ لیکن بُرے دنوں کی بات ہوتی ہے
کہ ہم نے حکم اس نفیل ابن عبدالعزیٰ کو بنا لیا۔ شومئ تقدیر مجھے کیا معلوم تھا کہ نفیل
پُرانی عداوت کا بدلہ اس طرح سے لے گا۔ مجھے وہ دن نہیں بھولے گا سردار خویلد
—— آپ بھی وہاں موجود تھے۔ مجھے یاد ہے جب اس نفیل ابن عبدالعزیٰ نے
بڑے طمطراق سے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اس کے الفاظ ابھی تک میرے ذہن
میں انگاروں کی طرح جل رہے ہیں۔"

"بھول جائیے ان الفاظ کو۔"

"سردار خویلد! یہ الفاظ بھولنے کے لائق نہیں —— اور میں انہیں
بھول نہیں سکتا۔"

"آپ کا کہنا بجا ہے۔" خویلد نے کہا۔ "لیکن اگر آپ اس طرح تشریف
لے گئے تو یہ نفیل بن عبدالعزیٰ کی بے عزتی نہیں، میری توہین ہو گی اور مجھے امید
ہے آپ میری توہین نہیں کریں گے۔"

"مجھے آپ کی عزت کا پورا احترام ہے سردار خویلد اور میں اپنے قریبی
رشتہ دار کو اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتا۔ لیکن میں آپ کا مہمان نہیں ہوں۔ عکاظ کی طرف
جس طرح آپ تشریف لے جا رہے ہیں، اسی طرح میں مسافر ہوں۔ اس میں آپ
کی توہین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

"لیکن اس سرزمین میں خیمے گاڑنے کا موقع مجھے پہلے ملا تھا۔ اس لحاظ

سے میں آپ کو اپنا مہمان سمجھتا ہوں ـــــ مجھے امید ہے آپ میرے اس خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں فرمائیں گے۔"

حرب نے چند لمحوں کے لئے سوچا پھر بولا،

"آپ کی خاطر سے میں یہ ذلّت کسی نہ کسی طرح سے سہ گزروں گا ورنہ آپ جانتے ہیں کہ عبد الشمس کے خاندان نے اپنے دشمنوں کے خاندان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ بنو سہم کے دامن میں پناہ لیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے خوف کی وجہ سے اپنے وہ تمام مکان بنو سہم کے ہاتھوں بیچ دیئے ہیں جو مقام صفا میں تھے۔"

"لیکن صفا اور مروہ کے درمیان تو ابھی تک مکانات ہیں اُن کے۔"

"جی ہاں چند ـــــ! جائیداد تو یہ لوگ بیچ چکے۔"

"بہر حال آپ کم از کم اس سفر کے دوران میں ـــــ میری خاطر سے ـــــ اپنی پُرانی اور تازہ دشمنیوں کو بھول جائیے۔"

"آپ بھی قریش میں سے ہیں سردار خویلد اور آپ میری طرح ضرور سمجھتے ہوں گے کہ دشمنی اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک کہ دشمنی کی وجہ ختم نہ ہو جائے۔ دشمنی کی وجہ ختم نہیں ہوئی سردار خویلد ـــــ دشمنی کو بھول جانا میرے اختیار میں نہیں ہے ـــــ البتہ ہم سفر اکٹھا کریں گے۔ یہ آپ کی خاطر منظور کئے لیتا ہوں۔"

"شکریہ ـــــ میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔"

"میرے غلام کو اندر بھیجنے کی تکلیف فرمائیے گا ـــــ شکریہ!"

خویلد چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد غلام اندر آ گیا۔

"ہمارا قافلہ سردار خویلد کے ساتھ سفر کرے گا ——— تیاری ملتوی کر دو۔"

بنو قریش کی یہ تینوں شاخیں تاروں کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے ریت کے ذروں کو روندتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ اب قافلہ کافی طویل ہو گیا تھا اور ہتھیار بند مردوں کی تعداد سو سے بھی کچھ اوپر ہو گئی تھی۔ اس لئے قافلے کے ہر شخص میں خود اعتمادی اور بے خوفی زیادہ ہو گئی تھی۔ بالخصوص عورتیں اب اپنے آپ کو ہر طرح سے محفوظ سمجھ رہی تھیں اور محملوں کے پردے اٹھائے رات کی نم آلود ٹھنڈی ہواؤں کا لطف لے رہی تھیں۔

خدیجہ اپنی ماں کے ساتھ ایک محمل میں تھی۔ ساتھ کی ناقہ پر حرب کی بیوی سوار تھی ——— حرب کی بیوی کو خدیجہ کے ساتھ ایک عجیب طرح کا انس ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ ہر ممکن طریقے سے خدیجہ کے قریب تر رہنے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کوشش کئے جا رہی تھی کہ خدیجہ کو اس کے دل کی اس حالت کا پتہ نہ چلے۔

اس طرح قریب رہنے کے لئے کوئی بہانہ بھی تو چاہئے تھا۔ آخر اپنے کنبے کی عورتوں سے چھٹ کر دوسرے کے کنبے کی عورتوں کے ساتھ مل کر سفر کرنا کوئی ایسی ہی غیر اہم بات نہ تھی جسے محض نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس لئے حرب کی بیوی طرح طرح کے بہانے ڈھونڈ کر خدیجہ کے ساتھ بات چیت

شروع کر دیتی۔ بہانہ کافی بھدا اور پھسپھسا ہوتا تھا اور پھر زیادہ سے زیادہ خدیجہ کے قریب رہنے کے لئے اس پھسپھسی بات کو خواہ مخواہ طول دیا جا رہا تھا جس کی وجہ سے گفتگو انتہا درجے کی اکتا دینے والی اور بے معنی سی ہو گئی تھی۔ خدیجہ کم از کم یہی محسوس کر رہی تھی اور بہت ممکن ہے حرب کی بیوی بھی یہی سمجھتی ہو لیکن وہ شعوری طور پر اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی اور خدیجہ محض اس ادھیڑ عمر عورت کی خاطر ہوں ہاں کئے جا رہی تھی۔

کجاوے کے ہلکوروں نے شبنم پلی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ مل کر خدیجہ کے پپوٹوں کو بھاری کر دیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ماں کے زانو پر سر رکھ کر سو جائے لیکن یہ عورت بلا کی باتونی تھی۔ بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس لئے انگڑائیاں جمایاں لینے کے باوجود خدیجہ سو نہ سکی۔

خدیجہ اور اس کی ماں کے اونٹوں کے پاس ہی گھرانے کی دوسری عورتوں کے اونٹ تھے۔ جن کے پاس کنبے کے نوجوان گھوڑوں پر سوار چوکنے جمے بیٹھے تھے۔ آگے حلیفوں اور دوستوں کی مستورات اور ان کے قریب ان قبائل کے نوجوان تھے۔ غلام اور باندیاں بھی خچروں اور گدھوں پر سوار تھیں۔ قافلے سے آگے آگے حرب بن امیہ، خویلد اور نفیل بن عبدالعزیٰ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار تھے۔

حرب کا سیاہ گھوڑا کچھ تو یونہی بے چین تھا اور کچھ حرب اپنی ایڑ کی مدد سے اُسے چھیڑتا آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان دونوں سے چند اِنچ آگے رہنا چاہتا تھا تاکہ تفوق اور برتری کی خواہش تسکین پاتی رہے۔ نفیل بن عبدالعزیٰ

کے دل میں اس قسم کا کوئی خیال نہ تھا۔ لیکن اس کے سفید گھوڑے نے جیسے حرب بن امیہ کے گھوڑے سے شرط بد لی تھی۔ حرب کی ایڑ گھوڑے کو دو ایک قدم بڑھنے پر مجبور کرتی اور نفیل کا گھوڑا خود بخود بڑھ کر اس کے پہلو میں چلا جاتا۔ خویلد محض ان دونوں کا ساتھ دینے کی غرض سے تیز چلانے پر مجبور تھا۔

اس طرح آدھی رات کے قریب یکایک خویلد کو خیال آگیا۔ حدی خوانوں کی آواز اُسے بہت دور پیچھے سے سنائی دی۔ اور اُس نے یونہی اچٹتی نگاہ سے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ قافلے سے ایک فرسنگ کے قریب آگے نکل آئے ہیں۔ اُس نے ہنس کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا،

"سردارانِ قریش بہت تیز آرہے ہیں۔ قافلہ بہت پیچھے رہ گیا ہے"

نفیل بن عبدالعزیٰ نے پریشانی کے عالم میں مڑ کر دیکھا۔

"اُف بہت دور نکل آئے ہم لوگ۔"

اور مزید کچھ کہے بغیر اُس نے گھوڑے کو گھما کر قافلے کی طرف باگیں اٹھا دیں۔ خویلد نے حرب کو دیکھا اور حرب نے مسکرا کر کہا،

"میرے چچا کے بیٹے کو اپنے قافلے کا بہت خیال ہے۔"

"ان کے بیٹے خطاب کی بڑی امید سے ہے۔ اُس کے متعلق بہت متوحش ہیں۔" خویلد نے جواب دیا۔

"ایسی حالت میں گھر سے نکلنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔"

"عجیب سی بات ہے۔ نفیل جیسا عقلمند انسان بھی بعض اوقات عجیب عزیب قسم کے توہمات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

"توہمات؟"

"جی ہاں ــــ کسی کاہنہ نے جو یمن میں کہیں رہتی ہے انہیں بتا دیا ہے کہ اُن کے بیٹے خطاب کے گھر ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔"

"تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔ لوگوں کے یہاں لڑکے پیدا نہیں ہوتے؟" حرب نے ہنس کر کہا۔

"عجیب بات یہ ہے کہ یہ لڑکا بڑے جاہ و جلال والا ہوگا۔ کاہنہ نے پیشین گوئی کی ہے کہ یہ لڑکا کسی زمانے میں عرب کا بادشاہ بن جائے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ روم اور ایران کے بادشاہ اس لڑکے کے رعب اور دبدبے سے تھرآیا کریں گے۔"

اردگرد کی فضا حرب کے قہقہے سے گونج اٹھی۔

"وہ کاہنہ یقیناً مخبوط الحواس ہو گی چھوٹے بھائی۔" اُس نے ہنستے ہنستے کہا۔ "اگر اُسے کچھ بھی پتہ ہوتا تو وہ یقیناً ایسی بیہودہ پیش گوئی نہ کرتی۔ نفیل بن عبدالعزیٰ کا پوتا اور عرب کا بادشاہ۔ یہ تو لطیفہ سا سنائی پڑتا ہے۔"

"کیوں ــــ نفیل کا خاندان معمولی خاندان تو نہیں۔ بڑے بڑے نام آور آدمی پیدا ہوئے ہیں اس خاندان میں۔"

"ہاں نام آور ضرور ہوئے لیکن زندگی کے کس شعبے میں نام پیدا کیا ہے، اُن لوگوں نے یہ بھی تو سوچیے۔ لوگوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے باپ دادا کے

کا نام یاد کر لینا اور کسی جھگڑے کا فیصلہ چکا دینا کوئی اہم کام تو نہیں ہے جس کی وجہ سے کوئی عرب کا بادشاہ بن جائے گا۔ اور روم و ایران کے شہنشاہ اس کے نام سے تھرانے لگیں گے۔"

"نساب ہونا بھی معمولی بات نہیں بڑے بھائی۔" خویلد نے کہا "نفیل کا خاندان نسب دانی کے فن میں اپنی نظیر آپ ہے اور پھر فیصلے کرنا اور لوگوں کے جھگڑے چکانا بھی معمولی بات نہیں۔"

"مجھے انکار نہیں لیکن بادشاہ بنتے ہیں تلوار کے زور سے ۔۔۔ نہ کہ شجرۂ نسب یاد کرنے کے بعد فیصلے سنانے سے۔ اور تلوار کا دھنی عدی کی اولاد میں سے نہ کوئی آج تک ہوا ہے نہ ہوگا۔"

"یہ تو محض دعوے ہے برادر۔" خویلد نے چڑ کر کہا "ورنہ زراح، عبداللہ اور قرۃ تلوار کے معاملے میں کسی سے کم نہ تھے اور نفیل بھی صرف نسب دان اور حکم ہی نہیں ہے بلکہ تلوار بھی اس کی زبان سے کم تیز نہیں چلتی۔ اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بنی بتائی سلطنت مل جائے۔ جس پر ایک حکم کے سوا اور کوئی حاکم نہیں بن سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب بھر کے شمشیر زن اس کے گرد جمع ہو جائیں۔"

"خیال ہے آپ کا ۔۔۔ اور صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ آپ نے عربوں کو نہیں سمجھا۔"

"دیوتاؤں کو کیا کچھ منظور ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ اللہ کے بھیدوں کو پا لینا معمولی بات نہیں ابن عم۔"

"دیکھنے والے اونٹنی کے بچے کی چال سے اس کا حسب نسب جان جاتے ہیں برادر۔ چشم بینا چاہیئے۔"

"یمن کی کاہنہ ایسے ہی دیکھنے والوں میں سے ایک ہے، اُس کی نگاہیں بہت کم دھوکا کھاتی ہیں۔"

یہ دونوں میدان میں کھڑے یہ سب باتیں کر رہے تھے۔ یہ باتیں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ قافلہ ان کے ساتھ آ ملا۔ خویلد نے پوچھا:

"یا ابن عبدالعزیٰ ——— خیریت تو ہے۔"

"جی ہاں ——— دیوتاؤں کا احسان ہے۔"

"خطاب کہاں ہے؟"

"اپنی بیوی کی ناقہ کے پہلو میں۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"جی نہیں ——— سب ٹھیک ہے۔"

حرب زیر لب مسکرایا اور پھر ان دونوں سے سبقت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح رات کا کارواں ان کی منزلوں تک پہنچ گیا۔ نجم السحر نے تھکے ہارے مسافروں کو پڑاؤ کرنے کا پیغام دیا اور اس سے پہلے کہ صبح صادق کی تاریکیاں اُبھرنے والے سورج کی سرخیوں سے ہمکنار ہوں غلاموں کے تھکے ماندے ہاتھوں نے خیمے گاڑ دیئے ——— اور کھانے کی تیاریاں پورے زور شور سے شروع ہو گئیں۔

مسافروں نے ہاتھ پیر دھوئے۔ بستر لگائے اور کھانے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ سورج نکل چکا تھا ـــــ کافی بلند ہوگیا تھا سورج، اور رات بھر راستہ طے کرنے والے نیند کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کو غلاموں پر اس لئے غصہ آ رہا تھا کہ کھانا کیوں ابھی تک تیار نہیں ہوا اور غلاموں کو ایک دوسرے پر غصہ آ رہا تھا کہ ان کے آقا اگر آقا بنے تھے تو کھانے سے بے نیاز کیوں نہیں بنے۔ ایک انسان کے گوشت پوست اور دماغ و روح کا مالک ہونا ہی کیا کافی نہیں تھا؟

ریت پر پڑی ہوئی شبنم سوکھ چلی تھی اور ابھی تک دسترخوان نہیں چنے گئے تھے ـــــ

یکایک پہرہ دار پکار اٹھے،

"ہوشیار خبردار ـــــ مغرب کی طرف سے گرد کا بادل اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔"

اور کھانا پکانے والے بھول گئے کہ اُن کا پہلا اور آخری فرض کھانا پکانا ہے۔ کھانے والے یہ بھول گئے کہ اب اُن کا کام صرف کھانا کھا کر بستروں میں سو جانا ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہو کر پہرہ دار کی آواز پر متوجہ ہو گئے۔

چند لمحے خاموش اضطراب میں گزر گئے اور پھر دفعۃً تیر کی طرح سنسناتی ہوئی آواز قلب و جگر کے پار ہو گئی،

"ہوشیار ـــــ خبردار ـــــ کچھ گھوڑ سوار دکھائی دے رہے ہیں جو اپنے نیزوں کو گھوڑوں کی کنوتیوں کے درمیان رکھے آندھی کی سی تیزی کے ساتھ

ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔"

اس آواز میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ قافلے کا ہر شخص ایک نکتے پر سمٹ آیا۔ نفیل بن عبدالعزیٰ جو چند لمحے قبل حرب کا دشمن تھا گھوڑا بھگا کر حرب کے قریب آگیا اور بولا،

"اگر ایسا موقع آگیا کہ ہمیں لڑنا پڑے تو میں اور میرے ساتھی آپ کے ماتحت ہو کر لڑیں گے۔ میدان جنگ میں امیّہ کی اولاد قریش کی سرلشکر ہوا کرتی ہے۔ آپ کا عہدہ یہاں بھی قائم رہے گا۔"

"باتوں کا وقت نہیں ہے عبدالعزیٰ۔ عورتوں کو اپنے گھیرے میں لے لو اور تم اپنے آدمیوں کی سیادت کرو۔ سردار خویلد بائیں ہاتھ پر ہوں گے اور تم دائیں پر ــــــ ہوشیار میں ٹاپوں کی آواز سن رہا ہوں۔"

ابھی چند لمحے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ درختوں کے جھنڈ کے عقب سے ہو ہو کی آواز سنائی دینے لگی۔ سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جنگل ہل رہا تھا۔ اتنے میں کہ قریش کے آدمی سنبھلیں ڈاکو اُن کے سروں پر تھے۔

قریش کے آدمیوں نے نیزے تان لئے اور حرب نے ڈپٹ کر کہا،

"خبردار آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرنا۔ یہ قبیلہ قریش ہے اور میں حرب بن امیّہ بن عبدالشمس بن قصیؑ اس کا سردار ہوں۔ تم میں سے جو بھی آگے بڑھے گا موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔"

لیکن سردار حرب کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ ڈاکو اسی طرح ہو ہو کرتے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بڑھتے آئے اور چند ہی لمحوں میں کئی زخمی

ریت پر تڑپتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ لینا، پکڑنا کا ہنگامہ بلند ہوا تو ڈیرہ ہل چلیں۔ نیزوں نے خون سے وضو کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے خورد و نوش کا سامان غائب ہو گیا۔ ڈاکو جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر چلے گئے۔ قریشیوں میں سے کچھ زخمی ہوئے۔ حرب کے ماتھے پر تلوار کا ایک اوچھا سا زخم آیا تھا جس پر اس نے ریت لگا لی تھی۔

جب ڈاکو چلے گئے تو سب لوگ ایک جگہ جمع ہوئے۔ سہمی ہوئی عورتیں اور جوش میں آئے ہوئے بچے محفوظ رہے تھے۔ ایک غلام بری طرح زخمی ہوا تھا۔ یہ خویلد کا غلام تھا اور مطبخ کی تمام تر ذمہ داری اسی پر تھی۔

خویلد نے جھک کر غلام کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے خیمے میں لے آیا۔ حرب اور نفیل نے مل کر اس کے زخموں کو دھو کر صاف کیا اور اونٹ کے بال جلا کر زخموں میں بھر دیئے لیکن گردن کے زخم سے خون رستا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے غلام کی پتلیاں پھر گئیں۔ اس نے مرتے مرتے خویلد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا،

"آقا — غلام کے لئے آزردہ خاطر مت ہوں — غلام بالآخر آزاد ہو گیا۔"

خدیجہ نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کا سر جھک گیا۔ جھجکتے ہوئے سے ہاتھ آنکھوں پر آ گئے۔ شاید وہ تنہا تھی جسے اس مرتے ہوئے انسان پر رونا آ رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کے چہرے اتر گئے تھے لیکن اسی طرح جس طرح گھر میں پالی ہوئی بلی کی حسرت ناک موت پر اتر جائیں۔

خویلد نے اپنے دوسرے غلاموں کو حکم دیا کہ لاش کو سپرد خاک کر دیں لیکن غلامی میں شاید انسانی ذہن جانوروں سے زیادہ پست ہو جاتا ہے۔ آقا کے سامنے غلام لاش کو اٹھا کر لے گئے لیکن جب جنگل میں پہنچے تو گڑھا کھودنا اور پھر اس میں ایک بیکار لاش کو محفوظ کر دینا انہیں بیگار معلوم ہوئی۔ غلام کی لاش کو جنگل میں گیدڑوں اور چیل کوؤں کا پیٹ بھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔
لاش کی اس طرح بے حرمتی کرنے کی دلیل یہ تھی کہ مرنے والے نے اپنی زندگی میں ان پر بڑی سختیاں کی تھیں۔ مطبخ کا داروغہ ہونے کی حیثیت میں وہ اپنے آپ کو ایران کے شہنشاہ سے کم نہ سمجھتا تھا۔

اور جب شام کو سفر جاری کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں مُردہ غلام بھول چکا تھا۔ اب داروغہ مطبخ کوئی اور تھا اور اس کی جگہ کو پُر کرنے کے لئے خویلد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عکاظ کے میلے سے کوئی اچھا سا مضبوط جسم کا حبشی یا شامی غلام خرید لے گا۔

لیکن ڈاکوؤں کے اس حملے کو کوئی نہ بھول سکا تھا۔ محملوں میں عورتیں، گھوڑوں کی پشتوں پر مرد اسی ایک موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ نفیل بن عبدالعزیٰ خویلد کے کسی سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

"یہ زرید بن معاویہ تھا پسر گم۔ یہ وہی معاویہ ہے جو سماع کے نام سے مشہور ہے۔ اسی لئے زرید کا دوسرا نام زرید بن سماع بھی ہے۔ یہ قبیلہ ہوازن کی شاخ بنو حشام میں سے ہے اور آج کل اپنی بہادری اور نڈر دلیری کی وجہ سے بنو حشام کا سپہ سالار اور سردار ہے۔ یہ حضرت شاعر بھی بڑے اچھے ہیں اور ڈاکو

بھی پڑے سر سے کہے:

"یہ حضرت جو کچھ بھی ہیں" حرب نے کہا "اس جرأت کا بڑا تلخ مزا چکھنا ہوگا انہیں ـــــ"

"سردار خویلد ـــــ سردار حرب کو میری طرف سے کہہ دیجئے کہ زید کے چار بھائی ہیں۔ عبدیغوث، قیس، خالد اور عبداللہ۔ ان لوگوں نے اُدھم مچا رکھا ہے۔"

"سردار خویلد" حرب نے کہا "میری طرف سے سردار نفیل کو پیغام دیجئے کہ ان پانچوں بھائیوں کا خاطر خواہ انتظام کر دیا جائے گا۔"

"سردار خویلد" نفیل نے جواب دیا "سردار حرب سے کہہ دیجئے کہ جس کے متعلق وہ یہ سب کچھ فرما رہے ہیں معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ مقابلہ بڑے جوکھم کا کام ہے اور جب تک ہم سب باہم مل کر اس کا انسداد کرنے کی کوشش نہ کریں گے، یہ مصیبت نہیں ٹل سکتی۔"

اس سارے سوال و جواب میں خویلد نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کا نام محض اس لئے لیا جا رہا تھا کہ دونوں میں سے کسی کو یہ شک نہ ہو کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے دشمن کے ساتھ بالواسطہ مخاطب ہے۔

"عبدالشمس کی اولاد کو کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں ہے سردار خویلد" حرب نے تنک کر کہا "نفیل بن عبدالعزیٰ سے کہہ دیجئے کہ عبدالشمس کی اولاد کو قبیلہ سہم یا کسی اور قبیلے کے دامن میں پناہ لینے کی حاجت نہیں۔"

"عدی کی اولاد کم تھی سردار خویلد" نفیل نے بھی ذرا جوش سے کہا "کل

لئے عبد الشمس کی اولاد نے انہیں پریشان کیا۔ ہم لوگ اپنا گھر بار چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔ جب چیونٹیوں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اونٹ بھی گھبرا کر اس مقام کو چھوڑ دیتا ہے۔"

"لیکن" خویلد نے کہا، "اس موقع پر ایک دوسرے کو ایسی جلی کٹی سنانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پہل حرب بن امیہ کی طرف سے ہوئی ہے" نفیل نے گرج کر کہا،

"حرب بن امیہ ہر بات میں پہل کرتا ہے اور کرے گا۔ یہ اس کا خاندانی شرف ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت اس سے نہیں چھین سکتی۔"

"اولادِ عدی اس قسم کی فضول یاوہ گوئی کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"عبد الشمس کی اولاد اس قسم کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتی نفیل بن عبد العزیٰ ــــ میری تلوار کے صبر و سکوت کو اتنا نہ آزماؤ کہ وہ برداشت نہ کر سکے۔"

"سردار خویلد ــــ آپ کا مہمان میری توہین کر رہا ہے۔"

"سردار خویلد کے مہمان کے دل میں اولاد عدی کی عزت کب تھی جناب توہین کرے گا۔ ہم وہ ہیں جنہوں نے تم لوگوں کو ذلیل کر کے گھروں سے نکال دیا ہے۔"

"سردار خویلد ــــ میں ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے سے انکار کرتا ہوں انہیں کہہ دیجئے خاموش ہو جائیں۔"

"میری خاموشی بھی طعن ہو گی نفیل بن عبد العزیٰ ــــ میں تمہیں اس قابل نہیں

سمجھنا ــــ"

"تمہیں اس بات کا احساس ہو گیا۔ یہ مقام شکر ہے ـــــ ورنہ کتوں کو کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ اپنے سے بڑوں پر بھونک رہے ہیں اور اُن سے بڑے اس قابل نہیں کہ اُن پر بھونکا جائے ــــ ان کا فرض صرف دُم ہلانا ہے۔"

"نفیل بن عبد العزیٰ!" حرب نے کڑک کر کہا اور اُس کا ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔

"آپ دونوں میرے مہمان ہیں" خویلد نے کہا "آپ دونوں کی حفاظت میرے ذمّے ہے۔ میری ذمہ داریوں کو اتنا بوجھل نہ بنایئے کہ مجھ میں برداشت کی طاقت نہ رہے۔"

"آپ اپنی میزبانی سے دستکش ہو جایئے سردار خویلد" حرب نے مچل کر کہا "میں دیکھتا ہوں کہ مجھے کتا کہنے والا کون ہے۔"

"میدان عکاظ بہت وسیع ہو گا ــــ"

(۴)

عکاظ کے میدان میں دُور دُور تک خیمے نظر آتے تھے۔ وہ میدان جو چند دن پہلے غیر آباد تھا آج آدمیوں سے بھرا پڑا تھا اور آدمی بھی بھانت بھانت کے جمع ہوئے تھے۔ مکّہ سے قریش، سہم، بنو قیس اور کئی قبیلے آئے تھے۔ اپنے دماغوں میں بُت پرستی کی ہوا لئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مکّہ سے اپنے اپنے معبودوں کو بھی لے آئے تھے۔ کئی خاندان ایسے تھے جن کے پاس صحن کعبہ کے کنگر تھے۔ کئی ایسے تھے جو اپنے اپنے گھروں سے اپنے مخصوص بُت بھی ساتھ لائے تھے۔ تاکہ عبادت گزاری اور طواف میں کوئی کمی نہ ہو۔ اس کے علاوہ طائف سے یہودیوں کے کئی قبیلے اور کئی خاندان آئے تھے۔ بغلوں میں خدا کا کلام لیکن ہونٹوں پر بُت پرستوں سے کہیں زیادہ شرک اور غرور کے دعوے۔ اس کے علاوہ نجران اور شام کے دوسرے علاقوں سے عیسائی آئے تھے۔ کئی راہب اور گرجے کے بڑے بڑے عہدیدار تھے

جو عربوں کو بت پرستی کی لعنت سے نکال کر عیسےٰ ابن اللہ کی پرستش کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے علاوہ عرب کے ہر کونے سے تاجر آئے تھے۔

ان تمام مختلف قوموں، مختلف مذہبوں اور مختلف قبیلوں کے لوگ جن میں سے تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی کا دوست یا دشمن تھا۔ ایک میدان میں جمع ہوئے تھے۔ تجارت کرنے کے لئے، نئی دشمنیاں اور نئی دوستیاں پیدا کرنے کے لئے، شاعروں کی نئی غزلیں، نئے قصیدے اور نئے مرثیے سننے کے لئے کچھ اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے۔ اور شاید سب سے زیادہ ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت کا پُر لطف تماشہ دیکھنے کے لئے۔

میلے کے دو دن گزر چکے تھے اور آج تیسرا دن تھا اور یہی دن آخری تھا۔ آج شام میلہ دیکھنے والوں نے خیمے ڈیرے اٹھا لینے تھے اور عکاظ کے میدان میں پھر گیدڑوں اور بھیڑیوں کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔

ان دو دنوں میں بھی بڑی بڑی سنسنی خیز باتیں ہوئیں۔ فہیم کے قبیلے کے ثابت بن جابر کے مقابلے میں قریش کے بھی کئی جوان آئے۔ اشنفر ازدی اور امر بن برق فہمی۔ اس کے علاوہ دوسرے قبائل کے کئی نوجوان تھے۔ ابوسفیان بن حرب بڑے جوش میں تھا اور خوب اچک اچک کر شور مچا رہا تھا۔ لوگوں نے دوڑنے والوں پر ہزاروں اونٹ اور بکریوں کی شرطیں لگائی تھیں حرب نے بھی ابوسفیان کے کہنے پر شرط لگا دی ـــــ ابوسفیان کو یقین تھا کہ جیت حسب معمول ثابت بن جابر فہمی کی ہو گی۔ اور ایک ابوسفیان ہی

کیا میدان عکاظ میں بہت کم لوگ ایسے تھے۔ جنہیں اس امر کا یقین نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ثابت پر ہزاروں اونٹ لگ گئے تھے۔ دوڑ شروع ہوئی۔ نوجوانوں نے زور مارا لیکن کئی آدمی راستے ہی میں گر پڑے اور کئی گزوں پیچھے رہ گئے۔ ثابت بن جابر فہمی، اشنفرا ازدی اور عامر بن برق فہمی یہ تینوں برق پا لوگ سب سے آگے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے ثابت بن جابر پر شرط لگانے والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جیت اُن کی ہو گی۔ وہ اچھل اچھل کر کود کود کر اپنی بلند آواز میں ثابت کی ہمت بڑھا رہے تھے لیکن دفعتہً پانسہ بدل گیا۔ ثابت کی ہمت بڑھانے والے لوگ یک دم خاموش ہو گئے۔ اُن کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ اُن کے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور اُن کی جگہ اشنفرا ازدی کے مددگاروں نے اسی طرح اچھل اچھل کر ہمت بڑھانے والے نعروں سے آسمان کو ہلا دیا۔

اشنفرا ثابت سے کچھ ہی انچ آگے تھا اور ثابت اپنی پرانی شہرت و عزت کو برقرار رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس کی ننگی پنڈلیوں اور رانوں کے پٹھے ابھرے ہوئے تھے۔ سر آگے کو جھکا ہوا تھا اور دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے سامنے کوئی آہنی دیوار حائل ہے۔ جس کو وہ ہٹانا چاہتا ہے۔ یہی حال اشنفرا کا تھا۔ اُسے آج عمر میں پہلی دفعہ اپنے پرانے مقابل پر فتح ہو رہی تھی ورنہ کئی میدانوں میں وہ ثابت سے ہار چکا تھا۔ وہ بھی پوری قوت سے جھکا ہوا تھا۔

رسی چند قدم پر تھی۔ اس کو چھو لینے سے فتح اُس کی ہے۔ کم از کم عکاظ

کے اگلے میلے تک عرب کے شاعر اس کی تعریف میں قصیدے کہیں گے۔ لوگ ہر محفل میں اور ہر مجلس میں اس کے گن گائیں گے۔ یہ تھے وہ خیالات جو اشنفرا کے قلب و دماغ میں گونج رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چاروں طرف سے اس کا نام پکارا جا رہا تھا،

"شاباش اشنفرا — شاباش بڑھو — بڑھو اشنفرا"

اور اشنفرا کی رگوں میں جیسے شراب دوڑ رہی تھی۔ وہ دیوانہ وار رسی کی طرف لپک رہا تھا۔

ثابت بن جابر کی نگاہوں کے سامنے رسی لہرا رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے ہی اشنفرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے اشنفرا کے نام کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ثابت بن جابر کا نام لے۔ اس کا نام لینے والے جیسے گنگ ہو گئے تھے۔ اس کی مدتوں کی بنائی شہرت کیا اس بے دردی سے اشنفرا کے پاؤں تلے کچل دی جائے گی؟ کیا اب ثابت کی جگہ اشنفرا کا نام گونجنے لگے گا؟

نہیں — اور اس نے آخری بار کوشش کی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اس نے اپنے دماغ کی پوری قوتوں کو اپنے پیروں پر مرکوز کر دیا اور — رسی — ہوا میں لہراتی ہوئی رسی — اس کی طرف لپک پڑی۔

ثابت بن جابر کا سر گھومنے لگا۔ اس کی رگوں میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ چاروں طرف سے گونجنے والی آوازیں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح اس کی سماعت کے گرد چکر لگانے لگیں اور دفعتاً زمین و آسمان تیزی سے

گھوم کر ایک نکتے میں سمٹ گئے ثابت کے جسم میں سوئیاں سی چلنے لگیں۔

اور پھر جب اس نے آنکھ کھولی تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ کافی دیر تک بیہوش رہا ہے لیکن بے ہوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"جیتا کون؟" یہ پہلا سوال تھا جو اس کے ہونٹوں پر مچل اٹھا۔

اشنفرا نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں کو پکڑ لیا،

"تم جیتے ہو ثابت بن جابر——"

ثابت کی رگوں میں خوشی کے فوارے اچھل پڑے——!

ابوسفیان بھی اپنے نتیجے میں کم خوش نہ تھا۔ آج اس نے زندگی میں پہلی دفعہ جوا جیتا تھا اور جیتے ہوئے اونٹوں کو قربان کر کے آباؤ اجداد کے دستور کے مطابق ہمسایوں عزیزوں اور غلاموں میں تقسیم کر رہا تھا۔

حرب نے گھوڑ دوڑ میں بڑی رقم ہاری تھی۔ عکاظ کے میلے کی گھوڑ دوڑ کیوں کہ سوار کے بغیر ہوتی تھی اس لئے بے ایمانی کا اندیشہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ گھوڑوں کو ننگی پیٹھ شتکار کر دوڑا دیا جاتا جو اُن میں اول آتا اس کو انعام مل جاتا تھا۔ حرب کا گھوڑا آٹھویں نمبر پر تھا۔

اس کے علاوہ یہ لوگ شاعروں کے پنڈال میں بھی گئے۔ یہاں عرب کے بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ بڑے مقابلے کی چوٹ تھی۔ شاعروں نے اپنے اپنے قبیلوں کی تعریفیں کیں۔ اپنی گھوڑیوں اور اونٹوں کی تعریفیں کیں اپنی گھوڑیوں اور اونٹنیوں کی تعریف میں لمبے لمبے قصیدے سنائے۔ کئی شاعر ایسے بھی تھے جو عشق کے ہاتھوں پریشان تھے انہوں نے اپنی محبوباؤں کی

تعریف میں ایسے ایسے شعر نکالے تھے کہ لوگ سُن کر جھوم جھوم اٹھے تھے
نفیل بن عبدالعزیٰ کو اُن میں سے چند شعر یاد رہ گئے تھے جنہیں وہ گنگنا رہا
تھا:۔

میرے دوستو اور ساتھیو۔۔۔! آؤ۔۔۔! کیونکہ بعض وقت
حماقت بھی لذت آفریں ہوتی ہے۔
اس لئے آؤ۔۔۔ ہم اپنے شرابیوں کا استقبال کریں جن کا
چہرہ شراب کے نشے سے گلنار ہو رہا ہے۔
اور اپنے دل سے عقل و خرد کی تلخ تقریروں کو چھلکتے ہوئے
پیالوں کی مدد سے دھو ڈالیں۔
اور قہقہوں، مذاق اور خوشی سے زندگی کی تکلیفوں کو کم کر دیں
ہاں جب زندگی کے تیز و تند بگولوں میں سے ایک لمحہ آرام
و چین کا مل جائے تو جلدی کرو۔
اور اسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ وقت کے دانت کاٹتے ہیں
اور کسی کو اپنی ضرب سے نہیں چھوڑتے اور بدنصیبی انتظار میں
ہے۔

بڈھے نفیل بن عبدالعزیٰ کو یہ اشعار گنگناتے سن کر حرب کو ہنسی آ گئی
اُس نے دل ہی دل میں سوچا،
"بڈھے کو جوانی کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔"
ان دنوں میں ایک اور واقعہ بھی پیش آیا۔ نجران کے عیسائی پادریوں

کا مشہور افسر جسے یہ لوگ اسقف کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس کا نام قس تھا اس دفعہ کئی سال کے بعد عکاظ میں آیا تھا۔ اس کے جلوس کی شاہانہ شان و شوکت عکاظ کی رونق کو دو بالا کر رہی تھی۔ وہ ایک بلند کرسی پر بیٹھا تھا جس میں دو لمبے لمبے بانس لگائے گئے تھے۔ عقیدت مندوں کی دو لمبی لمبی قطاروں نے اس کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کرسی پر ایک چھوٹا سا چھتر لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے ہوتے ہوئے بھی اس کے بعض چیلوں نے ایک اور بڑا سا چھتر اٹھا رکھا تھا جس کے سائے میں اسقف کی سواری جا رہی تھی۔ چاروں طرف عربی اور شامی عیسائیوں کا غول تھا جو سر جھکائے سینے پر ہاتھ باندھے بڑے ادب اور احترام سے خاموش چلے جا رہے تھے۔ البتہ عرب کے غیر عیسائی لوگ اس کے ارد گرد شور مچا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے اور اسقف کی طرف اشارے کر کے سہمی ہوئی ہنسی ہنس رہے تھے۔ سب اس کی شان و شوکت کو حقارت کی نظر سے دیکھنا چاہتے تھے کہ اُن کے قلب و دماغ پر اُس پُر رعب ہستی کا اثر نہ ہو لیکن قس کی شخصیت اس پر اُس کا یہ طمطراق انہیں مرعوب کئے بغیر نہیں رہا۔ حرب اپنے شدید احساس برتری کے باوجود ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا،

"ان لوگوں کے مذہب میں یہی ایک بات ہے ۔۔۔ کتنا جلال ہے ان کے مذہبی پیشواؤں کے چہرے پر۔"

اور ورقہ بن نوفل جو پاس ہی کھڑا تھا، بول اٹھا،

"سچائی کے چہرے پر ہمیشہ جلال ہوتا ہے۔ روسیاہی جھوٹ ہی کے لئے مقدر ہے۔"

حرب نے آنکھیں نکال کر اُسے گھورا تھا۔ اور وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود حرب کے دل میں ورقہ بن نوفل کی بات تیر کی طرح اتر گئی اور ایک دھڑکتی ہوئی زندہ چیز کی طرح اس کی نسوں میں چبھتی رہی تھی۔

یہاں تک کہ جب نوفل نے خویلد کو اس جلوس کے ساتھ ساتھ اُس پنڈال میں چلنے کو کہا، جہاں اسقف قس تقریر کرنے والا تھا تو حرب کوشش کے باوجود انکار کرنے کی ہمت نہ کر سکا اور ساتھ ہو لیا۔

جلوس میلے کے پیچ در پیچ بازاروں میں سے ہوتا ہوا ایک میدان میں جا کر ختم ہو گیا جس میں ایک چھوٹا سا شامیانہ ایستادہ تھا۔ شامیانے کی چھاؤں میں عطر لگے پنکھوں کی خوشبودار اور سہانی ہواؤں کی زد میں اسقف قس کی کرسی عقیدت مندوں کے جھکے ہوئے کندھوں پر سے اتر کر زمین پر ٹک گئی۔ اسقف نے دائیں ہاتھ سے پہلے اپنے ماتھے کو چھوا پھر ناف کی طرف اشارہ کیا اور پھر دونوں کندھوں کو باری باری چھو کر کرسی سے اتر آیا۔

شامیانے کے سائے میں ایک منقش کرسی بچھی تھی۔ اس کی پشت پر ایک بھاری بھرکم صلیب کا نشان تھا۔ اسقف کے گلے اور ٹخنوں سے نیچے زمین پر رگڑتے ہوئے چغے پر بھی پشت اور سینے پر اسی طرح صلیب کے نشانات سلے ہوئے تھے۔ ہشت گوشہ ٹوپی جو خاصی ایک فٹ اونچی ہو گی سر پر رکھی تھی اور اس پر صلیب کے نشان بنے ہوئے تھے۔ اسقف

کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چاندی کی صلیب تھی جس پر مسیح ابن مریم کا بت لٹکا ہوا تھا۔

اسقف نے کرسی پر سے اتر کر منقش تخت کی طرف قدم اٹھایا مریدوں اور حاشیہ نشینوں نے لپک کر مقدس قدموں کے نیچے زربفت و باتات کی لمبی چادر بچھا دی اور نجران کے عالی خاندانوں کی خوبصورت چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے جلدی سے بڑھ کر اسقف کے چغے کا دامن اٹھا لیا جو کافی طویل تھا۔

اسقف آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھا۔ وہ مرید جو آگے آگے چل رہے تھے۔ تخت کے دائیں بائیں باادب کھڑے ہو گئے۔ دو بڑی بڑی صلیبیں ان کے سینے سے لگی تھیں۔

اسقف نے تخت کی طرف بیٹھ کر حاضرین کی طرف اپنا چہرہ گھمایا اور صلیب اٹھا کر سب کو خیر و برکت کی دعا دی۔

"عیسیٰ ابن اللہ تمہاری مدد کرے۔ خدا کا بیٹا تمہارے دلوں کو آسمانی حکومت کا نور قبول کرنے کی سعادت بخشے۔"

حاضرین سے آمین کا غلغلہ بلند ہوا اور بوڑھا اسقف کرسی پر بیٹھ گیا۔

تخت کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے مریدوں نے بآواز بلند عیسیٰ ابن اللہ کی تعریف میں بھجن شروع کیا اور وہ تمام عیسائی جو اس پنڈال میں جمع تھے آنکھیں بند کر کے ہاتھوں پر سروں کو جھکا کر بیٹھ گئے۔ بھجن گانے والے خاصے خوش الحان تھے۔ جس کی وجہ سے غیر عیسائی لوگوں کو بھی اس بھجن میں ایک مخصوص

قسم کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔

کچھ دیر یہی سلسلہ جاری رہا اور پھر اسقف نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنی خرخراتی ہوئی لیکن خاصی کراری آواز میں کہا،

"خدا کی بادشاہی میں آئے ہوئے خدا کے بیٹے پر ایمان لانے والے عیسائیو اور اے وہ لوگو جن کو ابھی تک خدا کی ماں کے قدموں میں سر جھکانے کی سعادت نہیں ملی ۔۔! آگاہ ہو جاؤ کہ میں بیماری کی وجہ سے چار پانچ سال اس جگہ آکر تم لوگوں کے سامنے وہ پاک اور مقدس کہانی بیان نہیں کر سکا جو میں کئی برس سناتا رہا ہوں یعنی خدا کے بیٹے کی کہانی ۔ آج بھی میری طبیعت اچھی نہیں بڑھاپے نے بیماری کے ساتھ ہاتھ ملا کر خدا اور خدا کی ماں کے اس ناچیز خادم کو خدا کی خدمت کرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے لیکن میں نے خدا سے دُعا مانگی تھی کہ وہ مجھے اتنی طاقت ضرور دے کہ میں تم لوگوں کے سامنے کم از کم ایک دفعہ اور مقدس اور محترم کہانی بیان کر دوں ۔ میری دُعا قبول ہوئی اور آج میں تم لوگوں کے سامنے ہوں ۔

میں کھڑا نہیں ہو سکتا ۔ خدا اس مجبوری کو معاف کرے لیکن میں اپنے دل میں ادب و احترام کا پورا جذبہ لے کر اس کہانی کو شروع کرتا ہوں :

چھ سو سال کے قریب گزر چکے ہیں ۔۔۔ عرب والو! چھ سو سال کے قریب گزر چکے ہیں جب آسمانی تخت پر بیٹھے ہوئے خدا کو مجھ پر اور آپ پر، میرے اور آپ کے آباؤ اجداد پر اور اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں پر رحم آیا اور اپنے رحم کا اظہار کرنے کے لئے اُس نے مریم کو دیکھا۔ مریم امید

سے ہو گئی۔ لوگ حیران تھے مریم جیسی عفت مآب دوشیزہ جس کا چہرہ اجرام فلکی کے سوا اور کسی نے نہ دیکھا تھا کیونکر حاملہ ہو گئی ——؟

یہ سوال تھا جو مقدس ماں کے قبیلے والوں میں دہک رہا تھا۔ ان کا ہر بچہ مقدس مریم کو شک کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہاں تک کہ یوسف نجار کو اپنا قبیلہ اور گھر بار چھوڑ دینا پڑا۔

■ اور آخر خدا کے بیٹے نے اس دنیا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ خدا کا بیٹا بچپن چھوڑ کر جوان ہوا اور پھر راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتے دکھاتے میرے اور آپ کے اجداد کے گناہ دھونے کے لیے۔ ہماری بدیوں اور ہماری کمزوریوں کا کفارہ دینے کے لئے ظالموں کی صلیب پر قربان ہو گیا۔

اے لوگو: وہ عظیم قربانی نہیں بھلائی جا سکتی۔ تم میں سے کون ہے جو دوسرے کے لئے اپنے لخت جگر کو ظالمانہ موت کے ہاتھوں میں دیدے اور منہ سے اُف نہ کرے۔ یہ خدا ہی کا دل گردہ تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو تم لوگوں کے لیئے قربان کر دیا۔ اور ہماری کتنی عظیم بدنصیبی ہے کہ ہم میں سے کئی ایسے ہیں جو اس قربانی سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان پھیلی ہوئی باہوں میں اپنے آپ کو نہیں دے دیتے جن کے گھیرے میں کائنات سمٹ سکتی ہے اور جس میں سمٹ کر کائنات کے سارے گناہ دھل سکتے ہیں۔

خدا کی ماں مریم مقدس تمہیں اپنی طرف بلاتی ہے۔ خدا کا بیٹا مقدس یسوع تمہیں اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے —— آؤ

جوق در جوق آؤ ـــــــ قطار اندر قطار آؤ ـ اور اپنے گناہوں کی معافی چاہو تمہارے گناہ خود بخود صاف ہو جائیں گے۔ تمہارے تمام جرموں کی سزائیں خود بخود مٹ جائیں گی۔"

اسقف کی سانس پھول گئی تھی۔ چند لمحوں تک سانس لینے کے بعد اس نے کہا،

"مجھے افسوس ہے کہ میں پوری تفصیل سے تمہیں وہ کہانی نہیں سنا سکا لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اتنا کافی ہے کہ تم لوگ اس پر سوچ سکتے ہو جھوٹے معبودوں کو چھوڑو اور خدا کی ماں کے قدموں میں آجاؤ۔ خدا کے بیٹے کے سایۂ عاطفت میں پناہ لو ـــــــ"

اسقف خاموش ہو گیا اور لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ حرب نے خویلد کی طرف دیکھا اور خویلد نے ورقہ بن نوفل کی طرف۔ حرب آہستہ سے نظر بچا کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ خویلد اور ورقہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

چند قدم چلنے کے بعد حرب نے کہا،

"ان کا مذہب ہمارے مذہب سے کچھ مختلف تو نہیں۔"

"ہاں ـــــ جس طرح ہمارے ہاں خدا کی بیٹیاں ہیں، ان کے یہاں خدا کا بیٹا ہے، اور غضب کیا ہے ظالموں نے خدا کی ماں کا بھی پتہ ڈھونڈ نکالا ورنہ ہمیں تو اب تک پتہ ہی نہ تھا۔

"میرے خیال میں، ہم لوگوں کو فوراً ایک کام کرنا چاہیئے۔" حرب نے کہا۔

"کیا" خویلد نے پوچھا۔

"جس طرح بھی بن پڑے، خدا کی ماں کا ایک بت صحن کعبہ میں ضرور رکھ دینا چاہیئے۔ واقعی بڑی کمزوری ہے۔ ہمارے خدا کی کوئی ماں ہی نہیں گویا ـــ سوچیئے تو سردار خویلد۔ اگر سوال کیا جائے کہ خدا کہاں سے آگیا۔ تو اس کا جواب ہونا چاہیئے۔ کیوں ورقہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"تم تو کوئی الٹی ہی بات سوچو گے۔" خویلد نے کہا۔

"لیکن بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ الٹی ہی سہی ہم سیدھی کر دیں گے۔" حرب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کی ماں اور خدا کے بیٹے کا خیال تو کچھ ایسا اہم نہیں۔"

"ایں ـــ تو پھر اہم کیا رہ گیا باقی۔"

"یہ کہ خدا نے انسان کے لئے اپنے بیٹے کی قربانی کر دی ـــ بڑا خوبصورت خیال ہے۔"

"اس میں ایسی کون سی خوبصورتی ہے جو ہمارے یہاں نہیں۔ ہمارے جدامجد خلیل اکبر نے بھی تو اپنے بیٹے کی قربانی کرنے کی ٹھان لی تھی۔ یاد رہے بات ہے کہ خدا کی طرف سے انہیں حکم ملا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے اب بیٹے کی بجائے مینڈھے کی قربانی دے دو۔ اسی یاد کو ہر سال تازہ کرنے کے لئے ہم لوگ اونٹوں، بھیڑوں اور بکروں کی قربانی دیتے ہیں۔"

"اور پھر تازہ واقعہ موجود ہے۔" خویلد نے بحث میں پہلی مرتبہ دلچسپی

لی۔" عبدالمطلب چھری لے کر عبداللہ کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ آخر خیبر کی کاہنہ نے بتایا کہ ہبل کے تیروں سے فال لو۔ چنانچہ عبدالمطلب نے فال لی اور آخر سو اونٹوں کی قربانی دی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"آپ دونوں کا کہنا بجا و درست ہے لیکن اس میں بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ قربانی انسان کی نجات کے لئے دی گئی محض خدا کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کی کمزوریوں اور برائیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے۔ یہ خیال انسانیت سے یقیناً قریب ہے۔ ہم لوگ انسانیت کو بھول کر محض بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ہمارے بتوں میں سے کوئی بت ایسا نہیں جو عالم انسان میں سے ہو یا جسے انسان سے من حیث الانسان ہمدردی ہو عیسائیوں کے خدا کو انسان سے ہمدردی ہے کہ بھولا بھٹکا انسان گناہ کی پاداش سے بچ جائے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا تم کوئی ایسی ہی بات سوچ رہے ہو گے ارے بھئی ہماری قربانی بھی تو اسی غرض سے ہوتی ہے۔ خلیل اکبر نے اپنے بیٹے کو چھری کے نیچے کیوں دھر لیا تھا؟ کیا اس لئے کہ خدا کو صرف خوشی ہی درکار تھی۔ اسی لئے تو یہ سب کچھ کیا تھا کہ خدا اپنے بندوں پر خوش ہو اور جو گناہ اور تقصیر ان سے سرزد ہو رہی ہے معاف کر دے۔ کمال بات کی ہے تم نے۔"

"ٹھیک ہے۔" ورقہ نے بے دلی سے کہا "لیکن آپ پھر ناراض ہو جائیں گے، جب میں کہوں گا کہ ہم نے دین ابراہیم کو مدت ہوئی خیرباد

کہہ دیا ہے۔ اب ہم لوگ ابراہیم کے دین پر نہیں۔ اب ہمارے معبود وہ ہیں جنہیں عرب کا ایک تاجر شام سے مانگ کر لایا تھا۔ ہم نے ابراہیمؑ کے خدا کو، جسے خوش کرنے اور اپنے بندوں پر اپنی بہ کرم کرنے کے لئے ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے پر چھری اٹھالی تھی، مدت ہوئی کعبہ سے نکال دیا ہے اب اس کی جگہ ہبل ہے ـــ ہبل ـــ شام سے مانگا ہوا خدا ـــ!"

"میں پھر کہتا ہوں میاں صاحبزادے۔" حرب نے بے چین ہو کر کہا۔ "ہمارے صبر کو زیادہ نہ آزماؤ ـــ اور میری یہ بات گرہ میں باندھ رکھو کہ یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے۔"

ورقہ خاموش ہو گیا۔

غرض یہ دو دن اسی طرح کی باتوں میں گزر گئے تھے اور آج تیسرا دن تھا میلے کا آخری دن۔ آج میلہ ختم ہو رہا تھا اور لوگوں کو اپنے اپنے خیمے اٹھا کر اپنے گھر لوٹ جانا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ دکانداروں نے اپنے مال کی قیمت بہت کم کر دی تھی تاکہ بچا کھچا مال جتنی جلدی ہو سکے نکل جائے اور میلے میں آئی ہوئی چیزیں واپس نہ جائیں۔ اسی لئے آج غلاموں کی قیمتیں بھی میلے کے پہلے دنوں سے بہت کم ہو گئی تھیں۔ خویلد کو داروغہ مطبخ کی جگہ ایک غلام کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ گھر کی عورتیں میلے میں گھومنے پھرنے کے لئے کہہ رہی تھیں۔ خصوصاً خدیجہ تو مچلی پڑتی تھی۔ اس لئے آخری دن خویلد غلاموں کے ساتھ غلام منڈی کی طرف

روانہ ہوا۔

غلام منڈی میں جتنے اچھے اچھے غلام تھے بک چکے تھے۔ لے دے کے چند کانے، گنجے اور بے کار غلام اپنے لوہے کے جنگلے میں بیٹھے جھپکتی ہوئی آنکھوں سے اپنے تاجروں اور خریداروں کو دیکھ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں، چہرے پر مردنی اور آنکھوں میں مایوسی کی جھلک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانی ڈھانچے میں کسی نہایت ہی پست قسم کے جانور کی روح پھونک دی گئی ہے جس میں احساس کی قوت باقی نہیں رہی۔ جس کے لئے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کوئی معنی، کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ جس کے سر پر جھکا ہوا آسمان، آسمان نہیں بلکہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو وہ پہچاننے سے قاصر ہیں۔

لیکن ان چند بے حس انسانی ڈھانچوں کے درمیان پنجرے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی ایک عورت بھی تھی جس نے اپنے کلیجے سے دو تین برس کا ایک کالا کلوٹا بچہ چپکا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر موٹے حروف میں ماں کا لفظ لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی فرط دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں، اُلجھے بال، پھیلے نتھنے اور خوف و ہراس سے دھڑکنے والے دل کی پیدا کی ہوئی زردیاں جو اس کی سیاہ رنگت سے دست و گریباں تھیں، پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ یہ ماں ہے ــــ ماں!

اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو سینے کے ساتھ اس طرح بھینچا ہوا تھا جیسے وہ آخری بار اپنے بچے سے مل رہی ہو۔ اور جب غلاموں کا تاجر

ہاتھ میں کوڑا اٹھائے کسی نئے خریدار کو ساتھ لے کر پنجرے میں آتا تو اُس کے ہاتھ خود بخود بچے کے جسم کے ساتھ اس زور سے لپٹ جاتے کہ بچہ بے چین ہو کر کلبلانے لگتا تھا اور پھر جب تاجر دوسرے غلاموں میں سے ایک ایک کے پاس جاتا، اُن غلاموں کی تعریف کرتا۔ جب وہ غلاموں کے بال پکڑ کر زوردار جھٹکے سے ان کا سر اٹھا کر نئے خریدار کو دکھاتا اور جب نیا خریدار بے رحمی سے اس کی ناک پر انگوٹھا رکھ کر اُس کا منہ کھولتا اور دانت دیکھتا، غلام خود بخود اپنا جبڑا کھول کر اُسے دانت دکھا دیتے اور سہمی ہوئی ڈری ہوئی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے تو ماں کا کلیجہ دھک سے بیٹھ جاتا۔ اس کا دماغ سُن سے رہ جاتا اور پھر جب ایک کے بعد دوسرا غلام خریدار کی نظروں میں "بڈھا ـــــ کمزور ـــــ بیمار ـــــ بیکار" ثابت ہو جاتا اور تاجر اُس کی طرف بڑھا آتا تو اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی جاتی ـــــ "بچہ" صرف یہی لفظ اُس کے ذہن میں گونجتا اور جُوں جُوں اُن کے قدم اس کے قریب اُٹھتے جاتے اسی ایک لفظ کی گونج بڑھتی جاتی، تیز ہوتی جاتی۔ یہاں تک کہ جب تاجر کی موٹی موٹی گرہ دار انگلیاں اس کے بالوں کے الجھٹوں میں تیر کی سی تیزی اور شدت کے ساتھ گڑ جاتیں۔ جب تاجر کا زوردار جھٹکا اس کی گردن کو مروڑ دیتا۔ جب خریدار کا انگوٹھا اس کی ناک پر پڑتا اور درد کی شدت سے اُس کا منہ کھل جاتا تو یہ لفظ بگولے کی شدت اور ابہام کے ساتھ اس کے ذہن کے ہر کونے میں گردش کرنے لگتا۔ اُس کی زندگی سمٹ کر اُس کے دل کے اردگرد دیوانوں کی طرح ناچنے لگتی!

اور پھر جب خریدار ناک بھوں چڑھا کر کہتا،

"اونہوں ـــــ سب بیکار ہیں۔"

تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کسی دیوتا نے اُس پر انتہا درجے کا کرم فرمایا ہے۔ اُس کی رگوں میں اطمینان چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگتا۔

تین دنوں سے اُسے یہی تجربہ ہو رہا تھا۔ ان دنوں میں کئی خریدار آئے تھے اور کئی کنیزیں اور غلام جو اُس کے ساتھ زنجیر میں بندھ کر غلاموں کے تاجروں کے قافلے کے ساتھ ساتھ پیدل چل کر شام سے میدان عکاظ میں آئے تھے، بک چکے تھے۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں مشترکہ مصائب نے ایک دوسرے کا ہمدرد بنا دیا تھا لیکن اس قطعی انسانی جذبے کو غلاموں نے خود ہی اپنے دل میں کچل دیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمدردی اور انس کا یہ جذبہ اُن کے لئے نہیں۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کسی غیبی طاقت نے انہیں وجدانی طور پر یہ سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی انسانی جذبہ اُن کے لئے نہیں بنا ہے اس لئے جب اُن کے ساتھی ایک ایک کر کے جدا کر دیئے گئے تو انہیں مطلقاً رنج نہیں ہوا۔ انہوں نے ان تمام باتوں کو اس طرح دیکھا اور سنا جیسے یہ سب اُن سے متعلق نہیں ہیں جیسے یہ ساری مصیبت کہیں دور، بہت دُور ٹوٹ رہی ہے جس کا ان پر کوئی اثر نہ ہو گا۔

لیکن ماں کا جذبہ انسانی جذبہ تو نہیں۔ یہ تو قطعی حیوانی جذبہ ہے اور انسانی ڈھچر میں تڑپنے اور کلبلانے والی حیوانی روح اس جذبے کو کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ ماں کو کھانا پینا، سوتا جاگنا سب بھول گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ

کی ساری قوتیں ایک ہی خیال پر مرکوز تھیں اور وہ اس کا بچہ تھا۔ اگر اُسے کسی نے خرید لیا تو بچہ اُس سے جدا کر دیا جائے گا۔ یہ یقینی بات تھی۔ کوئی خریدار اتنا رحمدل نہ ہو گا، جو ڈھائی تین سال کے اس بیکار لوتھڑے کے لیئے اپنی محنت کی کمائی ہوئی دولت گنوا دے۔ وہ ماں کو خریدیں گے کیونکہ ماں اُن کی خرچ ہوئی دولت کا معاوضہ دے سکتی ہے اور پھر تاجر بچے کو کیوں بیچے گا آج سے پندرہ بیس سال بعد یہی بچہ جوان ہو جائے گا اور اس کی قیمت سینکڑوں تولے سونا ہو گی۔ مونیوں کے تول خریدیں گے اسے خریدنے والے اتنی بڑی رقم مفت ہی تو ہاتھ لگے گی۔ اس کو کھلانا کیا پڑے گا۔ تاجر کے اور تاجر کے مہمانوں کے دستر خوان سے بچے ہوئے جو ٹھے ٹکڑے اس کے جوان اور مضبوط معدے میں پہنچ کر اس کی رگوں میں قوت و حیات کے وہ دریا بہا دیں گے جو امیروں کی مرغن غذائیں پیدا نہیں کر سکتیں۔

یہی وجہ تھی کہ غلام ماں کا دل دھڑک رہا تھا۔ ہر آنے والے کی آمد پر اس کا دل کانپ اٹھتا تھا اور جب آنے والا اُسے اسی پنجرے میں چھوڑ کر واپس چلا جاتا تو اُس کے سینے کی انتہائی گہرائیوں سے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس نکلتی اور وہ آنکھیں بند کر کے پنجرے کی سلاخ سے سر ٹیک لیتی۔

اور دفعتہً اس کا دل اُسی شدت سے دھڑک اٹھا۔ اس دفعہ تاجر سردار خویلد کو ساتھ لے کر پنجرے میں داخل ہوا تھا۔ خویلد کے ساتھ اس کا حرم بھی تھا اور خدیجہ بھی اپنے خوبصورت چہرے پر نقاب ڈالے اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

تاجر نے اپنے مخصوص کاروباری انداز میں وہی باتیں دہرا دیں جو اس نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سیکھی تھیں اور جو بچپن سے اُس کے ہونٹوں پر جاری تھیں۔

"یہ غلام صرف چالیس سال کا ہے۔ دانت ملاحظہ کیجئے۔ بہت طاقتور ہے۔ پانچ من تک کا بوجھ اٹھا کر دس میل چل سکتا ہے۔"

"یہ غلام غلاموں کی بہترین نسل سے ہے۔ کام کرتے ہوئے پاؤں میں زخم آگیا تھا، اس لئے کچھ لنگڑاتا ہے لیکن اس کی طرف نہ جائیے۔ بڑے کام کا آدمی ہے اور بے حد سستا دے دوں گا آپ کو ـــ؟"

خویلد سر ہلا کر دوسرے کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ خاص حبشی غلام ہے۔ اس کے چہرے کی جھریوں پر نہ جائیے ذرا اس کے بازو ملاحظہ کیجئے۔ کسی زمانے میں یہ بھینس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی بلند جگہ سے گر پڑا تھا۔ پشت میں چوٹ آگئی اس لئے کبڑا ہوگیا ہے لیکن کام کرنے میں بڑا ہوشیار ہے۔"

"مجھے مطبخ کے لئے ایک آدمی چاہیئے بھائی ـــ مطبخ کے لئے جو کھانا وغیرہ پکانے میں ہوشیار ہو اور عربی، شامی، ایرانی اور رومی کھانوں کو خوب سمجھتا ہو۔"

"تو آپ نے پہلے فرمایا ہوتا۔ میرے پاس ان باتوں کو سمجھنے والی ایک کنیز ہے۔ اس غضب کا کھانا پکاتی ہے کہ آپ کے مہمان عمر بھر انگلیاں چاٹیں گے ادھر تشریف لائیے۔"

تاجر اور خویلد کے پاؤں اس غلام عورت کی طرف اٹھ گئے جو اپنے بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔

"اسے میں شام کا موتی کہا کرتا ہوں۔ یہ شام کے ایک بہت بڑے گھرانے میں پلی ہے اور عمر بھر مطبخ میں ہی کام کرتی رہی۔ اس کے پہلے آقا بھی حضور کی طرح تاجر تھے اور جہاں جاتے اس عورت کو ساتھ لے جاتے تھے۔ ایران، روم، اندرونِ عرب ہر جگہ کی سیر کی ہے اس نے۔ اور ہر جگہ کے مشاق باورچیوں سے کھانا پکانے کے فن کو سیکھا ہے۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ ہی کے لئے محفوظ رہ گئی ہو۔"

خویلد نے ناقدانہ انداز سے لونڈی کی طرف دیکھا جو اس کی جلتی ہوئی نگاہوں کے بوجھ تلے پستی سی چلی جارہی تھی۔

"ہوں ــــ" خویلد نے کہا، "لیکن اس کے بچے کا کیا ہوگا۔"

"اگر آپ کو ضرورت ہو تو مجھے اعتراض نہیں۔ اس کی قیمت صرف پچاس تولے چاندی ہے۔"

"بچے وچے کی ضرورت نہیں۔"

"اجی حضور ــــ دس بارہ سال کے بعد یہ کم از کم پانچسو تولے سونے کے عوض اس منڈی میں بکے گا۔ میں تو آپ کو کوڑیوں کے مول دے رہا ہوں۔"

"لیکن دس بارہ سال اس مصیبت کو کون پالے بھائی ــــ صرف اس عورت کا سودا کرلو اگر منظور ہو تو۔"

ماں کے دل پر بجلیاں کوند پڑیں۔ لیکن اس ہمہ گیر چمک اور عالمگیر کڑک

نے خریدنے والے اور بیچنے والے کو جیسے چھوا تک نہ تھا جیسے انہیں احساس
ہی نہ تھا کہ ایک عورت نے تنکا تنکا کر کے جس آشیانے کو بنایا ہے جس کے
بنانے میں اس کی ساری جوانی، ساری حیات، ساری زندگی خرچ ہو گئی ہے
ان کے ایک سانس سے جل رہا ہے۔ وہ اسی بے اعتنائی، بے پروائی
اور بے حسی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کائنات شکن زلزلے کی گرج
تاجر کی آواز میں ڈھل کر اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح اس کی روح کی گہرائیوں
میں اتر گئی۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے — میرا مال تو کھرا ہے۔ سو تولے
سونا شام کے اس موتی کی قیمت ہے، صرف سو تولے سونا۔"

"بہت زیادہ ہے — پچاس دے سکتا ہوں۔"

"جی نہیں — سو تولے سے ایک رتی کم نہیں ہوگی صاحب! عرب،
شام، اور مصر کی غلام منڈیوں میں اس کا جواب نہیں —"

"اچھا تو تمہاری مرضی — چلو!" خویلد کہہ کر چل دیا۔ وہ تاجر کے
ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا تھا۔

"اچھا تو سنئے، آخری بات — نوّے تولہ سونا دیجئے تولے جائیے
اور یہ بھی آپ کی خاطر ہے۔"

"پچاس بھائی — پورے پچاس — یہ تھیلی میرے پاس ہے اس
سے زیادہ ایک کوڑی نہیں ہوگی۔"

بحث لمبی ہو گئی اور آخر اسّی تولے سونے پر فیصلہ ہو گیا۔

وہ لمحہ جس کی آہٹ ماں دور سے سن رہی تھی، بجلی کے کوندے کی لپک کی طرح آیا اور اس کا سب کچھ جل گیا۔ گھومتے ہوئے سر میں جلتے ہوئے دماغ نے محسوس کیا۔ کوئی چیز اس کے سینے پر سے نوچ لی گئی ہے۔ نہیں سینے کے اندر سے نکال لی گئی ہے جیسے اس کی رُوح نکال دی گئی ہو۔ جیسے اس کی زندگی کو گھوڑے کی ٹاپوں تلے روند دیا گیا ہو اور پھر جیسے دُور سے چیخوں کی آواز سنائی دی ہو۔ جیسے کوئی کنوئیں کی گہرائیوں میں پڑا پکار رہا ہو۔

"ماں ــــ ماں!"

لیکن ماں ــــ؟ کہاں تھی ماں؟ اس کی رگوں میں بہنے والی محبت کو تو تاجر کے ہاتھوں نے مار دیا تھا۔ اُن چیخوں کو کون سنتا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھی۔ تاجر کی گرہ دار انگلیوں کے زور پر اٹھی اور خویلد کی طرف دھکیل دی گئی لاش کو کوئی جہاں چاہے پھینک دے۔ لاش احتجاج کیسے کر سکتی ہے۔ اس زندہ لاش کے ہونٹوں سے بھی احتجاج کا لفظ نہیں نکلا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگیں اپنے کمزور بے جان کندھوں پر اس کی اپنی لاش کو اٹھائے چل رہی ہیں۔

البتہ خدیجہ نے دیکھ لیا تھا۔ اس غلام عورت کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی رُوح تک پہنچ گئی تھیں۔ خدیجہ کی نگاہیں، اسے اس بے حس اور بظاہر بے جان ڈھانچے میں وہ ماں نظر آ گئی جو مری نہیں تھی محض شل ہو گئی تھی۔ جس کی رگوں کا بہتا خون چند لمحوں کے لیے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے باپ سے

کہا،

"بچے کو بھی لے چلیں ابا جان"

"بے کار چیز ہے۔ لعنت بھیجو"

"میں خرید لوں گی۔ میرے پاس بیس تولے چاندی ہے۔"

اور تاجر نے لوٹتے لوٹتے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بچے کی ٹانگ تھی۔ اور وہ زمین کی طرف سر کے بل لٹکا ہوا زور زور سے چلا رہا تھا

"فضول ضائع کرنے سے کیا حاصل اوڑھنی خریدنا بیٹیا ——— ادھر بازار میں روم کی بنی ہوئی بڑی اچھی اچھی اوڑھنیاں بک رہی ہیں"

"لیکن میں اپنے لئے غلام خریدوں گی" خدیجہ نے کہا "ہم خریدیں گے اپنے لئے غلام"

خویلد کے ہونٹوں پر محبت کی تابناک مسکراہٹ چھا گئی اور اس نے کہا،

"تو لے لو ———"

خدیجہ لپک کر آگے بڑھی۔ چاندی کی تھیلی تاجر کے ہاتھوں میں تھی اور چلاتا ہوا بچہ خدیجہ کے سینے سے لپٹ گیا۔ خدیجہ نے اپنے گول گداز بازو جو موٹے کپڑے کی کھلی آستینوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ننگے، کالے کلوٹے گندے سے پلپلے بچے کے گرد لپیٹ دیئے اور اسے اپنے سینے کے ساتھ دبا لیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی روح ہفت آسمان کی نزہت زا بلندیوں پر پرواز کر گئی ہے۔ وہ بیس تولے چاندی جو اس نے تھوڑی

کر کے اپنی اوڑھنی کے لئے جمع کی تھی جیسے اپنے مقصد کو پورا کر گئی تھی۔

بچہ لمحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے خدیجہ کے کندھے پر سر رکھے سسکیاں لیتا رہا۔ پھر اُس نے دفعتہً آنسو بھری آنکھوں سے خدیجہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر رونے لگا۔ ماں نے بچے کی طرف دیکھا اونگھتے ہوئے سے دماغ کے ساتھ۔ پھر نیم مردہ ہاتھوں میں اس کا بوجھ محسوس کیا۔ وہ سینہ جس کی رگوں میں پلنے والا خون منجمد ہو گیا تھا نئے سرے سے گرمی محسوس کرنے لگا اور منجمد خون ایک لرزہ خیز جھٹکے کے ساتھ دیوانوں کی طرح بے ہوش رگوں میں ناچنے لگا۔ ماں نے بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی وہ آنکھیں جو خشک ہو گئی تھیں یکدم آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ شاید ان خاموش آنسوؤں سے وہ خدیجہ کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

سورج کافی ڈھل چکا تھا جب یہ لوگ اپنے خیموں میں لوٹے خیمے کے قریب ہی سردار حرب کا ایک غلام کھڑا تھا۔ اُس نے بڑے ادب سے سردار خویلد کی خدمت میں سلام عرض کیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بولا،

"میرے آقا سردار حرب بن امیہّ بن عبد شمس حضور کو یاد فرما رہے ہیں قریش کے عالی تبار خاندان کے تمام افراد جمع ہیں اور کوئی اہم قبائلی معاملہ زیر بحث ہے۔ سردار حرب فرماتے ہیں کہ اس قومی معاملہ میں حضور کی شرکت اشد ضروری ہے۔"

"بات کیا ہے؟"

"غلام کو اس کا کچھ علم نہیں۔ آقا کا ارشاد حضور کے گوش گزار کرنا ہی غلام کا فرض تھا۔"

"اچھا۔ سردار حرب کی خدمت میں ہمارا مؤدبانہ سلام عرض کرو اور ہماری طرف سے کہو کہ ہم ابھی آتے ہیں۔"

"حضور!" غلام سلام کر کے چلا گیا اور سردار خویلد اپنے خیمے میں داخل ہوئے۔ ابھی اُنہوں نے سر پر کا رُومال کھولا تھا کہ سردار حرب کا غلام پھر آیا اور بولا،

"آقا فرماتے ہیں کہ حضور کے انتظار میں پہلے ہی بہت وقت صرف ہو چکا ہے اس لئے فوراً تشریف لائیے۔"

سردار خویلد نے رومال کو پھر سر پر رکھتے ہوئے کہا،

"بہت اہم معاملہ معلوم ہوتا ہے۔" اور خیمے سے باہر نکل گئے۔

نئی کنیز عمر کے اُس حصے میں تھی جہاں اُسے نہ جوان کہا جا سکتا تھا نہ ادھیڑ عمر اور بالخصوص اب جب کہ اُس نے سردار خویلد کے خیمے میں پہلا قدم رکھا اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی جوانی جاتے جاتے پھر لوٹ آئی ہے۔ وہ اپنے بچے کو اس طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی، جیسے یہی اس کا سب کچھ تھا۔

حرم کے خیموں میں داخل ہوتے ہی مالکن کی طرف سے اس پر احکام کی بارش ہونے لگی۔ یہ کرنا ہوگا اور جب موقع لگے تو وہ بھی کر دینا۔ فرصت کے وقت ایسا ہو جائے تو بہتر ہو اور سوتے سوتے ویسا کر دینا۔ اتنے کام اتنے

احکام کہ انسانی عقل چکرا جاتی۔ لیکن کنیز نے سب کچھ مسکراتے ہونٹوں سے سنا اور باورچی خانے کی طرف لپک پڑی۔ لیکن ابھی وہ دروازے پر پہنچی تھی کہ خدیجہ کی آواز سنائی دی،

"ارے بھئی ـــ اس بچے کو یہیں چھوڑ جاؤ ـــ ہمارے ساتھ کھیلے گا"

کنیز کے دل کو دھکا سا لگا۔ اُس نے کریدتی ہوئی نگاہوں سے خدیجہ کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ پھر متوحش نگاہوں سے بچے کو دیکھا اور ـــ بے بنیاد شکوک، بے مطلب شبہات اس کے ذہن میں آندھی کی طرح اٹھے اور ریڑھ کی ہڈی کی طرف جانے والی خون کی نالیوں میں بگولے کی طرح چکرا گئے۔ لیکن شک و شبہ کا یہ طوفان عارضی تھا۔

"یہ ہمارا غلام ہے ـــ تمہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے۔" خدیجہ نے مسکرا کر کہا اور دونوں ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیئے۔"

بچے نے ماں کی طرف دیکھا۔ شاید وہ حیران ہو رہا تھا۔ اس کے لئے جب سے دنیا شروع ہوئی تھی۔ ماں کی پیشانی کے سوا اس نے آج تک کوئی ایسی پیشانی نہ دیکھی تھی جس پر اس کے لئے ایک حقیقی محبت کی تابناکیاں ظاہر ہوئی ہوں۔ اُس نے اپنی ماں کی آنکھوں کے سوا دنیا میں آنکھوں کا کوئی اور جوڑا نہ دیکھا تھا۔ جس کی گہرائی میں اس کے وجدان نے پیار محسوس کیا ہو لیکن آج عجیب دن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات اپنے محور پر الٹی گھوم گئی ہے وہ کچھ ہو رہا تھا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک غلام زادہ اپنے آقا کی نگاہوں میں پیار ـــ دلی اور حقیقی پیار کی جھلک دیکھ رہا تھا۔

اُس معصوم —— ڈھائی سال کے ننھے سے لوتھڑے کو اپنے دل پر یقین نہیں آتا تھا۔ دل کی رگوں پر وہ ناقابلِ برداشت تناؤ جو وہ اس بڑی سی عورت کے لئے محسوس کر رہا تھا —— اونچے قد کی عورت جو اس کی ماں سے کہیں زیادہ خوبصورت، کہیں زیادہ بڑی —— اور نہ جانے کیا کچھ عورت تھی۔ کیا وہ یہ سمجھ لے کہ اس کا دل پیار کا جواب پیار سے دے رہا ہے —— ؟

ایک دو دفعہ ماں کی طرف دیکھنے کے بعد اُس کے ننھے سے شعور نے فیصلہ کر لیا —— پیار کا جواب پیار ہی سے دے رہا تھا اُس کا دل۔ اس کے موٹے موٹے بھدّے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی لرزی آنکھوں کی پتلیوں میں چمک جیسے آگ پڑی ہو۔ اور وہ ہمک کر پھیلی ہوئی باہوں کی طرف لٹک گیا۔

ماں نے جھجکتے جھجکتے اُسے ذرا سا اور آگے بڑھا دیا اور خدیجہ نے لپک کر اُسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ خدیجہ کی ماں دوسرے خیمے سے آئی اور ڈپٹ کر بولی،

"ابھی تک تو گئی نہیں مطبخ میں نگوڑی نکمی کہیں کی۔" اور پھر اس کی نگاہیں دفعتہً خدیجہ کی طرف کھنچ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے خدیجہ ؟"

"بچہ ماں!" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم باتیں کریں گے اس کے ساتھ ——"

"تو ستیا ناس کر کے رہے گی ان لونڈی غلاموں کا۔" اور پھر کنیز کی طرف متوجہ ہوئی، "تو کیا تک رہی ہے دیدے پھاڑ پھاڑ کر۔ منہ کالا کر اپنا — کام کر —"

اور کنیز بھاگ کر خیمہ سے باہر نکل گئی۔ آج اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ فضائے بسیط پر حکمران ہے۔

لیکن خدیجہ نے جیسے ماں کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ وہ گھوم کر تخت پر بیٹھ گئی اور بچے کو اپنے سامنے بٹھا کر بولی،

"اچھا تو بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام شیطان ہے اس غلام بچے کا۔" ماں نے دق ہو کر کہا۔

"خاندان میں اتنے بچے پیدا کئے جا رہے ہیں کہ حساب لگانا مشکل ہو گیا ہے اور ان شہزادی صاحبہ کے دل سے بچوں کی ہوس ہی نہیں جاتی تیرے ابا آئیں اُن سے کہتی ہوں تیری شادی کریں کسی سے۔"

خدیجہ نے لاڈ کے ہنڈولے میں ڈولتے ہوئے غصے سے ماں کی طرف دیکھا اور منہ پھلا کر کہا۔

"آپ تو یونہی باتیں کیا کرتی ہیں امّی۔"

"میں سمجھتی ہوں تیرے دل کی باتیں۔ ہمیں کسی نہ کسی بہانے تو بتائے ہی گی کہ میں جوان ہو گئی ہوں۔"

"پھر وہی امّی — دیکھئے ہم روٹھ جائیں گے۔ ہاں نہیں تو —"

"روٹھ جائیں گے — جیسے روٹھ جانے سے تیرے ڈرتی ہوں نا میں۔"

اور ماں چادر کا پلّو سر پر ڈال کر خیمے سے باہر نکل گئی۔ یہ شاید حقیقت تھی کہ وہ خدیجہ کے روٹھ جانے سے ڈرتی تھی لیکن کہتی نہیں تھی۔ خدیجہ اپنے بابا کی پیاری تھی نا ــــ!

"جھوٹ کہہ رہی ہیں ناامّی ــــ یونہی خواہ مخواہ کو ــــ اُونہہ ــــ تو نہ جانا اُن کی باتوں پر ــــ ہاں تو کیا نام ہے تیرا ــــ"

"چاند بیٹیا۔"

"چاند بیٹیا ــــ؟ یہ کیا نام ہوا؟"

"بس یہی نام ہے ہمالا۔" بچّے نے تتلاتے ہوئے کہا۔

"چاند بیٹیا بھی بھلا کوئی نام ہوتا ہے۔"

"نہ ہوتا تو ہماری امّی ہمیں کیوں چاند بیٹیا کہتیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" خدیجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم تو تمہیں چاند بیٹیا نہیں کہہ سکتے نا!"

"کیوں ــــ؟" بچّے نے سادگی سے پوچھا۔

"ہم کوئی تمہاری ماں ہیں۔ ہم تو تمہاری مالکن ہیں اور تم ہمارے غلام۔"

"غلام ــــ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

"غلام یعنی غلام ــــ ہم نے تمہیں بیس تولے چاندی دے کر خریدا ہے ــــ"

"تو اس سے ہم چاند بیٹیا بھی نہیں بن سکتے۔"

"اُونہوں ــــ اچھا ہم رکھیں تمہارا نام۔"

"کیوں ——"

لیکن خدیجہ نے اس سوال کو سُنا اَن سُنا کرتے ہوئے کہا،

"اچھا تو کیا نام رکھیں تمہارا —— ہاں —— نام —— ٹھیک ہے میسرہ میسرہ ہوگا تمہارا نام —— تمہیں پسند ہے۔"

"یہ انگور ہم کھالیں" بچے نے جس کا نیا نام ابھی ابھی تجویز ہوا تھا، اپنے نام پر مطلقاً توجہ نہیں کی۔ اس کی نگاہیں یکلخت طشت میں رکھے ہوئے انگوروں کے دانوں کی طرف کھنچ گئی تھیں۔ نام کی اہمیت انگوروں کے مقابلے میں کیا ہو سکتی تھی؟

"لیکن ہمارے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں تم نے۔"

"کیا ——؟"

"میسرہ نام کیسا رہے گا تمہارا۔"

"لیکن انگور کھالوں۔"

"پہلے بتاؤ نام کیسا ہے۔ پسند ہے تمہیں۔"

"ہاں بہت —— انگور کھالوں۔"

خدیجہ ہنس پڑی اور انگوروں کا گچھا اٹھا کر اس کے منہ کے سامنے گھمانے لگی۔ بچہ منہ کھولتا، انگوروں پر لپکتا اور خدیجہ گچھا پرے ہٹا لیتی اور ہنس پڑتی۔ یہاں تک کہ بچہ رو دیا ——!

"اچھا بابا لو —— کھولو منہ —— منہ —— ہاں یوں۔"

خدیجہ اسی طرح اپنے غلام میسرہ سے کھیلتی رہی اور کافی وقت گزر

گیا ـــــ،

شام ہونے کو آئی تھی۔ دوسرے لوگوں نے چلنے کی تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ دُور دُور کے شہروں والے تو چل بھی چکے تھے لیکن سردار خویلد ابھی تک سردار حرب کے خیمے سے واپس نہیں آئے تھے۔ عورتیں پریشان ہو رہی تھیں کیوں ـــ کیوں ـــ اور پھر کیوں؟ یہی لفظ بار بار ہر ایک کے ہونٹوں پر آ رہا تھا۔

آخر جب سورج ڈوب گیا اور عرب کی دیر تک لرزنے والی شام شروع ہو گئی، تو سردار خویلد آئے۔ خاصے پریشان معلوم ہوتے تھے۔ خدیجہ کے سوال پر بولے،

"بُرے دن آ رہے ہیں قریشیوں پر۔"

"لیکن ہوا کیا ــــ؟"

"شریف النسب اور افضل ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم لوگ غنڈہ گردی کریں۔"

"آپ بتایئے بھی تو کچھ۔"

"کعبہ کے مجاور ہیں ہم لوگ۔ حاجیوں کی بھوک پیاس اور دیگر ضروریات ہمارے اختیار میں ہیں اور کیونکہ عرب کا ہر قبیلہ حج کرنے کے لئے آتا ہے اس لئے عرب کے ہر قبیلہ کے لوگ ہمارے باوا کے غلام ہیں۔ ہم جو کچھ بھی کر گزریں بس کر گزریں۔ ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں؟"

"لیکن آفت کیا آ گئی ایسی۔"

"شرم کو تو جیسے دھو کر پی گئے ہیں یہ لوگ ــــ شرافت کا مطلب شریفوں کا سا طور طریقہ اور برتاؤ ہوتا ہے۔ غنڈے خواہ کسی بھی خاندان میں سے کیوں نہ ہوں غنڈے ہی ہوتے ہیں۔"

"کمال ہے ــــ آپ بتاتے کچھ نہیں اور ــــ"

"بتاؤں کیا خاک ــــ کسی قریشی نوجوان نے ہوازن کی کسی لڑکی کی توہین کر دی ہے۔ کہتے ہیں بھرے بازار میں شراب پیئے لڑھکتا پھڑکتا جا رہا تھا ــــ سامنے سے وہ لڑکی آ گئی۔ اس نے کوئی فحش سا مذاق کر دیا ہے۔"

"اوہ معبود ــــ پھر ــــ؟"

"پھر کیا ــــ ہوازن والے آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ بھوکے درندوں کی طرح تلواریں نکالے پھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں ایک ایک قریشی کا گلا کاٹ دیں گے اگر اس قریشی نے معافی نہ چاہی تو ــــ"

"پھر ــــ؟"

"پھر دہی پھر ــــ؟ پھر کیا ــــ؟ پھر لڑائی اور کیا۔"

"تو معافی کیوں نہیں منگوا دی جاتی اس سے۔"

"دماغ خراب ہے تم لوگوں کا ــــ قریش کا ایک نوجوان اور ہوازن والوں سے معافی مانگے۔ یہ کبھی ہوا بھی ہے۔"

"لیکن زیادتی تو قریشی ہی کی تھی۔"

"زیادتی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم لوگوں کی گردن مار دی جائے اگر وہ شرافت سے مان گئے تو مان گئے ورنہ اُن کی تلواریں ہماری تلواروں

سے ٹکرائیں گی۔"

"تو جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا آپ لوگوں نے؟"

"ابھی کہاں — سردار عبدالمطلب یہاں نہیں ہیں اور کئی قریشی سردار موقع پر موجود نہیں۔ اس لئے کوئی فیصلہ کن مشورہ نہیں ہو سکتا۔ مکہ پہنچ کر دارالندوہ میں یہ مقدمہ پیش ہو گا — ہماری طرف کے دو آدمی بھی زخمی ہو چکے ہیں۔"

"تو لڑائی ہوئی۔"

"بتایا تو ہے تم لوگوں کو — پھر وہی خواہ مخواہ کا سر کھاتی ہو۔"

"لیکن آپ نے یہ تو نہیں بتایا کہ لڑائی ہوئی۔"

"ارے بھئی — ہوازن کی اس چڑیل کو اس شرابی گدھے نے چھیڑ دیا نہ جانے کیا اناپ شناپ بکواس کی۔ اس نے چلا کر اپنے قبیلے کی دہائی دی ادھر جب چمکتی تلواریں دیکھیں تو ان قریشی صاحب کا نشہ بھی ہوا ہرن — انہوں نے قریش والوں کو پکارا۔ دو چار اُدھر اِدھر اُدھر کہیں ہوں گے۔ جھڑپ ہو گئی۔ ہماری طرف سے دو آدمی زخمی ہوئے اور ہوازن والوں میں سے کسی کو خراش تک نہیں آئی۔ اتنے میں سردار حرب کو خبر ملی۔ وہ بیچارے بھاگے گئے اور معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ اب دارالندوہ میں فیصلہ ہو گا۔"

دارلندوہ کی پتھریلی چار دیواری ہوازن کے نام سے گونج رہی تھی ـــ!
لیکن ہوازن اور قریش کے اس جھگڑے پر غور و خوض میلے سے لوٹتے ہی شروع نہیں ہوا اور اس کی وجہ سردار حرب اور سردار عبدالمطلب کا وہ تنازعہ تھا جو ذیقعد کا چاند دیکھنے کے موقع پر پیدا ہو گیا تھا۔

میلے سے لوٹنے کے دوسرے دن صحن کعبہ میں قریشیوں کا ایک عام جلسہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جلسہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا جو عکاظ کے میلے میں ہوازن والوں کے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ اس قریشی نوجوان کو طلب کیا جائے اور اس سے بنائے مخاصمت کی تفصیلات معلوم کی جائیں سردار حرب نے کھڑے ہو کر کعبہ کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی،

"یا معشر قریش ـــــ میں خدا کے اس معزز اور محترم گھر کی قسم کھا کر کہتا

ہوں کہ میں بنی ہوازن اور بنو فہر کے اس جھگڑے کا اس وقت تک فیصلہ نہ ہونے دوں گا جب تک میرے اور عبدالمطلب کے جھگڑے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔"

عبدالمطلب نے پورے اطمینان سے کہا،

"شاید ابن امیہ کا اشارہ میرے اس دعویٰ کی طرف ہے جو میں نے چاند کے بارے میں کیا تھا۔ میں اب بھی اسی دعویٰ پر قائم ہوں اور قسمیہ اعلان کرتا ہوں کہ ذیقعد کا چاند سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا۔"

"مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے دادا کے بھائی کا بیٹا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس وقت بھی یہی جھگڑا اٹھا تھا اور خود ابن ہاشم نے اس کا یہ حل پیش کیا تھا کہ ہبل کے تیروں سے فال لی جائے۔ تو خدائے قدوس فیصلہ کر دے گا کہ سچا کون ہے اور دستار فضیلت کس کو ملنی چاہیے۔"

"میں اپنے اس ارادے پر اب بھی قائم ہوں ابن امیہ ——— قوم کو اختیار ہے۔"

چنانچہ اسی شام تمام سردارانِ قریش کے سامنے ہبل کے تیروں سے فال لی گئی۔ ایک دفعہ نہیں سردار حرب کی تسلی کے لئے تین دفعہ لیکن نتیجہ ہر بار وہی نکلا۔ خدائی فیصلہ سردار عبدالمطلب کے حق میں تھا۔

اس پر حرب کو دیکھ دیکھ کر لوگوں نے بلند قہقہے بھی لگائے تھے اور ان سب میں پیش پیش نفیل بن عبدالعزیٰ تھے جو اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر ہنس رہے تھے۔ انہوں نے محض مسکراہٹ سے جگمگاتی آنکھوں کے ساتھ حرب کی طرف دیکھا۔ بعضوں نے چلتے ہوئے فقرے اڑائے اور بعض ہمدردوں اور

دوستوں نے ہمدردی کے چند کلمات کہے اور اس واقعہ کو بھول جانے کا مشورہ دیا لیکن حرب کو اس مشفقانہ، برادرانہ اور دوستانہ مشوروں میں بھی زہر بل کھاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے حرب بہت پریشان ہو گیا اور یہی وجہ تھی کہ اراکینِ مجلس اصل سوال پر غور کیے بغیر اٹھ گئے۔

چار دن گزر گئے۔

لیکن ان چار دنوں میں کسی کو سکون نہیں ملا۔ قریش کے گھر بھٹی کی طرح جلتے رہے۔ وہ لوگ جو زخمی ہوئے تھے۔ انتقام لینے کے لیے اتنے بے چین نہ تھے۔ جتنے وہ لوگ جو محض زبان سے زخمی ہوئے تھے۔ انہیں رہ رہ کر قریش اور قریش کے مختلف خاندانوں کے خلاف کہی ہوئی باتیں یاد آتیں اور وہ ان درندوں کی طرح بل کھا رہے تھے جنہیں جنگلے میں بند کر دیا جائے اور شکار کو ان کے سامنے کھلا چھوڑ دیا جائے۔

یہ سب کچھ نہ ہوتا تو شاید دارالندوہ کی دھواں دھار تقریریں کئی دن اور سننے میں نہ آتیں لیکن ان باتوں نے عورتوں کو بھی انتقام پر مائل کر دیا تھا اور حرب کے گھرانے کی عورتیں حرب کو طعنے دینے پر تل گئی تھیں۔ اس لیے حرب کو مجبوراً اپنی ہار کی شرم بالائے طاق رکھ کر میدان میں اترنا پڑا۔

یہ گھر جس کا نام دارالندوہ ہے قریش کے اس بلند اقبال اور باہمت سردار نے بنوایا تھا جس کا نام قصی تھا۔ قصی سے پہلے کعبہ کی تولیت پر خزاعہ قابض تھے۔ قصی نے کعبہ کے آخری متولی حلیل بن حبشیہ الخزاعی کی بیٹی حبی سے شادی کر لی تھی اور اس کے بطن سے اس کے چار بیٹے عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزیٰ

اور عبد قصیٰ پیدا ہوئے تھے۔ عبدالمناف کا بیٹا عبد شمس امیہ کا باپ اور سردار حرب کا دادا تھا۔ عبد مناف کا دوسرا بیٹا ہاشم تھا جو عبدالمطلب کا باپ تھا۔

تو خیر! مطلب یہ ہے کہ قصیٰ سے پہلے کعبہ کے متولی بنو خزاعہ تھے قصیٰ کا خسر جب بوڑھا ہو گیا تو قصیٰ کو خیال آیا کہ کیوں وہ کعبہ کا متولی نہ بن جائے لیکن بنو خزاعہ کی تعداد اُن دنوں میں قریشیوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھی اور بظاہر نظر نہیں آتا تھا کہ قصیٰ کے خواب پورے ہو سکیں گے۔ لیکن قصیٰ نے اپنے رضاعی بھائی زراح بن ربیعہ کو اپنی مدد پر پکارا۔ زراح بن ربیعہ کے دوسری ماں سے تین اور بھائی تھے۔ اُس نے اُن کو بھی ساتھ لیا اور دوسرے بنو قضاعہ کو بھی اپنے ساتھ ملایا جنہوں نے انہیں مدد دینے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ یہ لاؤ لشکر عین حج کے موقع پر بنو خزاعہ پر ٹوٹ پڑا اور انہیں نکال کر تولیت کعبہ قصیٰ کے سپرد کر دی گئی۔

اس کے بعد قصیٰ کی عزت و شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اُس نے دوسرے قریشی خاندانوں کو جو مکہ سے دور پڑے ہوئے تھے یا مکہ ہی میں حرم سے دُور دُور بکھرے ہوئے تھے جمع کیا اور ان میں خزاعہ کے مکانات تقسیم کر دیئے۔ ان میں ایک مکان کو مشورے وغیرہ کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اسی کا نام دارالندوہ ہے۔

قصیٰ کی زندگی میں کعبہ کے متعلق تمام عہدے قصیٰ ہی کی ذات سے وابستہ رہے لیکن جب قصیٰ بہت ضعیف ہو گیا تو اُس نے اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن قصیٰ کی وفات کے بعد عبدالدار کے چھوٹے

بھائی عبد مناف کی اولاد میں تولیت کعبہ پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ عبد مناف والے چاہتے تھے کہ وہ کعبہ کے متولی قرار دیئے جائیں کیونکہ وہ اپنے چچا عبدالدار کی اولاد سے کہیں زیادہ افضل اور اشرف ہیں لیکن عبدالدار والے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تولیت خود قصیّ نے انہیں دی ہے۔ اس لئے وہ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔ معاملہ بڑھا۔ جھگڑے نے نزاع کی صورت اختیار کر لی اور قریش کے مختلف خاندان دو حصوں میں بٹ گئے۔ بنو اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیّ بن زہرہ بن کلاب جو قصیّ کے بھائی کی اولاد تھے بنی تیم بن مرہ بن کعب اور بنی حرث بن فہر بن مالک بن نضر، عبد مناف والوں کے ساتھ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عبد مناف والوں کو خانہ کعبہ کا متولی ہونا چاہیئے۔

لیکن اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ عبدالدار والوں کے ساتھ تھا۔ ان میں بنی مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب، بنی جمح بن عمرو بن ہصیص بن کعب اور بنی عدی بن کعب شامل تھے۔ ان خاندانوں کا یہ فیصلہ تھا کہ بنو عبدالدار ہی کعبہ کے متولی رہیں۔ کیونکہ خود قصیّ نے ان لوگوں کو اپنی گدی پر بٹھایا تھا۔

جنگ شروع ہو گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ خاندان کی یہ لڑائی خطرناک صورت اختیار کرتی اور دونوں طرف کے لوگ زیادہ تعداد میں زخمی ہوتے یا موت کے گھاٹ اترتے صلح ہو گئی اور وہ تمام عہدے جو کعبہ کے متعلق تھے اور جو کبھی صرف قصیّ بن کلاب کی واحد ذات میں مرتکز ہو گئے تھے آدھے آدھے بانٹ لیئے گئے۔ حاجیوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور اوڑھنے

بچھونے کا انتظام بنی عبد مناف کے حصے میں آیا اور حجابت، لواء اور ندوہ بنی عبدالدار میں بدستور قائم رہے۔

یہی وجہ تھی کہ آج دارالندوہ میں سردار حرب صدر نشین تھے اور ان کے سر پر قریش کا سیاہ رنگ کا نشانِ جنگ لہرا رہا تھا۔ سردار حرب کے سامنے کھجور کے پتوں کی چٹائیاں بچھی تھیں اور ان پر قریش کی دوسری شاخوں کے شیوخ اُلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ بعض اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے اور بعض نوجوان محض تجسس کے زیر اثر جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے دارالندوہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

لیکن دارالندوہ کی کارروائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کیونکہ مجرم ابھی تک دارالندوہ میں نہیں آیا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ آپس میں زیر لب باتیں کر رہے تھے اور یہ زیر لب گفتگو اب خاصی بلند آہنگ بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی ——

سردار عبدالمطلب اپنے بیٹوں سمیت سردار حرب کے دائیں طرف بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سوچ رہے ہوں لیکن اُن کے بیٹے آپس میں اشاروں، مسکراہٹوں اور آنکھوں کی عجیب حرکتوں سے اس اجتماع میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

بالآخر مجرم کے قبیلے کے چند معززین مجرم کو اپنے حلقے میں لے کر دارالندوہ میں داخل ہوئے۔ وہ بلند آہنگ بھنبھناہٹ جو زیر لب گفتگو کی وجہ سے مکان کی چار دیواری میں گونج رہی تھی۔ یکدم خاموشی میں ڈوب گئی۔ ہر

نگاہ جیسے کسی مقناطیسی کشش کے زیرِ اثر کھنچ کر آنے والوں پر مرکوز ہو گئی۔ سردار عبدالمطلب نے بھی متانت کی آہستگی سے سر اٹھایا اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجرم کو دیکھا۔ چھریرے بدن کا نوجوان خوبصورت آدمی جس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں جس کی انگلیاں محض عصبی انتشار کو روکنے کے لئے عبا کو توڑ مروڑ رہی تھیں۔ اور جس کی نگاہیں مسکراتی ہوئی، طعن کرتی ہوئی، ہمدردی کا اظہار کرتی ہوئی آنکھوں کے لاتعداد جوڑوں کے بوجھ تلے جھکی جا رہی تھیں، مکان کی ڈیوڑھی پر کھڑا تھا جیسے آنے کی اجازت چاہتا ہو۔ اس کے ساتھ آنے والے معززین نے اپنی اچٹتی ہوئی نگاہوں سے جن میں بناوٹی غرور اور شکست خوردہ تمکنت جھلک رہی تھی۔ ہر ایک کو دیکھا، حاضرین مجلس خاموش تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی نگاہیں بلند آواز سے نہ بول رہی ہوں۔

سردار عبدالمطلب نے آنے والوں کا جائزہ لمحے کے تھوڑے سے حصے میں لے لیا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے حاضرین مجلس کی طرف دیکھا، لیکن ہر چہرے پر طعن، تمسخر اور طنز کندہ تھی۔ انہوں نے حالات بکھرنے سے پہلے سمیٹنے کی کوشش کی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا،

"عبدیغوث! میں تمام قریشیوں کی طرف سے دارالندوہ میں تمہارا استقبال کرتا ہوں۔ چلے آؤ۔"

بوڑھے عبدیغوث کے چہرے پر بکھری ہوئی جھریوں نے اپنے آپ کو سمیٹنے کی ایک ضعیف سی کوشش کی۔ آپ اس کوشش کو مسکراہٹ کہہ لیجئے لیکن وہ یقیناً مسکراہٹ نہیں تھی۔ شاید عبدیغوث اپنے دل میں بہت سے ارمان

لے کر آیا تھا اور اُن ارمانوں نے اس مسکراہٹ کی صورت میں آخری ہچکی لی تھی۔
لیکن مرتے ہوئے ارمان کسی مادی شکل میں اپنا اظہار نہ کر سکے اور عبدیغوث دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ بیٹھے ہوئے لوگوں کے کندھوں پر سہارا لیتا، پھیلے ہوئے پاؤں اور سمٹے ہوئے گھٹنوں سے بچتا عبدالمطلب کے قریب آ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ سمٹ گئے اور عبدیغوث اور اس کے ساتھیوں کو جگہ دے دی گئی۔
مجلس پر ایک دفعہ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ان میں سے ہر ایک بہت کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بالآخر سردار عبدالمطلب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا، ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا کی اور سوچتی ہوئی آنکھوں سے عبدیغوث کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا،
"عبدیغوث تشریف لے آئے ہیں"
اور سردار حرب کو متوجہ کر کے بولے،
"میرے خیال میں جس کام کے لئے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، اُسے مزید تاخیر کے بغیر شروع کر دیا جائے"
سردار حرب نے پہلو بدلا،
"قریش کی عظیم الشان روایات کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ ہمارا نوجوان جسے ابنانِ ہوازن مجرم کا نام دیتے ہیں سچائی پر سے پردے ہٹانے

میں ہماری مدد کرے گا اور یقیناً کوئی ایسی بات نہیں کہے گا جس سے قبیلۂ قریش واقعات کا غلط اندازہ کر کے کوئی ایسا اقدام کرے جس کا نتیجہ ہم سب کے لئے اچھا نہ ہو۔"

"یقیناً ——— یقیناً" کا غلغلہ بلند ہوا۔

"اس لئے" سردار حرب نے مسکراتے ہوئے کہا، "میں عبدیغوث کے پوتے پر تمام قریشیوں کی طرف سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ابنانِ ہوازن نے جو الزام اس پر عائد کیا ہے درست ہے؟"

مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کی نگاہیں عبدیغوث کے پوتے کے ہونٹوں کے ساتھ جیسے سل گئی تھیں۔ ہر کان جواب کے انتظار میں سماعت کی آخری طاقتوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

عبدیغوث کے پوتے کے ہونٹ ہلے لیکن آواز پیدا کئے بغیر پھر سکوت میں آ گئے۔ اس کا سر آہستہ آہستہ جھک گیا اور اُس کی انگلیوں کی نامعلوم لرزش فرش پر بچھے ہوئے بوریئے کے تنکے کھینچنے میں صرف ہونے لگی۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد عبدیغوث نے کہا،

"میرے پوتے ———! قوم تمہارے جواب کی منتظر ہے۔"

پوتے نے دادا کی مرجھائی ہوئی آنکھوں کو اپنی چھنتی ہوئی آنکھوں سے چھیڑا۔ لیکن دادا نے اپنا مغرور سر اٹھا کر کہا،

"تم میرے پوتے ہو اور ہم قریشی ہیں۔ قوم تمہیں سچائی کی دعوت دے

رہی ہے۔ جرأت سے کام لو اور جواب دو۔"

حاضرینِ مجلس میں کانا پھوسی پھر سے بھنبھنانے لگی۔ دو ایک دبے گھٹے قہقہے بھی فضا میں تھرتھرائے۔ عبدیغوث کے پوتے نے آنکھیں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا،

"ہاں ــــ!"

"بلند آواز سے میرے لختِ جگر بلند آواز سے تاکہ قوم کو یقین ہو جائے کہ تم ڈرنے والے نہیں ہو۔"

"میں نے سُن لیا" سردار حرب وقت پر مجرم کے آڑے آئے۔

"یا محشرِ قریش! عبدیغوث کا پوتا اقبالِ جرم کرتا ہے۔"

"تو اُس نے اس لڑکی کے ساتھ واقعی فحش مذاق کیا تھا" مجلس کے وسط میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔

"میں اس وقت شراب پیئے ہوئے تھا۔ مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔"

"اس لڑکی سے تمہیں محبت ہے؟"

"میں نے آج سے پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"اگر ابنانِ ہوازن راضی ہو جائیں تو تم اس لڑکی سے شادی کر سکو گے" نوجوان نے سوال کرنے والے کو چونکی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ ایک ثانیئے کے لئے سوچا ـــ جیسے اپنے دل کو ٹٹول رہا ہو اور پھر بولا،

"نہیں ــــ!"

اس کے لہجے میں ایسی گھبراہٹ تھی جیسے وہ کوئی چوری کرتے پکڑ

لیا گیا ہو۔

"کیوں ؟"

"کیوں نہیں ــــ ؟"

"اس کی وجہ ــــ !" سوالات بھادوں کے چھینٹے کی طرح برس پڑے ہیں ــــ" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سوچتی ہوئی آنکھوں سے سوال کرنے والوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے پٹھوں اور بازوؤں کی لرزش سے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ہمت کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے جمع کر رہا ہے اور پھر یکدم وہ بولا،

"میں اس کے سامنے نہیں جا سکوں گا۔ عمر میں کبھی نہیں۔ میں نے فعل ہی ایسا کیا ہے۔ مجھے شرم آئے گی۔"

ٹوٹے بکھرے فقرے جن میں کوئی رابطہ نہیں تھا۔ آئینے کے ان ٹکڑوں کی طرح اس کے ہونٹوں سے گر پڑے جو پتھر کی ایک ہی ضرب میں چکنا چور ہو جائے۔

حاضرین مجلس نے حیرت بھری آنکھوں سے دیکھا اور ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے تکنے لگے۔

سردار عبدالمطلب کا ہاتھ تیزی سے اٹھ کر اس کے کندھے پر رک گیا۔

"شاباش" انہوں نے کہا "قریشیوں کو تم ایسے نوجوانوں پر فخر ہے"

عبد یغوث نے کانوں کے ارد گرد بھنبھناتی ہوئی ستائش کو فخریہ

انداز میں دیکھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا،

"سردارِ قریش ــــ! مجھے اپنے پوتے پر ہی نہیں بلکہ اپنی قوم قریش پر ناز ہے۔ سوالات جو قوم نے کئے آپ نے سُن لئے اور ان کے جواب جو میرے پوتے نے قوم کے سامنے پیش کئے وہ بھی آپ کے سامنے ہیں۔"

"لیکن" سردار حرب نے کہا، "ان تمام سوالات اور جوابات سے ہم صرف اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کے پوتے نے نشے کی حالت میں فی الواقعہ بنو ہوازن کی ایک دوشیزہ کی بے عزتی کی۔ اس کے آگے ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ ہوازن کی اس دوشیزہ نے اپنے قبیلے والوں کی دہائی دی قریب تھا کہ بنو ہوازن اور قریش میں تلوار چل جاتی کہ میں موقع پر پہنچ گیا۔"

"ان سب واقعات سے مجھے انکار نہیں۔" عبد یغوث نے جواب دیا، "کیونکہ میں خود موقعہ پر موجود تھا اور میں اس بات کا عینی گواہ ہوں کہ سردار حرب نے میدانِ عکاظ کی بیکار خونریزی کو اپنے تدبّر سے سنبھال لیا۔"

"میرے خیال میں" سردار عبدالمطلب نے کہا، "ان تمام جزئیات کو دہرانا تحصیل حاصل ہوگا۔ کیونکہ ان سب باتوں کا ہم سب کو علم ہے۔ سوال یہ ہے کہ بنو ہوازن والے سخت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ اسے اپنے قبیلے کی شدید توہین سمجھتے ہیں اور عرب کے پُرانے دستور کے مدِنظر اگر حق و انصاف اور ٹھنڈے دل سے اس معاملہ پر غور کیا جائے تو ہم بھی یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ قبیلہ قریش کے ہاتھوں بنی ہوازن کی سخت توہین ہوئی

ہے۔"

مجلس میں مبہم سا غلغلہ بلند ہوا۔ کئی اور جگہوں سے تعجب اور غصّے کے اشارے ہوئے اور ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا،

"تعجب ہے کہ سردار قریش قریشیوں کے مقابلے میں بنو ہوازن کی ایک ادنیٰ لڑکی کو اس طرح آسمان پر چڑھا رہے ہیں۔"

"سردار قریش کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ خانۂ خدا اور دیوتاؤں کے عظیم ترین معبد کعبہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے قریش والوں کو عرب بھر کی سرداری حاصل ہے اور ہمیں عرب کے سردار ہونے پر فخر ہے۔"

"عبدالمطلب قریش کی بے عزّتی کر رہے ہیں۔"

غم و غصّہ کی اس عام لہر کو سردار عبدالمطلب نے بڑی بردباری اور متانت کے ساتھ برداشت کیا اور بالآخر اسی سنجیدگی اور خوداعتمادی کے ساتھ کہا۔

"مجھے بھی قریشی ہونے پر اتنا ہی فخر ہے جتنا آپ لوگوں کو — اور شاید اس سے زیادہ۔ کیونکہ میں رب کعبہ کی مہربانی سے اُن سرداروں کا بلاواسطہ جانشین ہوں جن کی تلواروں نے اس عظیم الشان عزّت کو اغیار کے ہاتھوں سے چھین کر ہم تک پہنچا دیا لیکن اس فخر اور اس غرور کا مطلب یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم اُن لوگوں کی عزّت اور ناموس پر حملہ کر دیں جو ہمیں اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں۔ بنو ہوازن کی عفت مآب دوشیزہ ہماری اپنی لڑکی ہے۔"

"بڑھاپا بول رہا ہے" ایک آواز آئی۔

"جوانی میں آپ نے کیا کچھ نہیں کیا" دوسرے نے ڈپٹ کر کہا۔

"میری جوانی کی لغزشیں آپ لوگوں کی جوانی کو گناہ میں لپیٹ دینے کا معقول بہانہ نہیں بن سکتیں" متین آواز صرف چار دیواری ہی میں نہیں بلکہ دلوں میں گونج رہی تھی "اگر میں نے گناہ کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھی اسی دلدل میں پھنس جائیں بلکہ آپ کو تو میری زندگی سے عبرت لینی چاہیئے"

"لیکن ان سب نیک ارادوں کا مطلب کیا ہے۔ آپ کس طرف ہمیں لے جانا چاہتے ہیں" سردار حرب نے تمسخر کے انداز میں سوال کیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نوجوان نے جس اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اس قابل فخر جرأت کا نباہنا ہم سب کا فرض ہے"

"پھر وہی مبہم بات کہی سردارِ قریش نے" حرب نے ہنس کر کہا۔

"مبہم نہیں ہے اگر آپ اسے سمجھنا چاہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عبدیغوث کا نوجوان پوتا اس بات کا اقرار کرتا ہے اور اسے اپنے کیے پر افسوس ہے"

"اس کے لیئے ہم سب اس نوجوان کے تہ دل سے شکر گزار ہیں لیکن اس کا نتیجہ"

"یہی کہ اسی جرأت اور ایمانداری کے ساتھ بنو ہوازن والوں کے سامنے اس جرم کا اقرار کر لیا جائے"

"اور ــــ" ایک غضب ناک آواز گونجی۔

"اور بنو ہوازن سے معافی مانگ لی جائے۔"

"خاموش ــــ!" عبدلغوث تڑپ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ "کعبہ کے اُن دیوتاؤں کی قسم جن کی چوکھٹ پر میرے باپ دادا کے سجدے نثار ہوتے رہے ہیں ــــ یہ ہرگز نہیں ہو گا ــــ"

"کبھی نہیں ہو گا۔"

تلواریں میانوں سے مچل مچل کر نکل پڑیں۔ جس طرح سوکھے درختوں کے جنگل میں بادِ صرصر کا جھونکا گزر جائے ویسی ہی کھنکھناہٹ دارالندوہ کی دیواروں میں گونج اٹھی۔

"اگر آپ قوم سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو اپنے بیٹوں سمیت علیحدہ ہو سکتے ہیں۔" سردار حرب نے کہا۔

"ہمیں سردار حرب کے اس جذبے سے اتفاق ہے۔" آوازیں بلند ہوئیں ــــ!

"میرے الفاظ کو وہ معنی دیئے جا رہے ہیں جن کا مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے قوم سے علیحدہ ہونے کی نہ خواہش ہے نہ میں اپنے آپ کو بنو ہوازن کی وجہ سے قربان کرنا چاہتا ہوں لیکن دارالندوہ میں جمع ہونے کا مطلب جو میرے دادا نے سمجھا تھا یہی تھا کہ قوم کے ہر آدمی کو اپنی رائے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔ میں نے اسی حق کو برتا ہے۔ قوم کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ میرے مشورے کو قبول کرے یا مسترد کر دے۔"

"وہ مشورہ جس میں قوم کو بزدلی سکھانے کا زہر ملا ہو دارالندوہ کی دیواریں

برداشت نہیں کر سکتیں۔"

"لیکن وہ جس میں انسان کے بنیادی جذبات پوشیدہ ہوں۔ یقیناً اس مقدس چار دیواری میں کہہ دینے کے قابل ہے۔"

"ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے سردار عبدالمطلب! آپ خاموش رہیئے۔"

یہ ایک نوجوان کی آواز تھی جسے سن کر لوگ سناٹے میں آ گئے۔ دارالندوہ میں کئی بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے بچپن میں دارالندوہ کو بنتے دیکھا تھا جنہوں نے قصی بن کلاب کو قریش کے دل و دماغ پر حکومت کرتے دیکھا تھا اُس دن سے لے کر آج تک ندوہ کی چار دیواری نے ایسا کلام نہیں سنا تھا نوجوان اُن دنوں میں بھی ہوتے تھے۔ پُرجوش خون اُن دنوں میں بھی ایسی ہی شدت اور اسی بے پروائی سے رگوں میں گردش کرتا تھا لیکن ایسی گستاخی کبھی کسی بوڑھے کی شان میں کسی نوجوان نے نہیں کی تھی۔ اور پھر بوڑھا بھی معمولی بوڑھا نہیں قریش کا سردار جس کے دس بیٹے تھے اور جو زندگی کے ہر موڑ کو خوب اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔

لوگوں کو ڈر تھا کہ عبدالمطلب کے بیٹے، کڑیل جوان — ابھی تلواریں سونت لیں گے اور دارالندوہ دارالحرب بن جائے گا۔ خون، موت —!

اور ایسا ہو بھی جاتا۔ کیونکہ عبدالمطلب کے بیٹوں کے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر تلوار کے دستوں پر جا چکے تھے۔ تلواریں ایک آدھ انگل میان سے باہر بھی آ چکی تھیں۔ لیکن عبدالمطلب کی گرہ دار انگلیوں نے اسی تیزی سے

بیٹوں کے گھٹنے دبا دیئے۔ مسکرا کر اپنی بردباری کا ثبوت دے دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں مطمئن کر دیا۔

عبدالمطلب کی یہ بہت بڑی فتح تھی۔ اگر تلواریں نکل آتیں تو بہت ممکن تھا کہ مجلس کا رنگ کچھ اور ہو جاتا۔ لیکن اُن کی متانت اور خاموشی نے ایک جادو سا کر دیا۔ مجلس میں ایک آدمی نے کہا،

"سردار کی شان میں ایسی گستاخانہ بکواس غالباً قریش کے سوا اور کسی قبیلے میں نہیں پائی جا سکتی۔"

"سمجھ میں نہیں آتا آج کل کے نوجوانوں کو ہو کیا گیا ہے —— اور رب کعبہ کی قسم یہ ہم لوگوں سے زیادہ بہادر بھی نہیں ہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"شرم ہونی چاہیئے۔" تیسری آواز آئی۔

اور خاموشی کا حکم دینے والا نوجوان خود ہی اتنا شرمندہ ہوا کہ ندوہ سے باہر چلا گیا۔ لیکن اس چھوٹے سے واقعہ نے دارالندوہ کی فضا کو صاف کر دیا۔ وہ تلخی جو چند منٹ قبل یہاں کے ذرّے ذرّے میں سمائی ہوئی تھی بالکل غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ شرمندگی کا احساس جیسے ہر دل میں ڈوب گیا تھا۔ لوگ خواہ مخواہ سردار عبدالمطلب کا مشورہ طلب کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

"معافی مانگنے کا تو خیال چھوڑیئے سردار قریش۔" عبد یغوث نے کہا، "کوئی اور طریقہ بتایئے جو قابلِ عمل ہو۔"

"غور کیجئے —— کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔" عبدالمطلب نے جواب دیا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز میں ویسی خود اعتمادی پیدا نہیں کر سکے تھے۔

"دوسرا راستہ" سردار حرب نے کہا "جنگ ہے۔ اگر معافی نہیں تو ابنانِ ہوازن جنگ کرنے پر مائل ہیں۔"

"صرف ابنانِ ہوازن ہی نہیں ہم بھی، ہماری تلواریں ان لوگوں کے خون کی پیاسی ہیں جنہوں نے کئی قریشیوں کو زخمی کیا۔"

"قریشی نوجوان انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ صرف سردارانِ قریش کے اشارۂ ابرو کی ضرورت ہے۔"

"آپ کی کیا رائے ہے سردارِ قریش" ان میں سے ایک نے سردار عبدالمطلب سے پوچھا۔

"میں قوم سے علیحدہ نہیں ہوں۔ قوم جس طریقِ عمل پر متفق ہو گی میں اور میرے بیٹے اس پر عمل کریں گے۔"

"اس میں تو کسی قسم کا شک نہیں لیکن ابھی تک قوم کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ پائی ہے۔ آپ کی رائے کی ضرورت ہے۔"

"کیا قریشی نوجوان جنگ کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے" عبدالمطلب نے پوچھا۔

"اگر کوئی ایسا راستہ نکل آئے جس سے ہماری عزتِ نفس کو دھکا نہ لگے تو ہم جنگ سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔"

"یہ تم لوگوں کی کمزوری ہے" عبدیغوث نے گرج کر کہا "اپنی کمزوریاں کو خوبصورت الفاظ کے پردے میں چھپانا چاہتی ہے قریش کی بہادر قوم قریش کیا تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں اور اس کے نیزوں کی تیز انیاں ٹیڑھی

ہو کر بیکار ہو گئی ہیں۔ اس لئے وہ رحم و کرم اور دریا دلی کی بڑی بڑی باتیں کہہ کر ہم بڈھوں کو بے وقوف بنانا چاہتی ہے۔"

"لیکن عبد یغوث!" وہی سنجیدگی، وہی خود اعتمادی ایک دفعہ پھر بوڑھے عبدالمطلب کی کراری آواز میں پیدا ہو گئی تھی "جنگ جہاں بہادری کا نشان ہے وہاں تباہی کا پیش خیمہ بھی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو تلواریں آج قریش کی میانوں سے نکلیں گی کس وقت اور کب واپس جا سکیں گی اور یہ عورتیں جو آج دارالندوہ کو رونق بخش رہی ہیں دوبارہ یہاں جمع ہو سکیں گی۔"

"اس خطرے کی وجہ سے ہم چوڑیاں پہن کر گھروں میں بیٹھ جائیں سردارِ قریش؟"

"عزتِ نفس کو تلوار ہی نہیں اور بھی بہت سی باتیں بچا سکتی ہیں۔ تم بنو ہوازن سے معافی مانگنا نہیں چاہتے؟"

"صرف یہی نہیں سردارِ قریش — قریشی گھرانوں میں سے دن رات اُن زخمیوں کی آہ و بکا بلند ہوتی ہے جو میدان عکاظ میں بنو ہوازن کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ قریشی عورتیں اُن گالیوں، فحش اور گندی گالیوں — کو نہیں بھول سکیں جو جلتے ہوئے سیسے کی طرح اُن کے کانوں میں انڈیل دی گئی تھیں۔"

"اور آپ کے خیال میں یا عبد یغوث" سردار عبدالمطلب نے کہا "اس ساری بے عزتی کا یہ علاج ہے کہ زخمیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے گھرانوں کا بھی اضافہ کر دیا جائے جن کی عورتیں اپنے جوانوں پر شب و روز ماتم کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ اب تو صرف زخمیوں کی آہ و بکا کا

ضرور ہے ابن عم، اگر جنگ شروع ہو گئی تو بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے نالہ و فریاد سے مکہ کا آسمان پھٹ پڑے گا۔"

"سردار عبدالمطلب کی زبان سے ایسی باتیں سن کر مجھے تعجب ہو رہا ہے۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے کان ایسی آوازوں سے ناآشنا ہیں؟ ہم ڈر جائیں گے ان چیزوں سے؟"

"اگر مجبوری ہوتی اور کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہ دیتا تو میں بھی شاید جنگ ہی کا مشورہ دیتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر اقدام کرنے سے پہلے معاملے کے چپ و راست پر اچھی طرح غور کر لینا ضروری ہوا کرتا ہے۔"

"اس میں غور کرنے کی کیا بات ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردار قریش اس بات کو بے اعتنائی کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ مجھے یہ شک ہوتا جا رہا ہے کہ اگر آپ کے نزدیکی رشتہ دار اسی طرح زخمی ہو کر آتے جس طرح میرے نزدیکی رشتہ دار آئے ہیں تو غالباً آپ کی رائے یہ نہ ہوتی جو اب ہے۔"

"عبد یغوث" سردار عبدالمطلب کی آواز میں پہلی دفعہ غصے کی جھلک تھی، "دوسرے لفظوں میں تم مجھے خویش پرست اور بے ایمان کہہ رہے ہو۔"

"جو شک میرے دل میں پیدا ہوا ہے میں نے اُسے ایمانداری سے ظاہر کر دیا ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے جو تمہارے شک نے تمہیں سمجھایا ہے تمہیں معلوم ہے بنو ہوازن کے کتنے قبیلے ہیں۔"

"نہیں ـــــــ!"

"تمہیں معلوم ہے بنو ہوازن کے کتنے حلیف ہیں؟"

"میں یہ بھی نہیں جانتا تھا!"

"جانتے ہو تمہارے یہ سب کچھ نہ جاننے کا مطلب کیا ہے؟"

"کیا ـــــــ!"

"یہی کہ تم دشمن کی طاقت کو نہیں سمجھے ہو اور محض اپنے ذاتی جوش و خروش اور انتقام کے خیال سے پوری قوم کو ایک ایسی جنگ میں دھکیل دینا چاہتے ہو جس کے نتیجے کا تم کو علم نہیں ہے۔ اپنے جوش کو ٹھنڈا ہونے کا موقع دو۔ وعدہ بنو اپنے زخمیوں کے زخموں کو بھرنے دو۔ اتنے میں ہم سردار نفیل بن عبدالعزیٰ کے ذمے یہ فرض عائد کرتے ہیں کہ وہ ہوازن کے قبیلوں اور اُن کے حلیفوں کا جائزہ لیں۔ اپنے حلیفوں اور اپنے قبیلوں کا بھی جائزہ لیا جائے اور پوری جانچ پڑتال کے بعد قوم کو اس اندھے کنوئیں کی طرف دعوت دی جائے جس سے تمہارے انتقام کی بھڑکی ہوئی آگ سرد ہو سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ مجھے سالہا سال تک انتظار کرنا پڑے گا!"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک مجھے ـــــــ قریش کا سردار ہونے کی حیثیت سے ـــــــ یہ پوری تسلی نہ ہو جائے کہ میری قوم ایک فردِ واحد کے ذاتی جوشِ انتقام پر قربان نہیں ہو رہی ہے بلکہ ہم جنگ کریں گے۔ صرف اس صورت میں جب ہمیں جنگ کے نتیجے کا تھوڑا بہت یقین ہوگا۔"

"تعجب اور حیرت مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر رہی ہے سردار قریش — آپ اس اہم معاملے کو ایک فردِ واحد کا ذاتی جوش انتقام کہہ رہے ہیں آپ خود اپنے قول و فعل کے ذمہ دار ہیں لیکن میں نچلا نہیں بیٹھوں گا۔ میں اکیلا بنو ہوازن سے لڑوں گا سردار قریش اور یقین مانئے میں کسی ایک قریشی کو بھی اپنی مدد پر نہیں پکاروں گا۔"

عبد یغوث اٹھنے کو تھا کہ سردار عبدالمطلب نے اُسے پھر بٹھا لیا۔

"تمہارے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ تمہاری عورتوں کے طعنے تمہاری سماعت میں زندہ ہیں۔ اس لئے تم کسی بات پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کر رہے ہو عبد یغوث۔ کچھ دن گزرنے دو۔ تم بھی وہی کہو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"آپ کو وہ اطمینان حاصل ہے جو مجھے نہیں۔"

"قوم سے پوچھو — میرا مشورہ یہی ہے کہ اوّل تو معافی مانگ لی جائے اور اگر معافی نہیں جنگ کرنا ہی ضروری ہے تو اس پر اچھی طرح سے غور کیا جائے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔"

کافی بحث تمحیص کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ قوم کو سوچنے کا پورا موقع دیا جائے۔

۶

ریگستانِ عرب کی لمبی گلابی شام مکّہ کے اونچے نیچے مکانوں پر لرز رہی تھی۔

سردار عبداللہ کے گھر کی سب سے اوپر والی چھت پر آمنہ کھڑی دور روم و شام سے آنے والی سڑک پر آنکھیں جمائے دیکھ رہی تھیں۔ نہ جانے اُن کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ آمنہ بنت وہب کیا سوچ رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں گرم ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات کو چیرتی ہوئی دور سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ایسی کھو گئی تھیں آمنہ بنت وہب اپنے خیالوں میں کہ ننھی کنیز برکہ کے آنے پر بھی انہیں پتہ نہیں چلا۔

برکہ جب سیڑھیوں پر چڑھی تھی تو خاصے جوش میں معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی اور نتھنے پھیلے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں تسبیح کے دانوں کی طرح بکھری پڑتی تھیں لیکن چھت پر پہنچ کر اپنی مالکن کی خودفراموشی کو

دیکھ کر اس کے تیزی سے اٹھنے والے قدم دھیمے پڑ گئے۔ ہونٹوں پر بکھرتی ہوئی مسکراہٹیں یک دم تشویش کی سنجیدگی میں سمٹ گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی مالکن کے پاس پہنچی۔ انہیں دیکھا۔ پھر آہستہ سے جھجکتے جھجکتے ہاتھ کو مالکن حضور کے کندھوں پر رکھ دیا۔

آمنہ یک دم چونک پڑیں اور گھوم کر متوحش نگاہیں برکہ کی ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"اوہ ـــــ برکہ" انہوں نے برکہ کو دیکھ کر کہا، "آگئیں تم؟"

"جی ـــــ لیکن حضور یہاں اتنی گرمی میں کیوں تشریف فرما ہیں؟"

"یونہی؟"

"یہ تو آپ روز ہی فرماتی ہیں۔ کیا باندی کو اتنا بھی مجاز نہیں آخر حضور کیوں ہر روز یہاں آ کر کھڑی رہتی ہیں اور پھر گھنٹوں ٹکٹکی باندھے سڑک کو تکا کرتی ہیں؟"

"میں یہاں آ کر خواب دیکھا کرتی ہوں برکہ۔"

"خواب"

"ہاں ـــــ!"

"لیکن حضور ـــــ جاگتے میں بھی خواب دیکھے جاتے ہیں؟"

"ہاں برکہ ـــــ آنکھیں جاگتی ہیں لیکن دماغ سو کر خواب دیکھا کرتا ہے دعا کرو برکہ یہ دماغ کبھی نہ جاگے۔ اگر یہ خواب بھی مجھ سے چھین لئے گئے تو تمہاری آمنہ بنت وہب موت کی نیند سو جائے گی۔"

"یہ حضور کیا فرما رہی ہیں ـــــ حضور کی زندگی ہی سے تو اس گھر کی رونق ہے۔"

"ہاں برکہ شاید تمہارے جذبات یہی ہوں لیکن میرے گھر کی رونق ـــــ برکہ مجھے خواب دیکھنے دیا کرو تم ـــــ حقائق بڑے تلخ اور سنگ دل ہیں۔ جب میرا شعور ان ظالم حقائق سے ٹکراتا ہے تو میری روح پاش پاش ہو جانا چاہتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس خاکی پیرہن کی دھجیاں اڑا دوں اور اس میں قیدی رُوح کو آزاد کر دوں ـــــ وہ جائے ـــــ اڑ جائے۔ اور مکے سے دور یثرب کی وادیوں میں کسی سونے والے کو اپنی آسمان گیر چیخوں سے بیدار کر دے۔"

"کنیز کو مالکن حضور کے جذبات کا پورا احساس ہے ـــــ لیکن تقدیر اور تدبیر ـــــ آپ خود ہی تو فرمایا کرتی ہیں کہ تقدیر کی فتح اور تدبیر کی شکست ابتدائے عالم سے مقدر ہو چکی ہے۔"

"تقدیر ـــــ" آمنہ کے ہونٹوں پر خفیف طنزیہ مسکراہٹ چھا گئی "تقدیر اور تدبیر ـــــ لیکن اب تو برکہ محمدؐ تقدیر بن کر آیا ہے۔ میں اس دنیا میں اُسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی۔"

"چھوٹے حضور تو اب تشریف لانے والے ہیں۔"

"ہاں ـــــ چند دنوں تک بنو سعد کے قافلے مکہ میں آنے والے ہیں۔"

"اب تو چھوٹے حضور توانا ہو گئے ہوں گے۔"

"برکہ ـــــ تمہیں یاد ہے جب تمہارے مالک گئے تھے۔"

برکہ آمنہ کو خیالات کی ایک رو سے نکال کر دوسرے خیال میں ڈالنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس کامیابی پر اپنے کو مبارکباد دیا ہی چاہتی تھی کہ آمنہ کے ذہن نے ایک جست میں اس کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا۔ چھوٹے حضورؐ کا خیال ایک جملہ معترضہ کی طرح ذہنی فضا سے گر گیا اور آمنہ پھر انہی خوابوں میں کھو گئیں۔

"جاتے وقت اُنہوں نے میری ٹھوڑی کو کتنے پیار سے پکڑا تھا وہ لمس —— وہ آخری لمس ابھی تک زندگی کی طرح میری ٹھوڑی کی جلد میں دھڑک رہا ہے اور اُنہوں نے کہا تھا —— میری آمنہ میں جلدی واپس آجاؤں گا گھبرانا مت —— لیکن برکہ —— وہ وعدہ فراموش —— وہ وعدہ فراموش۔"

آمنہ چپ ہو گئیں۔ اُن کی دور دیکھتی ہوئی آنکھوں پر ہلکی سی نمی کی چادر چھا گئی۔ برکہ کے دل میں جیسے دہکتے ہوئے بھالے اتر گئے ہوں۔ وہ مالکن کی اس پریشانی کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ برکہ ایک معمولی خریدی ہوئی لونڈی تھی۔ لیکن اس کی مالکن نے اُسے کچھ اس طرح سے اپنے دل کے ساتھ لگا لیا تھا کہ برکہ اپنے آپ کو محض لونڈی ہی نہیں، مالکن حضورؐ کے جسم کا ایک حصہ سمجھنے لگی تھی۔ مالکن حضور کے خیالات برکہ کے ذہن میں جیسے آپ ہی آپ حلول کر جاتے تھے۔ اگر اس کی مالکن کو تکلیف ہوتی تو اس تکلیف کی پوری شدت اور غم کا پورا بوجھ برکہ کے دل پر پتھر کی طرح آگرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مالکن کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک دیکھ کر برکہ

کا دل بیٹھنے سا لگا۔ ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو برکہ سے برداشت نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ مالکن حضور کی آنکھوں میں گھرتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہو جائیں۔ اس لئے وہ پریشان ہو گئی۔ گھبراہٹ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ ادھر اُدھر کیا دیکھ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے مرحوم مالک سردار عبداللہ کو گھر کے کسی کونے میں تلاش کر رہی ہو۔ جیسے اُسے یقین ہو کہ سردار کو موت نہیں آئی۔ وہ محض اس کی مالکن کو ستانے کے لئے گھر کے کسی کونے میں چھپے بیٹھے ہیں اور اب جب کہ مالکن رو رہی ہیں وہ ضرور نکل آئیں گے، مالکن کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیں گے اور مالکن حضور کے باریک گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں پر ایک تابناک مسکراہٹ کھیل جائے گی۔

یہ تابناک مسکراہٹ برکہ نے کئی دفعہ دیکھی تھی۔ روتی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ مالکن حضور کا پیارا پیارا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ کشش انگیز اور دلکش بن جایا کرتا تھا اور اُسے لمحے کے تھوڑے سے حصّے کے لئے اپنے اس تصوّر پر یقین ہو گیا کہ اُس کی آنکھوں نے فی الواقعہ مالکن کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہی ہلکے ہلکے آنسوؤں سے تر چمکتی ہوئی موٹی موٹی جھپکتی جھپکتی سی آنکھیں —— اور وہی جوانی کی سرخیوں میں رنگے ہوئے پتلے پتلے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ننھی سی مسکراہٹ —— برکہ کا دل قہقہے مار کر ہنس پڑنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

لیکن نہیں —— یہ سراب نظر —— اس کی نگاہوں کا یہ عجیب د

غریب دھوکا بہت جلد دور ہو گیا۔ مالکن حضور مسکرائی نہیں تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر روتی ہچکتی ہوئی غمناک مسکراہٹ آئی تھی اور وہ کہہ رہی تھیں۔

"ایسے وعدہ فراموش کو کیا کہیے جو اس طرح جائے کہ پھر اس کے واپس آنے کی امید ہی ختم ہو جائے۔ لیکن برکہ وہ تو ایسے کبھی بھی نہیں ہوئے تھے۔ اُن جیسا وعدے کا سچا تو عرب بھر میں نہیں مل سکتا۔"

"میری مالکن، لات وہبل حضور پر رحم فرمائیں ـــــ صبر سے کام لیں۔"

"برکہ!" مالکن نے جیسے کنیز کی بات سنی ہی نہ تھی۔ "شاید تمہیں ایک روز کہہ رہی تھیں کہ عرب میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے عقائد ہم لوگوں کے عقیدے سے نہیں ملتے۔"

"جی ہاں ـــــ بہت ہیں۔" برکہ نے سمجھا کہ مالکن حضور اپنا غم چند لمحوں کے لیے بھول گئی ہیں۔ "عیسائی ہیں، یہودی ہیں، صابی ہیں اور بعض لا دین بھی ہیں۔"

"ان میں سے کوئی ایک عقیدہ ایسا بھی ہے جس کے ماننے والے اس بات پر اعتقاد رکھتے ہوں کہ مرنے کے بعد لوگ پھر ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔"

برکہ کو تھوڑا سا شک ہوا لیکن اس نے بات کو اہم بنانے کے لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا،

"میں نے کچھ لوگوں کو یوں کہتے سنا تو ضرور ہے لیکن مجھے اُن لوگوں کا نام یاد نہیں۔"

آمنہ چند لمحوں تک خاموش دُور سڑک کی طرف تکتی رہیں اور پھر یکدم

بول پڑیں،

"ابا حضور ناراض تو نہ ہوں گے۔"

"جی ــــ کس بات سے۔"

"اگر میں لات و ہبل کو چھوڑ کر اُن لوگوں کے عقیدے میں شامل ہو جاؤں"

"مالکن حضور!" برکہ سراپا حیرت بن گئی۔ "یہ حضور کیا فرما رہی ہیں۔"

"ہمارے یہاں تو ایسا کوئی عقیدہ نہیں ہے لیکن کسی کاہن کے منہ سے ایسی بات کبھی سنی نہیں۔"

"میں نے بھی نہیں سنی۔"

اور پھر آمنہ خاموش ہو گئیں۔ چند لمحوں کے بعد اسی حیرت انگیز طریقے سے یک دم بولیں،

"لیکن اس مذہب میں شامل ہونا کیوں ضروری ہو گا۔ آخر ایک مذہب یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد مرے ہوؤں کی آپس میں ملاقات ہو سکے گی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــ کیا کہہ رہی تھی میں۔" اُنہوں نے برکہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مرنے والے ایک دفعہ پھر ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے"

"ہاں یہی بات تھی ــــ لیکن میں مر بھی تو نہیں سکتی ابھی برکہ ــــ محمدؐ ہے نا ــــ لیکن برکہ سنو ــــ ابا حضور ہیں ــــ حارث ہیں ــــ ابو طالب ہیں۔ اور بھی بہت ہیں۔ محمدؐ کا کچھ نہ کچھ تو کریں ہی گے۔"

"حضور ــــ آپ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔"

"برکہ — پھر تم نے وہی بات کی۔ میں نے ابھی کہا تا۔ مجھے خواب دیکھنے دیا کرو برکہ۔ یہی خواب تو میری زندگی ہیں۔"

"لیکن مالکن حضور — مجھ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہو سکتیں جب آپ ایسی باتیں کرتی ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دشمنوں کے دماغ۔"

برکہ خاموش ہو گئی۔

آمنہ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ اُن کا ذہن جس طریقے سے ایک انتہا سے دوسری انتہا پر جست کر رہا تھا، اُسے دیکھ کر برکہ کو سخت حیرت ہو رہی تھی۔

"تم بھی دنیا والی ہو برکہ — مجھے معلوم ہے لیکن جب سے تمہارے مالک فوت ہوئے اُس دن سے میرے اندر دو شخصیتیں پیدا ہو گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری انفرادی وحدت کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے ایک وہ آمنہ جو دنیا میں سانس لیتی ہے، کھاتی ہے پیتی ہے، ابا حضور سے باتیں کرتی ہے، سوتی ہے، جاگتی ہے، ہنستی ہے، روتی ہے۔ اس آمنہ کو تم روز دیکھتی ہو برکہ۔ وہ تمہاری مالکن ہے۔ تم پر ناراض بھی ہوتی ہے تمہیں ڈانٹتی بھی ہے اور تم منہ بسور لیتی ہو۔ تم پر خوش ہوتی ہے، تمہیں تھپکی دیتی ہے اور تمہارے موتیوں جیسے دانت ایک خوبصورت ہنسی میں کھل جاتے ہیں — اور پھر ایک دوسری آمنہ ہے جس کی زندگی خواب ہے، جو مرحوم خاوند کے ساتھ باتیں کرتی ہے۔ اُسے وعدہ فراموش، وفا نا آشنا اور نہ جانے کیا کیا کہتی ہے۔ آج میں نے تمہارے سامنے اُس آمنہ کو رکھا ہے

اور تم ——— میری کنیز بھی اُس آمنہ کو نہیں پہچان سکی ہو۔"

برکہ خاموشی سے مالکن کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ آج سے پہلے اُسے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ آمنہ نے بھی برکہ کی حیرت کو پہچان لیا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولیں۔

"چلو آبا حضور آنے کو ہیں۔ کھانے کی تیاری کریں۔"

برکہ ہرن کی سی پھرتی سے اٹھی۔ جیسے اس کی بہت دیر کی دعائیں اب قبول ہوئی ہوں۔ اور نیچے اترنے لگی۔

برکہ گھر کے کام کاج میں کچھ ایسی اُلجھی کہ اُسے کسی طرف کا ہوش نہ رہا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی مالکن کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اتنا اطمینان ضرور کر لیا تھا برکہ نے۔ مالکن چھت پر سے اتر کر اندر کے کمرے میں چلی گئی ہیں اور لیٹ گئی ہیں۔

برکہ نے سردار عبدالمطلب اور ان کے بیٹوں کے لئے بکری کے گوشت کا شوربہ بنایا۔ خشک گوشت ابال کر اس میں مصالحے ڈال کر انہیں بھونا اور پھر روٹیاں پکانے لگی۔ ابھی چولہے میں پوری طرح آگ نہ جل پائی تھی کہ مالکن حضور کے کمرے سے آواز آئی،

"برکہ ——!"

برکہ نے کان کھڑے کئے اور پوری توجہ کے ساتھ سنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آواز میں ایک عجیب قسم کی لرزش اور تکلیف کا احساس ہے۔ پھر

آواز سنائی دی۔

"برکہ ـــــ"

"مالکن حضور!" برکہ نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

"ادھر آنا ذرا۔" وہی لرزش ـــــ وہی بیماروں کی سی آواز برکہ کے دل پر جیسے کسی نے تاک کر گھونسا دیا ہو۔ جن لکڑیوں کو چولہے میں جھونکنے کے لئے نچلی چھت سے لائی تھی لاشعوری طور پر اُس کے ہاتھوں سے کھسک کر فرش پر گر پڑیں اور برکہ تلملا کر کمرے کی طرف بھاگی۔

کمرے کی نیم تاریک فضاؤں میں آمنہ کا زرد چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ برکہ تلملائی ہوئی مالکن کے پاس پہنچی اور اُس کا ایک ہاتھ خود بخود مالکن کے ماتھے پر ٹک گیا۔

"بخار آگیا حضور۔"

"ہاں" آمنہ نے جواب میں فرمایا۔ "ابا حضور ابھی تک نہیں آئے۔"

"نہیں آج دارالندوہ میں بنو ہوازن کا مقدمہ پیش ہے۔"

"میں جانتی ہوں ـــــ لیکن اتنی دیر ـــــ پانی میں نمک ڈال کر دینا مجھے۔ طبیعت مسل رہی ہے۔"

"ابھی لائی۔" کہہ کر برکہ برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ چولہے کی آگ دھیمی پڑ چکی تھی۔ اور اس پر رکھا ہوا توا بھاپ کے چھوٹے چھوٹے بگولے بنا رہا تھا لیکن برکہ کے پاس ان جزئیات کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے چمٹے کی مدد سے توے کو چولہے پر

سے اُتار پھینکا۔ لوہے کے کٹورے میں پانی بھر کر دہکتے ہوئے کوئلوں میں گھونس دیا اور پسے ہوئے نمک کی تلاش میں کمرے بھر میں بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ آخر نمک ملا اور برکہ نے اُسے نیم گرم پانی میں ملا کر جلدی جلدی آمنہ کے کمرے تک پہنچا دیا۔

آمنہ اپنے کمرے میں اسی طرح بیٹھی تھیں۔ برکہ نے گرم کٹورا لرزتے ہوئے ہاتھوں پر رکھا اور آمنہ پورا کٹورا پی گئیں۔ نمکین پانی زیادہ دیر تک معدے میں نہیں ٹھہر سکا۔ چند منٹوں کے بعد قے ہوئی اور آمنہ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گئیں۔ برکہ نے مالکن کو اچھی طرح سے کمبل میں لپیٹ دیا اور سرہانے بیٹھ گئی۔

چند لمحوں کے بعد آمنہ نحیف آواز میں بولیں،

"کھانا تیار ہو گیا؟"

"روٹیاں باقی ہیں۔"

"وہ بھی پکا لیتیں۔"

"ابھی پک جائیں گی۔"

"ابا حضور آئیں تو انہیں یک دم میری بیماری کی اطلاع نہ دینا ۔۔۔ وہ پریشان ہوں گے۔"

"اچھا ۔۔۔!"

"اور ہاں ۔۔۔ برکہ ابا حضور کے پاؤں کون دھلائے گا آج۔"

"کنیز دھلا دے گی۔"

"نہیں برکہ یہ حق میں تمہیں نہیں دے سکتی۔"

"مگر دشمنوں کا پنڈا تو بھٹی کی طرح پھنک رہا ہے۔"

"ابا حضور کے اُٹھنے تک اچھی ہو جاؤں گی۔"

"خدا ایسا ہی کرے۔"

"تم جاؤ ــــ روٹیاں پکا لو ــــ ابھی سب لوگ آئیں گے ــــ اور ہاں دیکھنا ــــ حمزہ کے لئے چھوٹی سی نرم روٹی پکا کر اچھی طرح سے شوربے میں تر کر دینا، نہیں مچلے گا۔"

"مناسب ہے۔"

برکہ باہر چلی آئی لیکن اس کا دل روٹی پکانے کو نہیں چاہتا تھا۔ مالکن کی باتیں رہ رہ کر اُس کے ذہن میں اُبھر رہی تھیں۔ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ اُن کی انفرادیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے ــــ اور برکہ اُس حصے کے خیال سے کانپ اٹھی جس کا اوڑھنا بچھونا مرحوم سردار کے خواب تھے۔ اگر وہ بات سچی ہو گئی۔ اگر مالکن کی وہ خواہش پوری ہو گئی۔

برکہ نے چمٹے کی تیز نوک کو پوری قوت سے جلتی ہوئی لکڑی میں گھونپ دیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس خیال بد کو جو اُس کے ذہن میں اُس کی مرضی اور شعور کے خلاف زبردستی ابھر رہا تھا۔ چمٹے کی نوک سے چھید کر موت کی نیند سلا دینا چاہتی ہے۔ مالکن کی موت اُس کی اپنی موت تھی۔ اُسے کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

برکہ کے ہاتھ روٹیاں پکاتے رہے اور اُس کا ذہن جنت پر جست

لگاتا ہوا وقت اور مقام کی کئی منزلوں کو پار کر گیا۔ آمنہ بنت وہب اور عبداللہ کی شادی کا منظر اس کے تصور میں تیرتا ہوا آیا اور گزر گیا۔ ان کی خوش حال اور مسرور متاہلانہ زندگی نغمے کی طرح اس کے ذہن کے پردوں پر تھرکتی ہوئی سی گزر گئی۔ اور پھر ـــــ برکہ کے ہاتھ تیزی سے آٹے کو چپتپانے لگے۔ موت ـــــ موت نے اس رنگین زندگی پر ایسے تیزاب کے چھینٹے دیئے تھے کہ اس خوبصورت زندگی کا تار و پود جل گیا تھا۔

نچلا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا اور برکہ نے چونک کر دیکھا تو توے پر رکھی ہوئی روٹی جل رہی تھی۔ برکہ نے تیزی سے روٹی کو اتارا اور بھاگی ہوئی کھڑکی میں گئی۔ جھانک کر دیکھا۔ سردار عبدالمطلب اور اُن کے بیٹے نیچے کھڑے تھے۔

برکہ تیزی سے نیچے گئی۔ دروازہ کھولا اور سردار کی تھکی ہوئی صورت دیکھی۔ اس کی نگاہیں پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑوں پر سے پھسلتی ہوئیں پاؤں تک آئیں۔ گرد سے اٹے ہوئے پاؤں موٹی جوتی میں لپٹے ہوئے تھے اور برکہ کے ہونٹوں پر معاً آمنہ کی بیماری کا نام آگیا لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے مالکن کا وہ حکم بھی یاد آگیا اور وہ خاموش ہوگئی۔

سردار عبدالمطلب اپنے کمرے میں چلے گئے اور برکہ پھر باورچی خانے میں آگئی لیکن ابھی وہ چولہے کے قریب بیٹھی بھی نہ تھی کہ مالکن کی آواز آئی،

"برکہ"

"حاضر ہوئی" کہہ کر برکہ پھر کمرے میں گئی۔

"ابّا حضور آگئے۔"

"جی ہاں۔"

"بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں ــــ بہت۔"

"اور پاؤں گرد آلود ہیں۔"

"جی ہاں بہت گرد آلود۔"

"مجھے سہارا دینا۔" ہاتھ سہارا لینے کے لئے آگے بڑھا۔

"کہاں جائیں گی آپ؟" برکہ نے تپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا

"ابّا حضور کے پاؤں دھلاؤں گی۔"

"بخار بہت تیز ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔"

مالکن اٹھیں اور باندی کی نگاہوں کے سامنے ڈول کر پھر لیٹ گئیں۔

"نہیں اٹھا جاتا برکہ۔"

"میں دھو دوں گی۔"

"ہاں ــــ پانی گرم کر لینا۔ گرم پانی سے ابّا حضور کی تکان دور ہو جایا کرتی ہے۔"

"بہتر ــــ"

برکہ باہر چلی گئی اور آمنہ کی آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔

تھوڑی دیر گزر گئی۔

سردار عبدالمطلب نچلے کمرے میں اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھے تھے
اور کہہ رہے تھے۔

"اگر ان حالات میں جنگ شروع ہو گئی تو قریش کا نقصان ہونے کا
اندیشہ ہے۔"

"لیکن لوگ ماننے کو نہیں" حارث نے کہا۔

"انہیں ماننا ہی ہو گا" عبدالمطلب نے جواب دیا "قوموں کے معاملات
بھڑکے ہوئے جذبات سے نہیں سلجھا کرتے۔ ان کے لئے متانت اور
ٹھنڈے دل سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔۔۔ ابھی برکہ
نے شاید آمنہ کو بتایا نہیں کہ میں آ گیا ہوں" انہوں نے تھکی ہوئی پنڈلیوں پر
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"برکہ" حارث نے باپ کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا "بھابی سے
کہہ دو کہ والد بزرگوار آ گئے ہیں۔"

"میں حاضر ہوئی سردار" برکہ کی آواز سیڑھیوں کے سرمئی دھندلکوں میں
سے سنائی دی اور چند لمحوں کے بعد برکہ ہاتھ میں شیر گرم پانی کا مشکیزہ لئے
آ گئی ۔۔۔

"حضور پاؤں پھیلائیں۔"

"آمنہ کہاں ہے" عبدالمطلب نے تعجب سے پوچھا۔

"دشمنوں کی طبیعت علیل ہے سردار۔"

"علیل ہے" سردار عبدالمطلب کو جیسے کسی نے بھالے کی نوک

کا بچھو کاٹ دیا ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے، "کیا ہوا؟"

"بخار آگیا ہے۔" برکہ حتی الوسع اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا چاہتی تھی اور اپنے جواب میں ایسا انداز پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس سے علالت کی اہمیت کم معلوم ہو۔ اور سردار پریشان نہ ہوں لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ ڈھونگ رچا نہ سکی۔ ایک دم پھٹ پڑی،

"پنڈا بھٹی کی طرح جل رہا ہے سردار۔"

"لیکن صبح تو اچھی بھلی تھی۔"

"جی ہاں ―― دن ڈھلے میں پانی لانے کے لئے چشمے پر گئی تھی اس وقت بالکل اچھی تھیں لیکن جب میں واپس آئی تو حضور مالکن اوپر کی چھت پر کھڑی تھیں اور یمن سے آنے والی سڑک کو دیکھ رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر کچھ ایسی باتیں کہیں انہوں نے۔ میرا کلیجہ کٹا جاتا تھا۔ وہ مرنے کے متعلق بڑی بُری بُری باتیں کہتی ہیں سردار ―― وہ کہتی ہیں مر جاؤں گی تو حضور سردار سے مل جاؤں گی۔" برکہ کہتے کہتے رونے لگیں۔

"اور اس کے بعد انہیں بخار ہو گیا۔"

برکہ نے آنسو پونچھتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا۔ سردار عبدالمطلب کا سر آہستہ آہستہ جھک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی روح کے اعماق کو اپنی مادی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

چند لمحوں تک کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا۔ سردار عبدالمطلب نے آہستہ سے سر اٹھایا اور دل کی عمیق گہرائیوں سے نکلتی ہوئی آہ کو ہونٹوں

پر چلتے ہوئے کہا،

"اچھا ——"

"پاؤں دھو لیجئے سرکار —— پانی گرم ہے۔"

"آمنہ کہاں ہے۔" شاید سردار نے برکہ کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"اپنے کمرے میں —— میں نے کمبل اڑھا دیا تھا۔"

"کھایا پیا نہیں کچھ؟"

"شیر گرم پانی میں نمک ملا کر دیا تھا جس سے قے ہو گئی تھی۔"

"پسینہ نہیں آیا۔"

"ابھی نہیں ——!"

"ہوں۔" سردار نے کہا اور تخت پر زور دے کر اٹھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کندھوں پر ایک بہت بھاری بوجھ لد گیا ہے۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے دروازے کی طرف گئے اور آہستہ آہستہ گھٹنوں کا سہارا لے کر جھکتے، دبتے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔

آمنہ نے اپنے کمرے میں ان کے پاؤں کی چاپ سن لی تھی اور کمبل کو اچھی طرح سے اپنے جسم پر لپیٹ لیا۔ سر کی چادر سے ماتھا ڈھانپ لیا۔ بوڑھے عبدالمطلب جواب پہلے سے کہیں زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے تھے، آہستہ آہستہ کمرے کے دروازے پر آئے۔ دھیمی آواز میں بولے،

"آمنہ ——!"

"ابا حضور ——!"

"میری بچی" سردار لپک کر کمرے میں آ گئے۔ "بخار کیوں آ گیا میری لخت جگر کو۔"

"یونہی ۔۔۔ شاید موسم کا اثر ہے۔"

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔"

"پسینہ تو نہیں آیا۔"

"اب آ جائے گا۔" آمنہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "آپ بیٹھیں گے نہیں۔"

"ضرور بیٹھوں گا میری بچی۔" سردار چارپائی کے قریب بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے۔

"اس دفعہ حلیمہ نے بہت دیر کر دی۔" سردار نے کچھ دیر کے بعد کہا برکہ نے انہیں جو بات سنائی تھی اس کے پیش نظر گفتگو کا رُخ اسی طرف پھیرنا ضروری تھا۔

"پانچ چھ دن اُوپر ہو گئے۔"

"نہیں بیٹیا ۔۔۔ دس دن ۔۔۔ چھٹے چاند کو طلوع ہوئے آج دسواں دن ہے۔"

"جی ہاں ۔۔۔ پچھلی دفعہ جب بنو سعد کے قافلے نے مکّہ سے کوچ کیا ہے۔ چاند کو نکلے چار دن ہو چکے تھے۔"

"ہاں ہاں ۔۔۔ بھئی تم نے پورا حساب رکھا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا

ہوں نا؟" عبدالمطلب نے کھوکھلا سا قہقہہ لگا کر کہا۔
"اس دفعہ محمدؐ کو حلیمہ کے ساتھ واپس نہ بھیجنا۔"
"جیسا ابا حضور مناسب سمجھیں گے لیکن مکہ کی آب و ہوا اس دفعہ بھی اچھی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ محمدؐ کی زبان پہلے سے زیادہ نکھر گئی ہے۔ چند دن اور بنو سعد میں رہا تو اچھی زبان سیکھ جائے گا۔"
"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہتی ہو ـــــ معلوم ہوتا ہے میری آمنہ اپنے جگر گوشہ کو عرب کا سردار بنانا چاہتی ہے۔"
"شیروں کے بچے شیر ہوا ہی کرتے ہیں ابا حضور ـــــ انہیں شکار مارنے کے ڈھنگ سکھانے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔"
"بہت خوب ـــــ بھئی بہت اچھے۔" سردار عبدالمطلب یونہی ہنس دیئے۔ اور یہ ہنسی اتنی غیر متوقع تھی کہ خود آمنہ اس کی وجہ جواز سمجھنے سے قاصر تھیں۔" یہ تو تم نے بہت چلتی ہوئی بات کہی ہے۔ شیروں کے بچے شیر ہی ہوتے ہیں۔ بالکل ٹھیک، بالکل درست ـــــ میرا عبداللہ شیر ہی تھا۔"
آمنہ کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا بادل آیا اور چھٹ گیا۔ شاید عبدالمطلب نے اس بادل کو نہیں دیکھا تھا۔
"لیکن بیٹیا۔" عبدالمطلب نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے عبداللہ کو میں دیوتاؤں پر قربان کر دینا چاہتا تھا۔"
"جی ہاں!"
"لیکن دیوتا نے اس کے بدلے سو اونٹوں ہی سے سودا کر لیا۔" عبدالمطلب

کے گلے میں ایک روتا ہوا قہقہہ تھرتھرایا "دیوتا بھی کتنے بھولے ہیں ہمارے۔ سواونٹ ـــــ اور پھر کئی برسوں کے بعد دیوتا کو یاد آیا کہ انہوں نے اپنے پوچھنے والے کو سستا ہی چھوڑ دیا ہے۔ صرف اس بڈھے ہی کو نہیں ایک اور معصوم نوجوان زندگی کو بھی رگید دیا ظالموں نے تمہیں بھی لپیٹ لیا اپنے قہر میں"

عبدالمطلب خاموش ہو گئے۔ شاید اُن کا مقصد آمنہ کو رُلانا تھا لیکن آمنہ کے ذہن پر ایک دفعہ پھر ہلکے ہلکے سرمئی بادل گھرنے لگے۔ ایک دفعہ پھر ان کی آدھی شخصیت خوابوں کی دنیا میں کھو جانے کے لئے پر تولنے لگی۔

عبدالمطلب نے اپنا وار خالی جاتا دیکھا تو بولے،

"وہ ہی چار دنوں میں میرا پوتا آجائے گا۔ تمہارا دل بہل جائے گا اس کے ساتھ۔ اپنے دل پر اتنا جبر مت کیا کرو آمنہ جس کو تمہارا جسم برداشت نہ کرسکے ـــــ اپنے کھانے کے لئے کچھ بنوایا تم نے۔"

"جی ـــــ" آمنہ نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا ـــــ "آپ کچھ فرما رہے تھے ابا حضور"

"ہاں میری بچی" سردار عبدالمطلب نے اپنی ہار مان لی "میں پوچھ رہا تھا، اپنے کھانے کے لئے کچھ بنوایا ہوتا۔"

"ابھی جی نہیں چاہتا۔"

"اب تو کافی دیر ہو گئی ہے ـــــ کل کسی کاہن سے مشورہ کروں گا"

سردار عبدالمطلب کچھ دیر اور بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر نیچے چلے گئے

آدھ پون گھنٹے کے بعد آمنہ نے پھر یک دم آواز دی۔

"برکہ"

اور برکہ فوراً دروازے پر تھی۔

"مالکہ حضور!"

"ابا حضور کو کھانا کھلا دیا؟"

"میں پوچھ کر آئی ہوں۔ چھوٹے سرداروں نے تو کھا لیا ہے لیکن حضور سردار فرماتے ہیں کہ ابھی انہیں خواہش نہیں ہے۔"

"کیوں ۔۔۔۔؟"

"باندی اس کے متعلق کیا عرض کر سکتی ہے۔"

"پاؤں دھو لیے؟"

"مشکیزہ رکھوا لیا تھا۔ فرماتے تھے خود ہی دھو لوں گا لیکن اب میں نے دیکھا ہے۔ ابھی تک پاؤں نہیں دھوئے۔"

"مجھے کچھ بھوک سی لگی ہے۔"

"شوربا تناول فرمائیے گا یا بھنا ہوا گوشت۔"

"شوربے میں روٹیاں بھگو لاؤ۔"

"بہتر ۔۔۔۔"

برکہ چلی گئی اور زیتون کے دیئے کی سسکیاں لیتی ہوئی روشنی میں بہو کی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے کوئی دیکھنے والا نہ تھا ۔۔۔۔ لیکن اس بیوہ بہو کے دل کو دیکھ بھی کون سکتا ہے جس کے ریگستان جیسے وسیع اور بے آب و گیاہ

دل میں خوشی کا بھولا بھٹکا جھونکا آئے ـــــ آندھی کی طرح اور نقش پا چھوڑے بغیر گزر جائے ـــــ بگولے کی طرح ـــــ!

آمنہ کھانا کھا چکیں ـــــ اور کچھ ہی دیر بعد انہوں نے حارث کی آواز سنی۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہے تھے۔

"برکہ ـــــ والد محترم کے لئے کھانا لے آؤ ـــــ"

اور آمنہ نے اپنے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا،

"ابا حضور ـــــ میرے ابا حضور" جیسے زیتون کے دیئے کی ڈگمگاتی لَو اُن کی مخاطب ہو۔

۷

اور دوسرے دن سے کاہنوں اور معبدوں کے پجاریوں کے یہاں عبدالمطلب کا پورا خاندان چکر لگانے لگا۔ لیکن کعبہ کے تمام کاہن آزمائش کے بعد ناکام ثابت ہوئے۔ لات و ہبل کا پانی آمنہ کو پلایا گیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ کاہنوں نے طرح طرح کی تجویزیں اور قربانیاں بتائیں۔ ہر ایک کو پوری نیک نیتی اور اعتقاد کے ساتھ پورا کیا گیا لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ عبدالمطلب کی چہیتی بہو دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ بخار کچھ اس طرح سے چمٹا تھا کہ پیچھا ہی نہ چھوڑتا تھا۔

سات دن گزر گئے۔

سردار انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ انہیں راستہ نہیں سوجھتا تھا آخر آٹھویں دن صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے عبدالمطلب گھر سے نکل کر کعبہ میں آئے۔ انہوں نے کپڑے اتار دیئے اور الف ننگا ہو کر کعبے کے گرد

طواف کرنے لگے۔ وہ کعبے کے گرد پھرتے جاتے تھے اور با آواز بلند کہہ رہے تھے۔

"اے کعبہ کے دیوتاؤ ۔۔۔ اے خدا کے مقدس و محترم بیٹو ۔۔۔ اے ابراہیم کے رب ۔۔۔ اے میرے خدا مجھے راستہ دکھا۔ مجھے راستہ دکھا میرے جگر گوشے کی بیوی کو آرام دے ۔۔۔ میرے جگر گوشے کی بیوی کو آرام دے۔"

وہ اسی طرح طواف کر رہے تھے اور بلند آواز سے دعا مانگتے جا رہے تھے۔ صبح کاذب کے دھندلکوں نے انہیں اسی طرح پریشان حال دیکھا ستاروں کی تھکی ہوئی آنکھیں انہیں اسی طرح دیکھتے دیکھتے بند ہو گئیں اور سورج کی کنواری شعاعوں نے بھی انہیں اسی حالت میں پایا۔ آخر بوڑھے عبدالمطلب تھک گئے اور اپنی چادر اوڑھ کر کعبے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

وہ سوچ رہے تھے۔ موت نے اُن سے اُن کا بیٹا چھین لیا۔ کیا موت اب اُس زندگی کو بھی ان کے ہاتھوں سے اُچک لے گی جو اُس کے بیٹے کی یاد ہے۔ نہیں ۔۔۔ وہ ایسی ظالم بھی تو نہیں ہو سکتی۔ کعبے کے دیوتا اتنے سنگدل تو نہیں بن سکتے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے تھے کہ کعبے کی پشت پر سے کسی کی کی آواز سنائی دی۔

"سردار قریش!"

جیسے سورج کی شعاع نے پکارا ہو۔ اور عبدالمطلب نے گھوم کر دیکھا

اُن کے قریب ورقہ کھڑے تھے۔

"ورقہ ــــ آؤ بیٹا۔" سردارِ قریش نے پہچان کر کہا۔

"حضور آج بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں ورقہ! آج میں بہت پریشان ہوں۔ اتنا پریشان کہ زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"تمہاری بھابی بیماری ہیں۔"

"بھابی ــــ؟" ورقہ شاید پہچان نہیں سکے۔

"ہاں ــــ آمنہ اُمِّ محمدؐ۔"

"کیوں خیریت۔" ورقہ قریب بیٹھ گئے۔

"سات دن سے بخار چڑھا ہے۔ لاکھوں جتن کئے لیکن بخار ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ کاہنوں کا خیال ہے کسی آسیب کا اثر ہے۔"

"لیکن اُس آسیب کا علاج بھی تو کچھ بتایا ہوگا اُنہوں نے۔"

"بہت علاج بتائے ــــ اونٹ کا خون تک کھلایا ہے لیکن بخار نہیں اُترا۔"

"یہ تو ابھی خبر نہیں سردارِ قریش ــــ" ورقہ نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے ــــ میں عیسائی ہوگیا ہوں۔"

"کل ہی دارالندوہ میں کوئی کہہ رہا تھا۔ لیکن میں اس قدر پریشان ہوں کہ کسی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر تم نے اچھا نہیں

کیا ورقہ ــــ ہم سب کو اس بات کا افسوس ہے۔"

"مجھے احساس ہے کہ میرے اس اقدام سے میرے بزرگوں کو صدمہ ہوا ہے ــــ لیکن یہ وضاحت کا موقع نہیں ورنہ میں بالتفصیل عرض کرتا۔ اگر آپ نامناسب نہ سمجھیں تو بھابی کے متعلق اس راہب کی طرف رجوع کریں، جس کے ہاتھوں پر میں نے دین عیسوی قبول کیا ہے۔"

"راہب؟"

"جی ہاں ــــ عیسائیوں میں زاہدوں کو راہب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ لوگ تمام عمر شادی نہیں کرتے اور پوری عمر خدا کی یاد میں بسر کر دیتے ہیں۔"

"عکاظ کے میلے میں میں نے کئی دفعہ سنا ہے ان کے متعلق ــــ لیکن وہ میری بچی کو اچھا کر سکیں گے؟"

"اگر آپ نے ان کی طرف پوری عقیدت سے رجوع کیا تو کافی امید ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں بھی عیسائی ہو جاؤں۔"

"نہیں سردار قریش۔" ورقہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "عیسائی ہونے کی ضرورت نہیں مسیح کا فیضان عام ہے۔ عیسائی ہوئے بغیر بھی آپ مقدس اپنا معجزہ دکھائے گا۔"

"میں نے آج تک کسی عیسائی راہب کا نام نہیں سنا۔ کہیں دور رہتا ہوگا۔"

"جی نہیں ــــ یہ مکہ کا دامن ہے نا ــــ اس میں ایک چھوٹی سی پہاڑی

ہے۔ شاید آپ گزرے ہوں اُس کے قریب سے۔"

"کیا نام ہے اس پہاڑی کا۔"

"فاران۔"

"ارے یہ فاران ۔۔۔ تم نے اُسے بہت پُراسرار بنا دیا ورقہ۔ میں کئی دفعہ گزرا ہوں وہاں سے۔"

"بس تو وہ فاران پر مقیم ہیں۔ شام سے یہاں تک انہوں نے سفر کیا ہے۔ فرماتے ہیں دنیا کے آنے والے عظیم ترین مذہب کا بانی فاران کی چوٹیوں پر ظہور فرمائے گا۔"

"اچھا ۔۔۔ تو وہ اس لئے تشریف لائے ہیں یہاں۔"

"جی ہاں ۔۔۔ بڑے خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔"

"کیا عمر ہو گی؟"

"عمر تو ایسی نہیں۔ ادھیڑ عمر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کے ہاتھ اور کلام میں بڑا اثر ہے۔ کئی بیمار ان کے ہاتھوں شفایاب ہوئے ہیں۔"

"تو تمہیں یقین ہے آمنہ کا بخار دُور ہو جائے گا۔"

"کامل ۔۔۔ آپ خود چل کر دیکھئے۔"

"بھئی یہ کام تو آج ہی کرنے کا ہے۔ فاران کچھ ایسا دُور بھی نہیں۔"

"میں حاضر ہوں ۔۔۔ جب فرمائیے چلے چلیں گے۔"

"ابھی ۔۔۔ لیکن کپڑے بدل کر۔"

اور سورج کو نصف النہار تک پہنچنے کے لئے ابھی کئی منزلیں طے

کرتا تھا۔ جب سردار عبدالمطلب اور ورقہ فاران کی ترائی کو عبور کر کے ایک چھوٹی سی صاف ستھری غار میں پہنچ گئے۔ صلیب پر لٹکا ہوا یسوع مسیح کا بت اُن کی نگاہوں کے سامنے تھا اور ادھیڑ عمر راہب ایک ایسی داستان سنا رہا تھا جس میں کم از کم سردار عبدالمطلب کو ذرّہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ راہب کے دوسرے سننے والے بھی سردار عبدالمطلب کی طرح انتہائی بے دلی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ورقہ ہمہ تن گوش تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا ماحول پگھل گیا ہے۔ راہب کے ہونٹوں سے ٹپکنے والے الفاظ اُن کی تپتی ہوئی روح پر برفابے کی طرح گر رہے تھے۔ ان کے علاوہ راہب کے آٹھ نو شاگرد پورے انہماک سے راہب کی باتیں سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ راہب ان کے سامنے روحانی اور مادّی دنیا کی نئی شاہراہیں کھول رہا ہے۔

لیکن سردار عبدالمطلب کو اس میں نام کو بھی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ ان تمام باتوں میں آمنہ کا ذکر ایک دفعہ بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی راہب نے اپنی شفا بخش قوتوں کا ذکر کیا تھا۔ راہب کہہ رہا تھا،

"مجھے ہوش نہیں کب میرے بزرگوں اور بہی خواہوں نے مجھے مقدس ماں مریم اور خداوند یسوع مسیح کی خدمت کرنے کی غرض سے کلیسا میں داخل کیا۔ مجھے یونہی دھندلا سا یاد ہے میں چھوٹا بچّہ تھا،

سردار عبدالمطلب نے پہلو بدلا اور دل ہی دل میں کہا،

"مجھے اس سے کیا؟ میری طرف سے تم ڈیڑھ سو سال کے کھوسٹ

ہوتے۔"

لیکن راہب نے سردار کے دل کی بات نہیں سنی۔ اپنی سی کہے چلا گیا۔۔۔۔

"بالکل بچہ۔۔۔۔۔ جب میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری ماں۔۔۔۔ میری پیدائش کے وقت ہی وفات پا گئی تھیں۔ یوں کہئے کہ میں ہی اپنی ماں کی موت کا باعث ہوا۔"

"ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔" یک دم یہ الفاظ سردار قریش کے ذہن میں اُبھرے اور وہ داڑھی کی اوٹ میں کچھ اس انداز سے مسکرائے کہ دیکھنے والوں کو شک نہ پڑے۔

"میرے والد خداوند خدا انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دیں پورے تین ساڑھے سال مجرّد زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن بالآخر انسان کی عظیم الشان روح حیوانی جذبات کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی اور میرے والد نے دوسری شادی کرنے کا ارادہ کر لیا۔"

"پھر!" عبدالمطلب کو نئے نئے فقرے سوجھ رہے تھے، "پھر ہوا کیا؟"

"اِدھر اُنہوں نے شادی کی ٹھانی، اُدھر گھرانے میں طرح طرح کی فقرہ بازیاں ہونے لگیں۔ میں کانٹا تھا راستے کا۔ گھرانے والے مجھے بطور دلیل استعمال کرتے تھے اور والد مرحوم کو اس نئی شادی سے روکنا چاہتے تھے۔ بالآخر والد نے مجھے راستے سے ہٹانے کا آسان راستہ ڈھونڈا اور مجھے کلیسا کے

سپرد کر دیا۔"

"خس کم جہاں پاک" عبدالمطلب نے سوچا۔

"اس وقت ــــــ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کلیسا مجھے جیل خانہ دکھائی دیتا تھا۔ وہاں کی سختیاں، ریاضتیں اور دوسرے راہبوں کی مار پیٹ جو یقیناً میری بہتری کے لئے تھی۔ مجھے بہت بری لگتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ضدی تھا، ہٹ دھرم تھا اور جو جی میں آتا تھا وہی کرتا تھا۔ اس لئے میرے استاد کو مجھ پر سختی کرنی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔ میرے استاد نے میری روح کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنے کا ایک عجیب طریقہ نکالا۔ انہوں نے کلیسا کے میدان میں مجھے دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ سورج تقریباً آدھا دن میرے سر پر آگ برساتا رہا لیکن ڈھیٹ پنے کی اس سے بڑھ کر اور کون سی حد ہو گی کہ میں تمام دن کھڑا دھوپ اور گرمی کی شدت برداشت کرتا رہا لیکن اپنی غلطی کا اعتراف کرنے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنے پر رضامند نہ ہوا۔ بالآخر خدائے قدوس کو مجھ پر رحم آیا۔ مغرب سے ایک مستانہ گھٹا جھوم کر اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مغرب سے مشرق تک چھا گئی۔ میں نے اسے ابر رحمت سمجھا۔ میں نے سمجھا کہ استاد کو دق کرنے اور اپنی ولایت و بزرگی کا سکہ اس کے دل پر بٹھانے کا اچھا بہانہ میرے ہاتھ آگیا ہے۔ لیکن اس وقت میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ یہ ابر ایک اور انداز میں ابر رحمت ثابت ہو گا۔

چند لمحوں کے بعد بوندا باندی ہونے لگی اور بارش نے زور پکڑا۔ اس

وقت میری عمر زیادہ سے زیادہ چھ سات برس کی ہوگی۔ اندازہ کیجیے چھ سات برس کی ننھی سی جان جس نے نصف دن سے زیادہ سورج کی شدت اور تپش برداشت کی ہو یکدم بارش کی موسلا دھار بوچھاڑوں میں گھر گیا تھا۔ بارش بھی آج قسم کھا کر آئی تھی۔ جل تھل ایک ہو رہے تھے۔ میری ضد جو استاد کی چھڑیوں اور چابکوں کے سامنے ختم نہ ہو سکی تھی۔ عناصر کے بے جگرانہ حملے کے سامنے جھک جانے پر مجبور ہو گئی۔ مجھے انتہائی کرب کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں نے روح کو پاکیزگی دینے والی اس سزا کو اپنے حق میں عذاب سمجھا اور رو دیا ۔۔۔ رو دیا میں!! اور آہستہ آہستہ میرے سر میں ہتھوڑے سے چلنے شروع ہو گئے۔ میری کنپٹیاں تڑپنے لگیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر شدید سر درد کی صورت اختیار کر لی۔ میرا سر ۔۔۔ میرا سر چکرا گیا۔ زمین آسمان ایک نکتے کے گرد تیزی سے گھومتے نظر آنے لگے اور میں چکرا کر گر پڑا۔"

"لیکن آمنہ کو سخت تکلیف ہے بھائی صاحب ۔۔۔ میں آپ کی ان لمبی باتوں کو سن کر کیا لوں گا۔" عبدالمطلب کے ذہنی گنبدوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ لیکن راہب جوش میں تھا۔ وہ کہتا چلا گیا۔

"اور جب کلیسا کے طبی مشیروں کی کئی گھنٹوں کی پے در پے کوششوں کے بعد مجھے ہوش آیا تو مجھے سخت بخار تھا۔ میرا جسم خود مجھے جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا کہ میرے جسم سے شعلے لپک رہے ہیں۔ میرے مشفق استاد نے ہمدردی کا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھا اور کہا،

"میرے بیٹے ــــ اب بھی ضد سے باز آجاؤ ــــ یہ میں نے نہیں بلکہ خداوند خدا نے تجھے تیری ہٹ دھرمی کی سزا دی ہے۔"

لیکن خاک کی اس چھوٹی سی چٹکی کی ہیکڑی ملاحظہ ہو کہ میں نے اپنے استاد کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ غصے میں جیسے میں اس کی کسی بات کو سننے پر تیار نہیں ہوں۔

"یہ کس مشکل میں ڈال دیا تم نے مجھے۔" عبدالمطلب نے ورقہ کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

لیکن ورقہ جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔ جیسے وہ خود راہب کی شکل میں اپنے استاد کی تمام سختیاں جھیل رہا تھا اور اس سے ناراض ہو کر منہ دوسری طرف پھیر رہا تھا۔ اس لئے بادل ناخواستہ سردار قریش نے پھر اپنی نگاہیں راہب کے چہرے پر گاڑ دیں اور اُن کے کانوں میں زبردستی یہ غیر دلچسپ گفتگو اُترنے لگی۔

"اور خداوند خدا کا زندہ معجزہ ــــ! میری بخار سے جلتی ہوئی آنکھوں کے سامنے مسیحؑ مظلوم کی تصویر تھی۔ مسیح صلیب پر لٹک کر دنیا کو نجات آخری کا پیغام دینے والا مسیح ــــ خدا کا وہ بیٹا جو دنیا والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود صلیب کی تکالیف برداشت کرنے پر تیار ہو گیا۔ سامنے کی دیوار پر موجود تھا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں۔ آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا۔ مقدس مریم کے پیٹ سے جنم لینے والا خدا تو میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ خداوند کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جیسے کوئی باپ

اپنے بیٹے کی تکلیف دیکھ کر رو دے ——— مجبور باپ ——!

اُن کے خون آلود ہونٹ تھرک رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ اور میرے لئے جیسے میرا کمرہ جس میں میں لٹایا گیا تھا کمرہ نہیں رہا تھا میرے اردگرد کے لوگ لوگ نہیں رہے تھے۔ میری کائنات بکھل چکی تھی۔ میرا زمین آسمان بدل چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو خدا کی اس بادشاہی میں محسوس کر رہا تھا جس کا ذکر میرے استاد انتہائی کاروباری انداز میں فرمایا کرتے تھے اور جن کے الفاظ کا میرے دل پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آج میں اپنے زندہ شعور کی مدد سے پوری پانچوں حسّوں کے ذریعہ اس خدا کی بادشاہی کو محسوس کر رہا تھا۔ آج مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی اور زندگی کی ہمہ ہمی کلیسا اور کلیسا کی پتھریلی دیواریں، استاد اور استاد کا بیہ، کتابیں اور کتابوں کے ردّی ورق سب کچھ نہیں ——— بالکل اسی طرح معدوم اور ناپید ہو گئے ہیں جس طرح آج سے پہلے خدا کی بادشاہت کا خیال معدوم اور ناپید معلوم ہوتا تھا۔ اور اس کی جگہ زندہ واضح اور امرٹ حقیقت یہی تھی کہ خدا ہے اور اس کی بادشاہی قائم ہے۔

اور میں نے اس حقیقت کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اپنے اردگرد کھڑے ہوئے سایوں سے کہہ دیا جواب سے چند لمحے قبل انسان تھے اور جن کی انفرادیت نام کی محتاج تھی۔ میں نے ——— چھ سات سال کے چھوٹے بچے نے ——— چیخ کر کہا ”اُو ——— اُو“ اور میرے بازو پھیل گئے مسیح میرے جسم کی نس نس اور پور پور میں ڈوب گئے۔

لیکن میرے استاد نے اسے میرے بخار کا نتیجہ سمجھا۔ اُن کا خیال تھا مجھے سرسام ہو گیا ہے اور میں ہذیان بک رہا ہوں۔ میری موت قریب ہے وہ یہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے مجھے کمرے میں علیحدہ چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ میں مرنے سے پہلے اپنے دل کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لوں لیکن میرا بخار آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔"

یہ بات عبدالمطلب کے مطلب کی تھی اس لئے انہیں بھی دلچسپی ہو گئی۔

"میں یکہ و تنہا کمرے میں پڑا رہا۔" راہب کہہ رہا تھا۔ "میرے سرہانے وہ مقدس پانی پتھر کے ایک بڑے سے کوڑے میں بھرا ہوا تھا جس سے مقدس ماں کے پاؤں دھوئے گئے تھے۔ جب میری آنکھیں زیادہ جلتی ہوئی معلوم ہوتیں میں اس پانی میں انگلیاں ڈبو کر اپنی آنکھوں پر پھیر لیتا۔ پیاس لگتی تو اسی پانی سے گھونٹ دو گھونٹ پی لیتا۔ اسی طرح آٹھ دن گزر گئے۔ اب مقدس ماں کی برکت سے بخار بالکل نہیں تھا لیکن نقاہت بہت زیادہ تھی کیونکہ پانی کے سوا اور کوئی چیز مجھے کھانے کے لئے نہیں ملی تھی۔ آخر ایک دن ایک نن مجھے دیکھنے کے لئے آئی۔ اُسے میری حالت پر رحم آیا۔ اُس نے مجھے دودھ اور کچھ پھل لا کر دیئے۔ مجھے یاد نہیں کتنے دنوں تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد میں باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

بہر حال دن گزر گئے اب میں اچھا تھا۔ بیماری کا نشان تک میرے ذہن میں نہ تھا۔ البتہ یسوع مسیح کے وہ دیدار جو مجھے حاصل ہوئے تھے کسی زندہ

شے کی طرح میرے شعور کے ہر گوشے میں دھڑک رہے تھے۔ اس لئے میں نے اچھا ہوتے ہی پورے خضوع و خشوع سے کتاب مقدس کا مطالعہ شروع کیا۔

سات سال کی عمر سے تیس سال کی عمر تک میں نے کتاب مقدس کا مطالعہ کیا ہے۔ اس صحیفۂ عجیب نے میری حیران آنکھوں کے سامنے نئے جہان آباد کر دیئے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میرے سر پر اوندھے پیالے کی طرح جھکا ہوا آسمان ہی ایک آسمان نہیں بلکہ اس سے آگے بھی بہت سے آسمان ہیں جو ابھی انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ ان آسمانوں کا پتہ دینے والا زندگی کی نئی اور اچھوتی شاہراہوں پر دنیا والوں کو چلانے والا ایک اور نبی ابھی آنے والا ہے۔"

"ایک اور نبی۔" ورقہ نے پوچھا۔

"ہاں میرے شاگرد ایک اور نبی"۔ راہب کی متجسس نگاہیں ورقہ کے چہرے پر جم گئیں۔ "وہ نبی جس کے متعلق لوقا نے کہا ہے کہ میں اس کے بوٹ کے تسمے کھولنے کے بھی قابل نہیں ہوں۔ عہد نامۂ عتیق کے تمام نبیوں نے اس کی شہادت دی ہے۔ پھر عہد نامہ جدید کے تمام خداوسیدہ بزرگوں اور دلیوں نے اس کی آمد کا انتظار کیا ہے یہاں تک کہ ہمارے رہبر خداوند خدا کے پیارے بیٹے یسوع مسیح نے بھی فرمایا:۔

"میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں جاؤں تو اسے ــــ تم پاس بھیج دوں گا اور وہ

اُن کو دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے تقصیروار
ٹھہرائے گا۔ گناہ سے اس لئے کہ وے مجھ پر ایمان نہیں لائے
راستی سے اس لئے کہ میں اپنے باپ پاس جاتا ہوں اور تم
مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت سے اس لئے کہ اس جہان کے
سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں کہ میں
تمہیں کہوں، پر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب
وہ یعنی رُوحِ حق آئے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائیگی
اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی
اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گی، وہ میری بزرگی کرے گی۔"

یہ یوحنا نبی کے باب ۱۴ کی نشان ۷ سے ۱۳ نشان تک کی آیت ہے
میں نے اس آیت کو سمجھنے کے لئے اپنے استادوں، کلیسا کے بزرگوں اور
کتاب مقدس کے عالموں کی طرف رجوع کیا۔ سبھی اسی بات پر اتفاق کرتے
تھے کہ جلال والے خدا کے بیٹے نے ایک اور نبی کے آنے کی اطلاع دی ہے
انہوں نے کہا کہ اسی آیت کے ساتھ ساتھ یوحنا کے چودھویں باب کی آیتیں
پڑھوں۔ اور میں نے اُن کے حکم کے مطابق اُن آیات کا بغور مطالعہ کیا۔ خدا
کا بیٹا اُن ابواب میں فرماتا ہے:۔

"اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے کلموں پر عمل کرو اور میں
اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا
تسلی دینے والا بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔ یعنی

روحِ حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی۔"

پھر فرمایا:۔

"جب وہ تسلی دینے والا جسے میں تمہارے لئے باپ کی
طرف سے بھیجوں گا۔ یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے
آئے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا۔"

اسی باب میں نشان ۲۵ سے ۳۱ نشان تک میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے تم سے کہیں
لیکن وہ تسلی دینے والا جو روحِ قدس ہے جسے باپ میرے
نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھلا دے گا۔ سلام
تم لوگوں کے لئے چھوڑ کے جاتا ہوں ——— بعد اس کے
میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا اس لئے کہ اس جہان کا سردار
آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں ———"

پھر بارھویں باب کے ۴۷ نشان میں ایک غیر مبہم نشانی ارشاد ہوئی ہے۔

استاد نے فرمایا:۔

"اگر کوئی شخص میری بات سنے اور ایمان نہ لائے تو میں اس
پر حکم نہیں کرتا۔ کیوں؟ میں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ جہان پر
حکم کروں بلکہ اس لئے کہ جہان کو بچاؤں۔ وہ جو مجھے رد کرتا
اور میری باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے لئے ایک حکم کرنے
والا ہے۔"

اے میرے سننے والو ___! کان دھر سنو کہ یہ مسیح ابن اللہ کے ارشادات ہیں۔ خداوند خدا نے اپنے بیٹے کی وساطت سے ہم دنیا والوں کو نہ صرف اپنی بادشاہی کا وعدہ فرمایا بلکہ ایک ایسا تحفہ بخش دینے کا وعدہ بھی کیا جو اس جہان کا سردار بھی ہو گا۔ جو ایک کامل شریعت لے کر آئے گا۔ جو مسیح کی باتوں پر ایمان نہ لانے والوں اور اسے رد کر دینے والوں کو معاف نہیں کرے گا بلکہ حکماً اپنی شریعت کو منوائے گا۔ جو انکار کرنے والوں کو سزا دے گا۔ وہ روحِ حق جو خداوند یسوع مسیح کے بعد اس دنیا میں حکومت کرنے اور دنیا کو سچی راہ پر چلانے کے لئے آئے گی، اپنی بات نہیں کہے گی۔ بلکہ جو کچھ آسمانی باپ سے سنے گی وہی من وعن ہم دنیا والوں تک پہنچا دے گی۔ وہ آنے والی باتوں کی پیشین گوئی کرے گی اور وہ خداوند یسوع مسیح کی بزرگی کرے گی ___"

"لیکن وہ نبی کس قوم میں برپا ہو گا محترم استاد؟" ورقہ جو سراپا عقیدت بنے ہوئے تھے بولے۔

"بڑا اچھا سوال کیا ___" راہب نے کہا۔

"خاک اچھا سوال ہے۔" عبدالمطلب کی پیٹھ پر شدید کھجلی اٹھ رہی تھی لیکن وہ کسمسانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے تھے۔

"میں نے بھی اپنے پیرو مرشد پر یہی سوال کیا تھا۔ انہوں نے مجھے خود اپنی طرف سے جواب نہیں دیا بلکہ مجھے کتابِ مقدس کے عہد نامہ عتیق کی طرف رجوع ہونے کا حکم فرمایا۔ میں نے مدتوں عہد عتیق کے اوراق چھانے

اور بالآخر مجھے یسعیاہ نبی کی کتاب کے باب ۴۲ نے ایک نیا راستہ دکھایا مذکورہ باب میں لکھا ہے :-

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا۔ میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی۔ ▪ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلائے اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا ——— وہ عدالت کو جاری کرے گا کہ دائم رہے۔ اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا۔ جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں ———

خداوند خدا جو آسمانوں کو خلق کرتا اور انہیں تانتا جو زمین کو اور انہیں جو اس میں سے نکلتے ہیں پھیلاتا اور ان لوگوں کو جو اس پر چلتے ہیں روح بخشتا، یوں فرماتا ہے ——— میں خداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا ——— میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بندھوں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑالے۔ یہوواہ میں ہوں۔ یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی کھودی ہوئی مورتوں کے

لیئے نہ ہونے دوں گا۔ دیکھو تو سابق پیشین گوئیاں برآئیں
اور میں نئی باتیں بتلاتا ہوں اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں
تم سے بیان کرتا ہوں۔
ایک نیا گیت گاؤ ـــــ اے تم جو سمندر پر گزرتے ہو
اور تم جو اس پر بستے ہو، اے بحری ممالک اور ان کے باشندو
تم زمین پر سرتاسر اسی کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس ـــــ
کی بستیاں۔ قیدار کے آب دار دیہات اپنی آواز بلند کرینگے
سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑیوں کی
چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وے خداوند کا جلال ظاہر
کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثناخوانی کریں گے۔
خداوند ایک بہادر کی مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کی مانند اپنی
غیرت کو اکسائے گا۔ وہ چلائے گا ـــــ ہاں وہ جنگ کے
لئے بلائے گا۔ وہ دشمنوں پر بہادری کرے گا ـــــ

کانی گنجک ارشاد ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ میں مدتوں تک کلیسا کے دوسرے علماء کی طرح اس پیشین گوئی کو بھی اپنے محافظ و آقا خداوند یسوع مسیح ہی کے لئے سمجھتا رہا لیکن میں اپنے استادوں اور دوستوں سے جوں جوں اس مسئلے پر گفتگو کرتا یہ گتھی زیادہ سے زیادہ الجھتی چلی جاتی۔ مجھے دھیرے دھیرے یہ خیال ہوتا گیا کہ خدا کا یہ فرمان اس کے بیٹے کے متعلق نہیں ہو سکتا میں متی نبی کے اس قول کو غلط سمجھنے لگا کہ یسعیاہ نبی کی یہ پیشین گوئی ہمارے آقا کے لئے

ہے۔ اس پیشین گوئی کا پہلا لفظ ہی متی نبی کے اس قول کو غلط قرار دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے "میرا بندہ" اور خداوند یسوع مسیح کو کبھی بھی اس کے باپ نے اپنا بندہ کہہ کر نہیں پکارا بلکہ اپنا پیارا بیٹا کہا ہے بیٹے کے لئے بندہ اور غلام کا لفظ استعمال نہیں ہوا کرتا۔

پھر ارشاد ہے:-

"وہ نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کر لے ——"

ہمارے آقا و مولا کو دشمنوں نے صلیب پر کھینچ دیا تھا، غیر مبہم اور واضح اقرار ہے۔ اس لئے خداوند یسوع مسیح کے متعلق یہ کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس وقت تک نہیں مسلے گئے جب تک کہ انہوں نے راستی کو زمین پر قائم نہیں کر لیا۔

یہوداہ نے صاف فرمایا ہے،

"قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا ——"

مقدس خدا کا محترم بیٹا صرف ایک قوم کے لئے آیا تھا۔ بنی اسرائیل کے لئے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں:—

"میں بنی اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"

حضور ارشاد کے اپنے قول کے مقابلے میں جو خود متی نبی نے اپنی انجیل کے پندرھویں باب میں نقل کیا ہے، یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ "قوموں کا نور"

لفظ کا اطلاق حضور استاد پر ہوتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ خود متی نبی نے
اس نسبت کو کس طرح جائز قرار دیا ہے۔

پھر یہوداہ فرماتا ہے:۔

"وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی کھودی ہوئی مورتیوں کے
لئے نہ ہونے دوں گا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یسعیاہ نبی کے ذریعہ یہوداہ نے جس برگزیدہ کا ذکر کیا ہے وہ ایسی قوم میں پیدا ہوگا اور اس کا مقابلہ ایسے لوگوں سے ہوگا جو بت پرست ہوں گے۔ جو اُس ستائش کو جو صرف یہوداہ کے لئے ہوتی ہے ایسی مورتیوں پر ضائع کر رہے ہوں گے جو کھودی ہوئی ہوں گی۔ لیکن خداوند یسوع مسیح کا مقابلہ ایسی کسی قوم سے نہیں ہوا۔ بنی اسرائیل بت پرست نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے توریت کے احکام کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ انہی کھوئی ہوئی اور بکھری ہوئی بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے خداوند خدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا تھا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:۔

"قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ اور
سلع کے بسنے والے گیت گائیں گے۔"

خداوند یسوع مسیح کا گزر کبھی بھی قیدار کے آباد دیہاتوں کی طرف نہیں ہوا اور نہ ہی انہوں نے سلع کے بسنے والوں کو کبھی مخاطب فرمایا بلکہ ابھی تک مسیحی علماء کو معلوم ہی نہیں کہ قیدار والے کہاں بستے ہیں۔ ان کے آباد دیہات

کہاں ہیں۔ سلع کہاں پر واقع ہے اور اس کا اس پیشین گوئی سے کیا تعلق ہے۔

میں مدتوں تک قیدار اور سلع کی اس گتھی کو سلجھانے کے لئے سرگرداں رہا۔ مختلف علما نے اس کی مختلف تاویلیں بتائیں لیکن ان میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھی کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا۔ آخر ایک دن رات کے وقت جب میں اسی پریشانی میں اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا میرے سامنے ایک نئی تاویل خود بخود ظاہر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے کشف ہوا ہے۔ میری مادی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور میری روحانی آنکھوں نے کتاب مقدس کو ایک بار پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ نئے انداز اور نئے زاویہ نگاہ سے اور میری روحانی آنکھوں نے آتشیں حروف میں کندہ یہ بامعنی آیت پڑھی:۔

"عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے ــــ اے ددانیوں کے قافلو! پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خدا نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے باقی لوگ گھٹ جائیں گے"

یہ بھی یسعیاہ نبی کی کتاب کا اکیسواں باب ہے اور میری زندگی میں یہ

دان پہلا دن تھا۔ جب کسی مفسر اور عالم کی مدد کے بغیر میں نے کتاب مقدس کی اس آیت کو سمجھ لیا میرے ذہن میں خود بخود غیر ارادی طور پر چند سوال ابھرے دوانی کون ہیں ـــــ؟ تیما کی سرزمین کہاں پر واقع ہے اور اس کے باشندے کون لوگ ہیں ـــــ؟ قیدار والے کون ہیں جن کا زور بھاگنے والے کے بھاگ جانے سے ٹھیک ایک سال بعد ٹوٹ جائے گا ـــــ؟

اور پھر معاً دماغ میں سوال پیدا ہوا۔ یہ بھاگنے والا کس کی ننگی تلواروں اور کس کی کھچی ہوئی کمانوں کے سامنے بھاگے گا ـــــ؟

کیا یہ قیدار والوں ہی کی کمانیں اور انہی کی تلواریں نہیں ہوں گی؟

یقیناً میرے دل نے دھڑک کر جواب دیا۔

اور پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بھاگنے والا قیدار والوں ہی میں سے ایک ہو ـــــ؟

میرا دل ساکت سا ہو گیا جیسے ایک عظیم الشان حقیقت کے سامنے دم بخود رہ گیا ہو۔ میرے ذہن میں تجسس سوئیوں کی طرح رینگنے لگا اور جیسے کسی تیسری آواز نے میرے ذہن کی کسی پوشیدہ محراب میں بڑی قرأت کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کی کتاب استثناء کے اٹھارویں باب کی یہ آیت پڑھی ہے۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے ہی درمیان میں سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی طرف کان دھریو۔ اس سب کی مانند جو تو نے اپنے خداوند سے حواب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ

ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت
کی آگ میں پھر دیکھوں تاکہ میں مر جاؤں اور خداوند نے مجھے
کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں اُن کے لئے اُن
کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور
اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا
وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں
کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا، تو میں اُس کا
حساب اُس سے لوں گا۔"

اور میرے ذہن کی تاریکیاں آہستہ آہستہ چھٹنے لگیں۔ بنی اسرائیل نے
جواب کے میدان میں جمع ہو کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کی تھی کہ یا رب
الافواج ایسا ہو کہ تیرا جلال پھر ظاہر نہ ہو۔ تیری آتشیں شریعت جو موسیٰ کے
ذریعہ ہم پر ظاہر ہوئی دوبارہ ہم پر ظاہر نہ ہو۔ وہ خوفناک شریعت جو ناچتے
ہوئے شعلوں کی صورت میں پہاڑ کی بپھرائی ہوئی سطح پر لپک اٹھی تھی ہمیں
پھر دیکھنی نصیب نہ ہو۔ تیری وہ غضب ناک آواز جس نے فلک پیر کو لرزہ
براندام کر دیا تھا۔ پھر ہمارے کانوں میں نہ آئے۔ اس دعا کے جواب میں
رب الافواج نے حضرت موسیٰ کے ذریعہ یہ جواب دیا تھا کہ تمہاری دعا
قبول ہوئی۔ اب موسیٰؑ سا نبی تم میں برپا نہ ہو گا۔ لیکن

۱۔ تیرے بھائیوں میں سے ایسا نبی آئے گا۔

۲۔ جو موسیٰ کی سی شریعت لے کر ظہور فرمائے گا۔

۳۔ خدا اپنا کلام اس کے ذریعہ ظاہر فرمائے گا۔

۴۔ اور خداوند خدا جو کچھ اسے الہام فرمائے گا وہ من و عن قوم کو سنا دے گا

۵۔ اور قوم کا جو فرد اس کی بات کو نہیں سنے گا خداوند خدا اُس سے اس گناہ کا حساب لے گا۔

یہ تھا اس عظیم الشان پیشین گوئی کا تجزیہ جو میرے کمزور دماغ نے کشف کی مدد سے کیا۔ اس تجزیئے کے پیش نظر جیسے مجھے خود بخود یہ احساس ہو گیا ہو کہ اس پیشین گوئی کے مصداق بھی ہمارے رہبر و محافظ یسوع مسیح نہیں بن سکتے کیونکہ:۔

۱۔۔۔۔۔ یسوع مسیح اسرائیل کی بھیڑوں کو یکجا کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اسرائیل کے بھائیوں میں سے نہیں تھے۔ اور پیشین گوئی کی پہلی شرط یہ ہے کہ نبی موعود اسرائیل کے بھائیوں میں برپا ہو گا۔

۲۔۔۔۔۔ خداوند یسوع مسیح موسیٰ کی سی آتشیں شریعت کے مظہر نہیں ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ تو محض بکھری اور بھٹکی ہوئی بھیڑوں کے پاس امن اور آشتی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ خداوند خدا نے اپنے بیٹے کو اس لئے اس دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ اسرائیل کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔ صلیب پر اپنی جان دے کر اُن لاکھوں کروڑوں اسرائیلیوں کو عذاب اور قہر خداوندی کے دو درمیں ہاتھوں سے بچا لے۔

۳ ــــــ خداوند یسوع مسیح نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ الہام کے زیر اثر فرما رہے ہیں بلکہ انہوں نے ایک عام مصلح کی طرح اسرائیلیوں کے سامنے شریعت موسوی کو رکھا اور اس پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن قوم نے ان کے پیغام کو غلط سمجھا۔ انہیں مجرم اور قاطع شریعت موسوی ٹھہرایا۔ اور اس جُرم کی پاداش میں اپنے مصلح اعظم کو صلیب پر کھینچ دیا۔

چوتھی بات ظاہر ہے۔ جناب یسوع مسیح نے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس کے متعلق الہام کا دعویٰ ہو اور پانچویں شق بھی اسی سے متعلق ہے

میرے ذہن نے اس طرح حضرت موسیٰ کی اس پیشین گوئی کا تجزیہ کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ یہ آیت حضور استاد سے متعلق نہیں ہے۔

تو پھر وہ کون ہے جس کے متعلق خداوند خدا نے موسیٰ کے ذریعہ قوم کو خوشخبری دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس ساری آیت کو سمجھنے کی کنجی اسی آیت میں ہے اور وہ ہے "تمہارے بھائیوں میں سے" اور ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہو گیا۔

بنو اسرائیل کے بھائی ــــ کون تھے یہ لوگ؟

اور میں کئی دن اس سوال میں سرگرداں رہا۔ آخر ایک دن سوچتے سوچتے مجھے معاً خیال آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ اولاد جو اسحاق نبی اور ان کے بیٹے یعقوب نبی کے ذریعہ پھیلی وہ بنی اسرائیل کہلائی۔ ان کا وطن مصر تھا اور جو اولاد اسمٰعیل کے ذریعہ پھیلی بنی اسمٰعیل کہلائی اور ان کا وطن عرب تھا۔ اس لئے اسرائیلیوں کے بھائی اسمٰعیلی ہی ہو سکتے ہیں اور موعود نبی مصر میں بنی اسرائیل

کی بجائے عرب میں بنی اسمٰعیل ہی میں برپا ہوگا۔

لیکن یہ محض خیال تھے۔ میرے پاس ابھی ان کا ٹھوس ثبوت نہ تھا اس لیے میں دل ہی دل میں سوچتا رہتا۔ کبھی اپنے اخذ کردہ نتائج کو شک کی نظر سے دیکھتا اور یہ سمجھنے لگتا کہ یہ سب غلط ہے۔ میں بھٹک گیا ہوں۔ کتاب مقدس کی غلط تاویل کرنے کا گناہِ عظیم کر رہا ہوں۔ اس لیے میں مقدس ماں کے قدموں پر سر رکھ کر شب و روز گڑگڑایا کرتا۔ خدا کے مقدس بیٹے کے سامنے سر نیاز جھکا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اپنی مشکلوں کا حل طلب کرتا۔ اور آخر ایک دن جب کہ کلیسا کی بارعب چار دیواری کی ہواؤں میں عنبر و لوبان کی خوشبوئیں رقصاں تھیں، جب کلیسا کے سرمئی دھندلکے خوشبودار تیلوں سے جلنے والی شمعوں کی مدھم، سرور انگیز روشنی میں نہا رہے تھے ایک جگمگاتا ہوا خیال میرے ذہن کے تاریک غاروں سے ابھرا اور دھیرے دھیرے شرماتے ہوئے بچے کی طرح میرے پیاسے شعور میں آ گیا۔

پرانی تاریخ نے میری مدد کی اور بچپن کی سنی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے نسیان کی اندھیری غاروں سے ابھرنے لگیں۔

دوان ابراہیم نبی کے پوتے یقسان کے بیٹے کا نام تھا اور یہ سبا کے بھائی تھے۔ سبا اور دوان کی اولاد ملک عرب میں پھیلی تھی اور یمن کے ارد گرد آباد ہو گئی تھی۔

تیما اسمٰعیل نبی کے آٹھویں فرزند کا نام تھا۔ جن کی اولاد بھی یمن ہی کے نواح میں آباد ہوئی تھی۔

اس نئی روشنی میں میں نے یسعیاہ نبی کی وہ پیشین گوئی دوبارہ پڑھی۔

"اے ددانیوں کے قافلو ـــــ پانی لے کر پیاسے کا استقبال کرنے آؤ" ـــــ اور ـــــ "اے تیما کی سرزمین کے باشندو ـــــ! روٹی لے کر بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو ـــــ"

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ بھاگنے والا ـــــ یعنی موعودہ نبی ـــــ عرب میں تشریف لائے گا لیکن بنو اسمٰعیل کی اس شاخ میں سے نہیں ہو گا جو ددان اور تیما سے متعلق ہے بلکہ کسی اور ہی جگہ برپا ہو گا۔ وہاں سے کھچی ہوئی کمانوں اور ننگی تلواروں کے سامنے سے بھاگ کر یہاں آئے گا۔ جہاں ددان اور تیما والے اُسے پناہ دیں گے۔

"تو وہ کون سا قبیلہ ہو گا جس میں یہ نبی آئے گا۔"

اس سوال کا جواب آسان تھا ـــــ قیدار والے جن کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے اور جن کی حشمت بھاگنے سے ٹھیک ایک سال بعد جاتی رہے گی۔

اور پُرانی تاریخ نے مسکرا کر ایک اور ورق الٹ دیا۔ قیدار کے لفظی معنی اونٹوں والا ہے اور یہ اسمٰعیل نبی کے دوسرے فرزند کا نام تھا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قیدار کی اولاد اسی جگہ آباد ہو گئی تھی جس کے متعلق پیدائش کے اکیسویں باب میں نازل ہوا ہے۔

"خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا اور تیر انداز ہو گیا اور فاران کے بیابان میں رہا۔"

اے میرے سننے والو ــــــ! یہی فاران کی پُرانی پہاڑی ہے جس نے اسمٰعیل نبی کو ارد گرد پھیلے ہوئے بیابان میں بڑھتے اور تیر انداز ہوتے دیکھا تھا یہی وہ جگہ ہے جہاں برگزیدہ نبی نے قیام فرمایا۔ اور یہی وہ مقام ہے جس کے نواح میں اُن کے دوسرے بیٹے قیدار کی اولاد بس گئی ـ سچی کتاب کی سچی باتوں کی پوری کڑیاں مل گئی تھیں اور میرے ذہن میں موجودہ نبی کی پوری تصویر آگئی تھی۔ وہ نبی عرب میں برپا ہوگا ۔ وہ مکّہ کے نواح میں پیدا ہوگا۔ وہ قیدار والوں کے گھر والوں میں جلوہ افروز ہوگا۔ لیکن قیدار والے اُسے پہچان نہ سکیں گے اُن کی کمانیں اُس کے خلاف کھنچ جائیں گی۔ اُن کی ننگی تلواریں اُس کے خون کی پیاسی ہوکر میانوں میں اچھل پڑیں گی وہ جنگ کی شدت سے مجبور ہوکر بھاگے گا بھوک اور پیاس سے نڈھال ہوگا اور پھر یمن کے نواح میں بسنے والے ددان کے قافلے اور تیما کے باشندے پیاسے کے لئے پانی اور بھوکے کے لئے روٹی لے کر بھاگیں گے۔

اور میں اس روح قدس، اور نور مطلق کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ میں نے فاران کی ترائی کی اس گندی غار کو اسی لئے پسند کیا ہے کیونکہ کتاب استثناء کے تینتسویں باب میں آیا ہے۔

"یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اُس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ اور فاران ہی کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے

ہاتھ ایک آتشیں شریعت اُن کے لئے تھی۔"

سردار عبدالمطلب کو اس ساری لمبی کہانی اور علمی مباحثے میں نام کو بھی دلچسپی نہ تھی ـــــ کیسے ہوا ـــــ کیونکہ ہوا ـــــ موعودہ نبی کون ہیں۔ کہاں سے آئیں گے اور کہاں جائیں گے اور موعود نبی کا مطلب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں ان کے لئے خاصی بے معنی تھیں لیکن وہ پھر بھی ـــــ بنادٹی طور پر ہی سہی پورے انہماک سے ان باتوں کو سن رہے تھے۔ اور اسی انہماک سے بہت حد تک غیر ارادی طور پر انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لئے جب راہب نے اپنی کھلی ہوئی آستینوں میں چھپی ہوئی باہوں کو فاران کی بلندیوں کی طرف اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا،

"اے مکہ کے رہنے والو! انتظار کرو اس مبارک دن کا جب دعائے خلیل مثیل موسیٰ اور نویدِ مسیحا فاران کی ان چوٹیوں پر سے اتر کر تمہارے اندر اتحاد اور اخوت کے چشمے بہادے گا۔"

تو سردار عبدالمطلب کی نگاہیں غیر ارادی طور پر راہب کی باہوں کے ساتھ ساتھ اٹھیں اور فاران کی چوٹیوں تک اٹھتی چلی گئیں۔ لیکن معبود ـــــ!

سردار عبدالمطلب فاران کی طرف غور سے دیکھنے لگے ـــــ اُن کی چمکتی ہوئی آنکھیں کچھ سمٹیں۔ انہوں نے غور سے دیکھا۔ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھاگئی اور وہ بے اختیار ہو کر بول اٹھے،

"محمدؐ"

"محمدؐ" راہب نے حیرت بھرے لہجے میں کہا، "کون محمدؐ ـــــ"

"میرا پوتا" عبدالمطلب نے فاران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ آرہا ہے اپنی دایہ کے قافلے کے ساتھ ـــــ معاف کیجئے گا"

انہوں نے انکسار سے راہب سے معافی چاہی اور ہرنی کی سی سُبک رفتاری کے ساتھ فاران کی ڈھلوان پسلیوں پر چڑھنے لگے۔ راہب نے متجسس نگاہوں سے ورقہ کی طرف دیکھا۔

"سردار قریش کا لڑکا عبداللہ محمدؐ کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے فوت ہو گیا تھا، اس لئے ہمارے سردار کو اپنے پوتے سے بڑی محبت ہے اب وہ بنو سعد کے یہاں پرورش پا رہا ہے۔ ہر چھٹے مہینے ماں اور دادا سے ملنے آیا کرتا ہے۔"

"عربوں میں محمدؐ اور بھی کسی کا نام ہے؟" راہب نے سردار عبدالمطلب کی پوتے سے محبت کو زیادہ وقعت نہیں دی۔

"جی نہیں ـــــ صرف اسی بچے کا نام محمدؐ رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جب یہ نام رکھا گیا تھا۔ قوم والوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا۔ یہ نام عجیب اور ان سنا سا ہے لیکن سردار اس پر مصر تھے۔"

راہب کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔

۸

اور فاران کی ڈھلوان پسلیاں بوڑھے عبدالمطلب کے جوانوں سے زیادہ تیز اور مضبوط پیروں کے نیچے سمٹتی چلی گئیں۔ وہ تیزی سے فاران کی بلند بے آب و گیاہ چوٹی کی طرف بڑھتے گئے۔

حلیمہ کا قافلہ ڈھلوان نشیب پر سے اترتا آ رہا تھا۔ بنو سعد کے دوسرے لوگ بھی حلیمہ کے ساتھ تھے۔ جن میں سے بعض عورتیں ایسی تھیں جو نومولود بچوں کو حاصل کرنے کی امید میں مکے میں آ رہی تھیں۔ بعض ایسی تھیں جو بچوں کو واپس ان کے والدین کو سونپ دینے کے لئے آ رہی تھیں۔ طویل راستے نے سب کو مرجھا دیا تھا۔ لیکن یہ طویل سفر اب ختم ہو رہا تھا۔ مکہ کے اونچے نیچے مکانات دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ آرام اور چند دنوں کے لئے مرغن کھانوں کی امید نے ان تھکے ہارے جسموں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اور سب کے چہرے بشاش ہو گئے تھے۔ سب کی آوازوں میں ایک

انوکھی قسم کا کرارا پن عود کر آیا تھا۔

لیکن حلیمہ اور حرث کے جذبات اپنے ہم سفروں سے بالکل مختلف تھے۔ وہ گھر سے نکلتے وقت بھی اداس تھے۔ حلیمہ کو تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کی دولت اور روشنی سمیٹ کر لئے جا رہی ہے کہ اپنے ہاتھ سے جا کر مکہ میں دے آئے۔ حرث کو اپنے دل کے اردگرد کچھ عجیب قسم کی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز اُس سے چھینی جا رہی ہے اور وہ اس کے خلاف انگلی تک نہیں اٹھا سکتا۔ خود کچھ کرنے پر قادر نہ ہو سکنے کے احساس نے حرث کو جیسے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا، مضمحل سا، دراز گوش پر زین کستا رہا۔ سفر کا سامان لادتا رہا۔ اُسے حلیمہ سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں تھی۔ یا شاید وہ حلیمہ سے آنکھ ملانا نہیں چاہتا تھا۔ آج کچھ چپ چپ تھا۔ مصنوعی مسکراہٹ، خواہ مخواہ کی اُلجھن سامان لادنے تک اس پر طاری رہی تھی اور بالآخر وہ معمولی سی بات پر حلیمہ سے باقاعدہ لڑ پڑا تھا۔ حلیمہ خود نامعلوم وجوہات کی وجہ سے پکتے ہوئے پھوڑے کی طرح اندر ہی اندر پک رہی تھی، حرث کے ایک اشارے سے بہہ نکلی اور دونوں میں جھڑپ ہو گئی —— اور حلیمہ اس شدت کے ساتھ روئی تھی کہ بنو سعد کا ہر فرد و بشر حیران تھا۔ اور پھر جب چھوٹے حضورؐ کو دراز گوش پر بٹھانے کی باری آئی تھی اس وقت تک یہ دونوں اس نقطے پر پہنچ چکے تھے جہاں دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے پشتینی دشمن اور خون کے پیاسے ہیں۔

—— اور قافلہ چل پڑا تھا۔

اور پھر جب رات نے فاتح مشرق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ چھوٹا سا قافلہ پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو گیا، تو حرث نے خلاف معمول حلیمہ سے پوچھے بغیر ایک ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے اپنا خیمہ کھڑا کر لیا تھا اور کوئی بات کئے بغیر خیمے میں سامان رکھ دیا تھا۔ چھوٹے حضورؐ رات بھر حلیمہ کی گود میں سوتے رہے تھے اور ابھی ابھی جاگے تھے۔ حرث رات بھر دراز گوش کی رسیں پکڑے طویل ریگستان کی شبنم آلود ہواؤں میں چلا تھا اور حلیمہ نے رات بھر دراز گوش کے ہچکولوں میں نیم بیدار دماغ کے ساتھ کٹھن جدائی کے بھیانک خواب دیکھے تھے اور چونک چونک کر اپنے جگر گوشے کو سینے سے چمٹا لیا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ اب حرث رات بھر کی تکان دُور کرنے کی غرض سے خوب جی بھر کر سوئے گا، لیکن خیمہ تیار ہو گیا، بستر بچھا دیئے گئے۔ سوکھے گوشت اور کھجوروں سے ناشتہ کر لیا گیا لیکن حرث ابھی تک باہر تھے۔

یہ کیوں نہیں آجاتے —؟ کیوں نہیں سو جاتے —؟ حلیمہ کا دل بار بار اس سے سوال کرتا۔

اور آخر اس سوال کی تکرار سے پریشان ہو کر حلیمہ اپنے خیمے سے باہر نکل آئی تھی۔ انہوں نے دیکھا تھا دُور ایک اور درخت کے تنے سے ٹیک لگائے حرث کھڑے ہیں۔

حلیمہ چھوٹے حضورؐ کی انگلی پکڑے وہاں تک آگئیں۔ میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر غصّہ آرہا تھا۔ حرث

کو اس لئے کہ حلیمہ اس وقت کیوں آئی ہیں۔ حلیمہ کو اس لئے کہ یہ عجیب آدمی ہے۔ اس وقت تک سونے کے لئے کیوں نہیں آیا۔ لیکن دونوں چپ ایک دوسرے کی آنکھوں سے آنکھیں بچانے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر حلیمہ نے چھوٹے حضورؐ کو مخاطب کیا،

"ذرا اپنے ابا سے پوچھئے سوئیں گے نہیں۔"

چھوٹے حضورؐ نے حیرت سے اپنی رضاعی ماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں ــــ؟" سادہ سا سوال "میں کیوں پوچھوں۔"

لیکن اس سوال نے حلیمہ کے جذبات پر سے بندھن ہٹا دیئے۔ وہ جھک کر اپنے رضاعی بیٹے کے قریب بیٹھ گئیں اور بولیں،

"یہ لڑتے جو تھے ہمارے ساتھ۔"

"جی ـــ میں ہی لڑا تھا۔" حرث نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو اور کون لڑا تھا۔ میں تو اندر خیمے میں تھی۔"

"شیمہ نے ہمیں چھاگل لاکر نہیں دی۔ ہم کھڑے چلا رہے ہیں۔ یہ کوئی بات تھی بھلا۔" حرث بھی قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"چھاگل شیمہ نے نہیں دی۔ غصہ مجھ پر کیوں ـــ؟ اس میں میرا کیا قصور تھا؟"

حرث چھوٹے حضورؐ کے پاس بیٹھ گیا جو بڑے انہماک سے کنکر جمع کرنے میں مصروف تھے۔

"تو آخر انہوں نے بھی تو میری آواز سنی تھی۔ شمیمہ سے کہہ نہیں سکتی تھیں کہ چھاگل دے آ۔"

"مگر خیمہ کون اتنا میلوں پر تھا۔ تم اندر نہیں آ سکتے تھے۔"

"تم جو باہر آ جاتیں تو کیا ہو جاتا۔"

چھوٹے حضور اب ان دونوں کے درمیان سے اٹھ کر عقب میں چلے گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بالمشافہ گفتگو میں معروف تھے۔ اور یہ تکرار زور پکڑ رہی تھی کہ یکایک محمدؐ پیچھے سے ہو کر حرث کے کندھے پر چڑھ گئے۔

دونوں یکایک خاموش ہو گئے۔ حرث نے گھوم کر چھوٹے حضورؐ کی طرف دیکھا اور ایک تابناک نہ رکنے والی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"چل میرے گھوڑے۔" محمدؐ کی آواز آئی۔

حرث نے اپنی مسکراتی منور آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا حلیمہ نہ جانے کیوں کوشش کے باوجود مسکراہٹ کو نہ روک سکی تھیں۔ حرث اٹھا اور چل پڑا۔ چھوٹے حضورؐ نے حرث کے دونوں کانوں کو لگاموں کی طرح پکڑ لیا اور حرث بلند آواز میں بولا،

"محمدؐ کی سواری آتی ہے ـــــ محمدؐ کی سواری آتی ہے۔"

اور محمدؐ کی سواری خیمے میں آ پہنچ گئی۔

"اب ہمیں اتار دیجیے۔"

"اب ہمیں اتار دیجیے۔"

حرث نے پوری احتیاط سے چھوٹے حضورؐ کو کندھوں پر سے اتارا

تھا۔ اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا تھا،

"اور حکم؟"

"سو جائیے ــــ"

اور حرث کے جسم میں نیند چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگی۔ وہ کمبل پر لیٹ

گیا ــــ

"مگر ایک شرط ہے۔"

"کیا ــــ!"

"آپ ہمارے ساتھ آئیں۔"

محمدؐ فوراً اپنے رضاعی باپ کے سینے پر لیٹ گئے۔ حرث نے

محمدؐ کو دونوں بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس کے کلیجے کے اردگرد سکون اور سرور

کے قلعے بننے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ دنیا کی ساری دولت کو دونوں

بانہوں میں سمیٹے پڑا ہے۔

"چھوٹے حضورؐ" اُس نے کافی دیر کے بعد کہا۔

"ہوں ــــ"

"آپ کو معلوم ہے آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں ــــ!"

"کہاں بھلا؟"

"دادا سردار اور اماں حضور کے پاس"

"ہاں ـــــ اور ـــــ" حرث کے حلق میں الفاظ ببول کے ملیے کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے،" اور شاید اس دفعہ دادا سردار آپ کو ہمارے یہاں نہ آنے دیں۔"

"ہاں ـــــ"

"آپ کو ہم یاد تو نہیں آئیں گے نا ـــ آپ مکہ میں ہوں گے۔ چچا جان کی کنیزیں اور غلام آپ کی خدمت کریں گے۔ پھر مکہ کا بچہ بچہ آپ کو آنکھوں پر بٹھائے گا ـــــ لیکن محمدؐ۔ قسم تمہاری جو محبت ہم نے تمہیں دی ہے ـــــ اس کی یاد تمہیں ـــــ ستائے گی نہیں۔"

محمدؐ نے سوچتی ہوئی سی آنکھوں سے اپنے رضاعی باپ کو دیکھا پھر ایک عجیب جانفزا مسکراہٹ اُن کالی ـــــ بے حد کالی روشن آنکھوں میں صبح صادق کی روشنی کی طرح پھیل گئی۔ انہوں نے اپنا گال حرث کے سینے سے لگا دیا۔ اور ننھے ننھے ہاتھوں نے حرث کی پسلیوں کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

محمدؐ کے اس جواب نے حرث کو ساری کائنات بخش دی تھی۔

اور اس کے بعد سفر کاٹنا دونوں میاں بیوی کے لئے آسان ہو گیا۔ وہ رات بھر آپس میں باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ بڈھے ستاروں نے اُن کی ہلکی ہلکی کلکاریاں سنیں۔ ریت کے ذروں نے اڑ اڑ کر اس معصوم یتیم کو دیکھا۔ جس کی نیندوں پر ان دونوں کی محبت پہرہ دے رہی تھی۔ لیکن جوں جوں

مکہ قریب آتا گیا دونوں پر پھر ایک سمجھ میں نہ آنے والی افسردگی طاری ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ فاران کی چڑھائی آئی۔ اس وقت دونوں اپنے آپ کو کو بوڑھا محسوس کرنے لگے تھے اور دراز گوش کی رفتار جو سست تھی انہیں ضرورت سے زیادہ تیز محسوس ہونے لگی تھی۔ اُنہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دراز گوش اُن سے اپنے پرانے بدلے چکا رہا ہے اور جلد از جلد مکے کو قریب لے آنا چاہتا ہے۔

لیکن احساس کے باوجود وہ دونوں کچھ نہ کر سکے۔ دراز گوش بڑھتا گیا اور مکہ قریب آتا گیا۔ یہاں تک کہ فاران کی چوٹی نے مکے کو اپنے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ جیسے پیالے کی تہہ میں کوئی خطرناک چیز بیٹھ گئی ہو۔

دراز گوش دوسروں کے ساتھ تیزی سے نشیب پر اترنے لگا۔ پتلی سڑک کھائیوں اور گھاٹیوں، غاروں اور بے ساتی نالوں کی گزرگاہوں سے بچتی کٹتی مکے کی طرف بڑھتی چلی گئی اور حلیمہ کا قافلہ اس سڑک کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری کے ساتھ اترتا چلا گیا ——— یہاں تک کہ ایک لٹکی ہوئی چٹان کی اوٹ سے سڑک ایک خطرناک موڑ مڑی اور ——— معبود ——— !

عبدالمطلب سامنے تھے۔

"محمد" عبدالمطلب نے بڑھتے ہوئے کہا۔

حلیمہ پہچان جانے کے باوجود چاہتی تھی کہ وہ سردار قریش کو نہ پہچانے لیکن اس خواہش ——— زبردست خواہش ——— کے باوجود وہ ادب سے سر جھکا کر سردار قریش کو آداب بجالانے پر مجبور تھی۔

اس وقت تک دادا نے پوتے کو اپنی پھیلی ہوئی باہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ اور آسمان پر فرشتوں نے ایک ملکوتی راگ چھیڑ دیا تھا۔ جس کی ہلکی میٹھی دھن نے اپنی رنگین کہکشاں میں بوڑھے دادا کو لپیٹ کر اُن اثیری بلندیوں پر پہنچا دیا جہاں کی ہلکی غیر محسوس فضائیں کسی مادی چیز کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حرث حلیمہ اور بنو سعد کے قافلے والے سب پیچھے رہ گئے۔ ایک لامحدود لمحے کے لئے، وقت کے ایک ایسے حصے کے لئے جس کو ناپا نہیں جا سکتا لیکن جس کی طنابیں عدم سے ابد تک میں کھچی ہوتی ہیں!

اور پھر جب یہ لامحدود لمحہ گزر گیا تو سردار عبدالمطلب سُن رہے تھے حرث کہہ رہا تھا،

"حضور سردار کو ہماری آمد کی اطلاع کس نے پہنچائی تھی؟"

"تم سمجھ نہ سکو گے حرث۔" نہ جانے عبدالمطلب نے کیوں کہہ دیا تھا ——— وہ جانتے تھے کہ اگر وہ سمجھانا بھی چاہیں تب بھی نہیں سمجھا سکیں گے۔

قافلہ آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اب حرث اور حلیمہ کو اپنی دراز گوش کی رفتار تیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس لئے کہ جس لمحے کے خوف نے یہ ساری شعبدہ بازیاں کی تھیں وہ آ کر گزر چکا تھا۔

اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قافلہ راہب کی غار کے قریب پہنچ گیا۔ راہب، ورقہ بن نوفل اور راہب کے دوسرے شاگرد غار کے دہانے پر کھڑے تھے۔ عبدالمطلب نے عجیب فاخرانہ شان سے کہا،

"یہ ہیں محمد ———"

"محمد ـــــ" راہب نے زیرلب جیسے اپنے آپ سے کہا ہو۔

"ہاں محمدؐ ـــــ میرا پوتا۔ جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی آپ سے کیا تھا ـــــ"

راہب چھوٹے حضورؐ کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے پلٹ کر بوڑھے سردار کو کریدتی ہوئی سی نظروں سے دیکھا اور سوچتے ہوئے لہجے میں کہا،

"یہ نام کس نے رکھا تھا ان کا؟"

"میں نے ـــــ" بوڑھے عبدالمطلب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے کوئی بہت بڑی بات کی تھی۔

"کیوں ـــــ؟" راہب کا سوال اُن کے سوئے ہوئے شعور پر کوڑے کی طرح پڑا۔

"کیوں ـــــ؟"

"ہاں کیوں ـــــ آپ کے خاندان میں ایسا کوئی نام پہلے نہیں تھا۔"

"عرب بھر میں نہیں تھا۔"

"یہ الہامی نام کسی کا ہو نہیں سکتا۔"

"مگر میں نے خود رکھا ہے۔" عبدالمطلب کو اپنے جواب پر آپ شرم سی محسوس ہونے لگی۔

"کسی راہب یا کاہن کے کہنے پر؟"

"نہیں ـــــ" عبدالمطلب سوچنے لگے۔ اور پھر انہیں یکایک یاد آ گیا
اُنہوں نے مکے کے گرد اگرد پھیلی ہوئی پہاڑیوں کو پھر ایک دفعہ انہی مسحور
نگاہوں سے دیکھا اور راہب سے کہا،

"اُن پہاڑیوں کو دیکھئے۔ وہ اُونچی نیچی کٹی پھٹی پھیلی ہوئی پہاڑیاں۔"

راہب نے دیکھا،

"وہاں کیا ہے ـــــ؟"

"آپ نے کچھ نہیں پڑھا ان پہاڑیوں میں؟"

راہب نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے خود ان پہاڑیوں کے حروف
میں لفظ محمدؐ لکھ دیا ہے۔"

راہب نے ایک دفعہ پھر غور سے سردار عبدالمطلب کو دیکھا اور
پھر مڑ کر پہاڑیوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اب وہ صاف پڑھ سکتا تھا فطرت
نے زمین کے سینے پر اس لفظ کی جیسے مہر لگا دی تھی۔

لیکن اس صاف اور واضح لفظ کو پڑھ لینے کے باوجود راہب کا ذہن
صاف نہیں ہوا۔ وہ سوچتا رہا اور عبدالمطلب نے قافلہ والوں کو بڑھنے کا حکم
دے دیا۔

"آمنہؓ کے لئے آپ مقدس نہیں سے بچائیے گا سردار قریش" عقیدتمند
ورقہ بن نوفل نے پوچھا۔

سردار عبدالمطلب نے اپنے پوتے کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ

لیا اور گاتی ہوئی آواز میں کہا،

"میں آمنہ کے ہر دکھ کا مداوا اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں ابن نوفل اب آمنہ کی بیماری دُور ہو جائے گی۔" اور جھومتے ہوئے سے آگے بڑھ گئے۔

راہب اب تک سوچ رہا تھا۔ علم اور وجدان ابھی تک آپس میں دست و گریباں تھے اور بے چارا راہب قافلے کی گرد راہ کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اُس کا ذہن کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کا وجدان جیسے ایک اٹل اور ناقابل ترمیم فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کا بیدار ضمیر اُسے کہہ رہا تھا کہ بوڑھے عبدالمطلب صرف آمنہ ہی کے ہر دکھ کا مداوا لے کر نہیں گئے بلکہ اُن کی مضبوط باہوں نے وہ اکسیر سمیٹ رکھی ہے جس کے لئے عالم انسان ازل سے اب تک چشم براہ تھا۔ لیکن اس کا ذہن ضمیر کی اس آواز کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لئے وہ صرف پریشان ہو سکا اور اسی عالم میں اپنے غار میں چلا گیا ——

بخار نے آمنہ کو اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ ان کا گدرایا ہوا چہرہ کمزوری کی وجہ سے سُت گیا تھا اور سُرخ و سفید رنگت جس پر کبھی طلوع مہر کا گمان ہوتا تھا غروب ہوتے ہوئے سورج کی زردیوں میں جیسے لپٹ گئی ہو۔ وہ اپنے کمرے میں کمبلوں میں لپٹی پڑی تھیں اور اُن کا تصور یہاں سے بہت دور یثرب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں انہیں

لے گیا تھا، جہاں ریتلی مٹی کے ایک اُبھرے ہوئے تودے کے نیچے کوئی سو رہا تھا۔ ایسی نیند جس کے لئے بیداری مقدر نہیں ہوئی اور آمنہ کا تصور نہیں تو وہ ان کی رُوح اس تودے کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ چاہتی تھی کہ منوں مٹی کے یہ سارے دبیز پردے ہٹا دے ـــــ چیر دے ـــــ کھرچ دے اور اپنی وہ دولت اپنی دونوں بانہوں میں سمیٹ لے جسے اس ظالم مٹی نے ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔

"کیوں ـــــ؟" وہ سوچ رہی تھیں، "کیوں چھینے گئے میرے عبداللہ مجھ سے۔ میرے بچے کو کیوں یتیم کر دیا گیا۔ میں نے کیا بگاڑا تھا ان دیوتاؤں کا ـــــ!"

اور سوالات کا یہ طویل سلسلہ عجیب پیچیدگیوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ جناب آمنہ کو اپنا قبیلہ یاد آ گیا اور اپنے بھائی، اپنے چچا، اپنے ماموں، وہ کڑیل عرب جن کی تلواروں میں بجلیاں تھیں اور جن کی پھڑکتی مچھلیوں میں قوت اور طاقت کے سمندر لہراتے تھے۔ جن کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مکہ کا ہر سردار بے تاب تھا۔ جس کے گھروں کے وسیع صحن بڑے بڑے چولہوں سے مزین تھے اور جس کے چولہوں کی آگ پر کبھی راکھ نہیں جمی تھی گھر کا وہ مردانہ حصہ جہاں شب و روز مہمانوں کا ہجوم رہتا تھا، جس کے حلیفوں کی تعداد باغ کی ساری کھجوروں کے سارے پتوں سے زیادہ تھی۔ اور جس کے باغ کی کھجوریں عرب بھر میں اپنی مٹھاس اور نرمی کی وجہ سے مشہور تھیں، اسی گھرانے کی نورِ نظر تھیں آمنہ بنت وہب اور اس گھرانے نے اپنی ہتھیلیوں

کی چھاؤں میں پالا تھا یثرب کی اس کلی کو ـــــ اور پھر اُس کے سسرال کے وہ جوان جن کی کوہ شکن ہمتوں کے سامنے مکّہ کے بڑے بڑے بہادر کانپتے تھے عبداللہ جب آمنہ سے شادی کر کے مکّہ میں تشریف لائے تھے تو آمنہ کو یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک عظیم قلعے کی مضبوط چار دیواری میں محفوظ ہو گئی ہیں۔ اُنہیں یقین تھا کہ ہر مصیبت ہر ادبار ہر آفت ان چار دیواریوں سے ٹکرا کے رہ جائے گی اور اس کا سایہ اندر نہیں آ سکے گا۔

لیکن ـــــ موت ـــــ!

آمنہ بنت وہب نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اُن کے بھائیوں، چچاؤں، ماموؤں کی برق در آغوش تلواریں اور پھڑکتی مچھلیاں، ان کے سسرال والوں کی عظیم قوتیں ـــــ دوست اور حلیف سب اس خاموش دشمن کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے! اور رونے والی کا اتنا ساتھ بھی نہ دے سکیں گے کہ اُس کے آنسوؤں کے خشک ہو جانے کا انتظار کریں ـــــ یہ سب آئے، کڑیل جوان جن کی بہادریاں ضرب المثل تھیں اور عرب کے جوانمرد جن کی تلواروں کی قسم کھاتے تھے، یہ سب آئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک نے بہن کا غم بانٹنا چاہا تھا چاہا تھا کہ وہ بوجھ جو موت نے ان کی بہن کے کندھوں پر رکھ دیا ہے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیں، اپنے کندھوں پر رکھ لیں۔ لیکن یہ غیر مرئی بوجھ، یہ ناقابل تقسیم بوجھ اپنی پوری شدّتوں کے ساتھ آمنہ بنت وہب ہی کے حصّہ میں آیا تھا۔ اور انہی کو اٹھانا تھا۔ اس لئے وہ آنسو بہاتے، اپنی

لاچاری اور معذوری کا اظہار کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ انہیں ہن سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ـــــ اور وہ چلے گئے۔

کیوں ـــــ؟

یہ تنہائی، یہ اداسی، یہ ویرانی کیوں ـــــ؟

سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہونے کی یہ کیفیت کس لئے۔

آہ ـــــ! کس لئے معبود یہ سب کس گناہ کی پاداش میں ـــــ؟

اور یکایک جیسے گھر کی دیواروں کا بوجھ اٹھا کر خاموشی سے کھڑے ہوئے پتھر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ جیسے پر سکوت فضاؤں میں موسیقی کے فوارے اچھل پڑے۔

کون آیا ہے جس نے مغموم فضا میں قہقہوں کے رنگین ستارے اچھال دیئے ہیں ـــــ؟

آمنہ اپنے اداس خوابوں سے نکل کر جیسے اس رنگین فضا میں کود پڑیں انہوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اُن کے ذہن نے پکار کر کہا کون ہے۔ لیکن اُن کی زبان نے نحیف آواز میں پکارا،

"برکہ ـــــ"

پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور آواز دی،

"برکہ ـــــ!"

لیکن برکہ کی بجائے سردار قریش کی آواز تھی۔ انہوں نے جوان لہراتی اور موسیقی کی طرح گنگناتی آواز میں کہا تھا،

"یہ تمہارا گھر ہے"۔۔۔۔ تمہارا اپنا گھر! کس کا گھر۔۔۔۔؟ کون آیا ہے جس کا یہ گھر ہے۔۔۔۔؟

اور برکہ برق کی سی تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی،

"مالکن حضور۔۔۔۔!"

وہ ہانپ رہی تھی۔ جیسے پہاڑ پر چڑھ کر آئی ہو۔

"کون آیا ہے برکہ۔۔۔۔"

"چھوٹے حضورؐ۔۔۔۔!"

"چھوٹے حضورؐ" جناب آمنہ کا ذہن ابھی پوری طرح سے واقعات کو گرفت میں نہیں لے سکا تھا۔ انہوں نے کہنیوں کی مدد سے تکئے پر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ تکئے میں کھجور کے پتے چرچرائے۔

"ہاں حضور۔۔۔۔ چھوٹے حضورؐ تشریف لائے ہیں اور۔۔۔۔ مالکن میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ اتنے خوبصورت۔۔۔۔

"محمدؐ۔۔۔۔؟"

"ہاں مالکن۔۔۔۔ محمدؐ ہی تو۔۔۔۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔۔۔۔؟

اور برکہ عجیب طرح سے گھومی۔ چکرائی اور دروازے میں سے غائب ہو گئی۔ آمنہ کی رگوں میں جیسے زندگی کی لہریں اچھلنے لگی ہوں۔ وہ تیزی سے بستر پر بیٹھ گئیں۔ ان کے پیر ایک عجیب قوت کے ساتھ زمین سے ٹک گئے۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔ قدم بڑھے۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔ دو اور کائنات جیسے چکرا گئی ہو۔ دروازے، کھڑکیاں، کمرے کی دھندلی فضا میں

کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگیں۔ آمنہ نے تیزی سے ہاتھ بڑھایا کہ دروازہ پکڑ لیں۔ دروازہ دور تھا۔ آمنہ لڑکھڑاتی ہوئی سی دروازے کی طرف بڑھیں۔ لیکن یہ کیا معجزہ ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ خود آمنہ کو سہارا دینے کے لئے آگے بڑھ آیا ہے۔ کسی نے آمنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور جیسے کنوئیں کی گہرائیوں میں سے چیخ کر کہا،

"میری بچی ——— میری غمزدہ بچی"

آمنہ آہستہ آہستہ بستر پر لٹا دی گئیں ——— اور کائنات دھیرے دھیرے لامعلوم کی دھندلی فضاؤں میں تیرتی چلی گئی ——— معلوم اور محسوس کی سرحدوں سے دور بہت دور جہاں محسوس کی آوازیں ٹکراتے ہوئے مرئی اثرات میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور پھر یکایک مکمل خاموشی، امٹ سکوت، لامحدود بے خبری!

اور پھر یکایک فضا میں آوازیں بھنبھنانے لگیں۔ یہ آوازیں پہلے کھولتے ہوئے لاوے کی سرسراہٹ سے مشابہ تھیں۔ پھر یہ صاف ہوتی گئیں۔ آمنہ نے اپنے ماتھے پر ایک ننھے سے ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا اور کانوں میں "امی ——— " کا لفظ شہد کے قطرے کی طرح ٹپک پڑا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنے جسم اور اپنی روح کی پوری قوتوں کو سمیٹ کر آنکھیں کھول دیں۔ لیکن آنکھوں پر نہ جانے کس نے ابوقبیس کا پورا پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا تھا۔

آمنہ نے سر ادھر ادھر ہلایا۔ اپنی طرف سے پوری کوشش کر کے

اپنا ہاتھ اٹھایا، ہاتھ لرزتا، کانپتا بلند ہوا اور جیسے آمنہ نے اپنی رگوں کی پوری توانائی اس پر صرف کردی ہو۔ بالآخر ایک جھٹکے کے ساتھ ننھے ہاتھ پر لپیٹ گیا۔ آواز حلق میں خرخرائی اور پھر ہونٹوں پر آکر لفظ میں ڈھل گئی ــــــ،

"محمدؐ ــــــ" بالآخر یہ زندگی بخش نام لینے میں کامیاب ہو گئیں آمنہؓ بنت وہب۔

"ہاں امّی ــــــ" ایک سرور کانوں کے راستے اترا اور جسم کے ہر ریشے میں رینگتا چلا گیا۔

"میرے بچے ــــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ بہت تھک گئی ہیں۔

وہ دن گزر گئے ــــــ!

محمدؐ کی آمد نے اُم محمدؐ کو وقت کے تھوڑے سے حصّے کے لئے بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر دیا تھا۔ اُن کے تحت الشعور نے اپنی پوری قوت خرچ کر دی تھی اور اُن کے جسم کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ محمدؐ کو دیکھ سکیں۔ محمدؐ کے بھولے بھالے متین اور سنجیدہ چہرے پر بکھرتا ہوا ہر جذبہ اُن کی نگاہوں میں چبھتا رہا اور وہ محسوس کرتی رہیں کہ محمدؐ اُن کی بیماری پر پریشان ہیں ــــــ اپنی عمر سے کہیں زیادہ۔

آمنہؓ بنت وہب نے کئی بچے دیکھے تھے۔ شادی سے قبل اُن

کے اپنے چھوٹے بھائی اُن کی گود میں کھیلے تھے۔ان کے علاوہ بڑے بھائیوں اور ماموں کی کثیر اولاد اُن کے ساتھ کھیلی اور اُن کی احتیاط اور ہمدردی کے سایوں میں پلی تھی۔شادی کے بعد وہ ایک بھرے ہوئے گھر میں تشریف لائی تھیں۔ان کے سب سے چھوٹے دیور حمزہ بالکل نوعمر تھے یہی کوئی ڈیڑھ دو سال کی عمر ہوگی۔اس کے علاوہ کئی بچے خاندان میں تھے پھر اڑوس پڑوس کے کئی بچے اور سبھی خاصے ذہین اور تندرست بچے تھے ان سب کے والدین کئی دفعہ بیمار ہوتے اور پھر تندرست ہو جاتے یا موتیں ہوتیں اور بچوں پر ایک لمحی اثر چھوڑ کر گذر جاتیں۔لاشعور کتنا بھی متاثر ہوتا ہو لیکن شعور کے پردے کچھ ہی دنوں کے لئے جھنجھناتے اور پھر آہستہ آہستہ وقت کا غیر مرئی مرہم ان اوچھے زخموں کو مندمل کر دیتا۔وہ اسی طرح اپنی چھوٹی چھوٹی مصروفیات میں پھر محو ہو جاتے اور پھر ماضی ایک دھندلا خواب بن کر شخصیت کی تاریک محرابوں میں دبک جاتا۔

صرف یہی نہیں آمنہؓ کو تو اپنا بچپن یاد تھا — اور کتنے دن بیتے تھے اس بچپن کو گزرے ہوئے ——؟ آج بھی ان کی مغموم جوانی جاکر پھر کبھی نہ آنے والی ان بہاروں کی مراجعت کی چاپ سن رہی تھی۔وہ بات انہیں بالکل اس طرح یاد تھی جیسے ابھی کل ہوئی ہو۔جب ان کی اپنی والدہ بخار میں مبتلا ہو کر یثرب واپس آگئی تھیں۔کتنا سنا سنا اور کھچا کھچا چہرہ دکھائی دیتا تھا ان کی والدہ کا ——؟

آمنہ بنت وہب کو یاد تھا۔اپنی والدہ کی اس حالت کو دیکھ کر اُن

کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک اُن کی والدہ کو مکمل صحت نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ اُن کی چارپائی پر سے نہ اٹھیں گی لیکن وہ اپنے اس ارادے پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں۔ کچھ ہی دیر بعد جب محلے اور خاندان کی عورتیں عیادت کے بہانے آ آکر ادھر اُدھر کی باتوں سے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ کر چلی گئیں تو آمنہ کی سہیلیاں دروازے پر سے جھانکنے لگیں۔ آمنہؓ انہیں کھیلتا دیکھ کر پہلے ہی سے اپنے دل کو تسلی دینے لگی تھیں کہ والدہ کی طبیعت کچھ ایسی ناساز نہیں ہے۔ سہیلیوں کی آوازوں نے اُن کے پہلے ارادے کو کچھ کمزور سا کر دیا تھا ——— اس تاکا جھانکی نے جب اشاروں کی صورت اختیار کی تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ وہ گھر ہی میں تو ہیں اور کھیل میں مصروف ہونے کے باوجود ماں کے پاس رہیں گی۔ اس لئے وہ اٹھیں اور باہر چلی گئی تھیں۔

پھر کھیل اور اس کی مصروفیات ——— شام تک انہیں والدہ کی بیماری وہم معلوم ہونے لگی تھی اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اُن کی والدہ اچھی ہو چکی ہیں۔ تشویش اور پٹی پکڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔

محمد کو اپنے سرہانے متوحش انداز میں بیٹھے دیکھ کر انہوں نے پہلے ہی سمجھا تھا کہ محمدؐ کچھ دیر کے بعد خود ہی اٹھ جائیں گے۔ لیکن شام ہو گئی اور محمدؐ اسی طرح اُن کے سرہانے بیٹھے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے آمنہؓ کا سر دباتے رہے۔

اور معبود ———!

کتنا سرور تھا ان چھوٹے ہاتھوں کے ہلکے میٹھے دباؤ میں ــــ! آمنہؓ
کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی ساری تکلیفیں اُن کے سارے دکھ اس ہولے
ہلکے لمس کے اثر سے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔
اور انہیں یکایک خیال آیا۔ انہوں نے کمزور لرزتی آواز میں کہا،
"دادا کے پاس جاؤ بیٹا۔"
"بیمار تو آپ ہیں امّی۔"
"میں اب اچھی ہو جاؤں گی۔"
"اس وقت میں بھی دادا کے پاس چلا جاؤں گا۔"
آمنہ نے سوچا بچّہ ہے ــــ خود ہی تھک کر چلا جائے گا۔
لیکن کافی دیر کے بعد جب ان کی غنودگی ایک دفعہ پھر ختم ہوئی انہوں
نے دیکھا شمع اُن کے سرہانے رکھی ہے اور اس کے میلے میلے اجالوں میں
محمدؐ کا بھولا معصوم چہرہ خالص سونے کی طرح چمک رہا ہے۔
"تم ابھی تک بیٹھے ہو محمدؐ۔" آمنہؓ نے بڑی دقت سے سر پھیرا کر
پوچھا۔
"جی امّی ــــ آپ آرام کیجئے۔ میں جاگ رہا ہوں۔"
آمنہؓ کا دل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پھیل گیا ہو۔ ان کی رگوں میں طاقت
محسوس ہونے لگی ــــ محمدؐ ــــ اُن کا جگر گوشہ ــــ اپنے آپ میں ماں
کی حفاظت کی طاقت محسوس کرنے لگا ہے۔
"مگر تم تھک جاؤ گے ــــ میرے لال۔"

"نہیں ماں ـــــ مجھے بڑا لطف آرہا ہے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں اچھی ہوں ـــــ اب تم آگئے ہو ـــــ میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی"

اور پھر یکایک اُن کا جی نہ جانے کیوں چاہنے لگا کہ وہ محمدؐ سے عبداللہ کے متعلق باتیں کریں ـــــ اپنے عبداللہ کے متعلق ـــــ اُنہوں نے اپنی دلی خواہش کو بڑی شدت سے دبانے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود وہ مجبور سی ہو کر بولیں،

"محمدؐ ـــــ"

"جی امّی ـــــ"

"جانتے ہو تمہارے ابا کون تھے؟"

"جی ہاں ـــــ بڑے ابا کے سب سے چھوٹے صاحبزادے۔"

"ہاں ـــــ اور محمدؐ وہ ہم دونوں کو بالکل بھول گئے ہیں۔ انہیں کبھی بھولے سے بھی ہم یاد نہیں آتے۔ مر کر آدمی بالکل ختم ہو جاتا ہے محمدؐ ـــــ؟ اس دنیا کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا ـــــ؟ روحیں کیا اُلو ہی بن کر چیختی اور قبروں کے گرد منڈلاتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتا ـــــ؟ اگر رُوح کوئی چیز ہے تو پھر اُسے اپنا ماضی کیوں یاد نہیں رہتا ـــــ؟ اُسے وہ وعدے کیوں یاد نہیں رہتے جو وہ اس زندگی میں کرتی ہے ـــــ؟ وہ وعدے پھر روح تو روح سے نہیں کرتی نا محمدؐ ـــــ؟ یونہی ایک جسم دوسرے جسم کو کسی دلکش فریب میں مبتلا کرنے کے لئے کوئی لفظ بول دیتا ہے اور پھر جب جسم ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ وہ سارے وعدے، وہ سارے لفظ ختم ہو جاتے ہیں

بھی بات ہوئی نہ پھر تو ـــــ؟ مگر ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے ـــــ وعلاے تو رُوح کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک رُوح دوسری رُوح کو پیغام دیتی ہے۔ جسم مر بھی جائے تب بھی اگر رُوح زندہ ہے تو اُسے دوسری رُوح کی خبرگیری کرنی چاہیئے۔"

آمنہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ وہ تھک گئیں ـــــ نڈھال ہو گئیں۔ اور خود بخود چپ ہو گئیں۔ محمدؐ اُن کی ہر بات کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ یہ سارے سوالات اُن کی سمجھ میں نہیں آئے۔ اس لئے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے۔ لیکن اس خاموشی، اس تحیّر سے یکسر خالی خاموشی اور سکوت میں ایک عجیب سنجیدہ اندازِ فکر تھا۔ جسے آمنہؓ نے کبھی کسی بچّے کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔

برکہ نے دروازے میں سے جھانکا اور سوالیہ نگاہوں سے محمدؐ کے اردگرد پھیلے ہوئے مٹیالے اُجالے کو دیکھا۔

"میں آجاؤں چھوٹے حضورؐ"

"برکہ" اُمّ محمدؐ نے نحیف آواز میں پکارا۔

"مالکن حضور ـــــ" برکہ لپک کر اندر آ گئی۔

"تم کہاں تھیں؟"

"یہیں حاضر تھی مالکن حضور ـــــ کئی دفعہ آئی لیکن چھوٹے حضورؐ نے ہر دفعہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا۔ اس لئے شور بے کا بھی

نہ پوچھ سکی۔"

"امّی سو رہی تھیں۔" محمدؐ نے کہا۔

"ہاں۔" برکہ چھوٹے حضورؐ کے قریب آگئی۔ اُس کا جی چاہتا تھا محمدؐ کو اٹھا کر گود میں لے لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ صرف قریب آگئی اور اُس کے ہاتھ چھوٹے حضورؐ کے سر پر آ کر ریشمیں بالوں سے کھیلنے لگے۔

"محمدؐ اب سوئیں گے برکہ۔"

"مگر مجھے تو نیند نہیں آئی ابھی امّی۔"

"آ جائے گی میرے لال ــــــ تم سونے کی کوشش کرو۔ صبح پھر آ جانا ــــ"

محمدؐ جواب دیئے بغیر اٹھ کر پلنگ پر کھڑے ہو گئے اور گھوم کر پلنگ پر سے اترنے کے لئے پلنگ کی اونچائی کا اندازہ کرنے لگے برکہ نے دونوں باہیں پھیلا دیں۔

"چھوٹے حضورؐ ــــ" وہ ان الفاظ کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہ کہہ سکی اور چھوٹے حضور اُس کے کلیجے سے لگ گئے۔ برکہ نے دونوں بانہوں سے انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

نہ جانے کیا بات تھی ــــ برکہ یوں محسوس کرنے لگی کہ اُسے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہے۔ جیسے دونوں جہان کے عظیم خزانوں نے اُس کے سامنے اپنے منہ کھول دیئے ہوں اور برکہ نے ان سارے خزانوں کو دونوں بانہوں میں سمیٹ لیا ہو۔

دوسرے دن محمدؐ اپنے دادا کے ساتھ اپنی والدہ کے کمرے میں
آئے۔ عبدالمطلب نے پریشان نگاہوں سے بہو کے چہرے کو دیکھا۔ ان
کی گرہ دار انگلیاں آہستہ آہستہ اٹھیں اور انہوں نے آمنہ کے ماتھے کو چھوا۔
آمنہ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"کیسی طبیعت ہے میری بچی"؟

آمنہ نے غور سے عبدالمطلب کی طرف دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش
کر رہی ہوں۔

"ٹھیک ہوں ابا حضور۔۔۔" انہوں نے خاصی نقاہت سے کہا
اور ایک دفعہ پھر آمنہ کی پیشانی پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ پیشانی غیر معمولی طور پر
ٹھنڈی تھی۔ عبدالمطلب پھر چپ ہو گئے۔

محمدؐ پلنگ پر بیٹھ چکے تھے۔ عبدالمطلب قریب بچھے ہوئے
تخت پر بیٹھ گئے۔

"ہوں۔۔۔" انہوں نے ایسی آواز میں کہا جس سے معلوم ہوتا تھا
کہ انہیں خود اپنی بات پر یقین نہیں ہے۔ "آج بخار ہونا نہیں چاہئے تھیں۔"
آمنہؓ نے یکایک کہا،

"ابا حضور۔۔۔ میں یثرب جانا چاہتی ہوں۔"

انہیں خود حیرت تھی کہ یہ الفاظ کہاں سے اُن کی زبان پر آ گئے
وہ اس بیماری کے طویل ناقابل برداشت لمحات میں عبداللہ کو ایک لمحے
کے لئے نہیں بھول سکی تھیں لیکن لمحے کے کسی بھی حصے کے لئے اُن کے

ذہن میں یثرب جانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ اور آج ــــ اب ــــ یکایک ــــ یہ لفظ ــــ جیسے وہ خود نہیں اُن کی رُوح نے کہہ دیئے تھے۔

عبدالمطلب نے بھی حیران ہو کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

"یثرب جاؤگی بیٹیا ــــ اس حالت میں۔"

آمنہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئیں۔ جیسے وہ یکایک اپنی شخصیت کی اَن دیکھی محرابوں کے اندر چلی گئی ہوں۔ جیسے وہ یہاں ــــ اس کمرے میں ــــ نہیں تھیں بلکہ اپنے اندر کسی دوسری دنیا میں چلی گئی تھیں۔ وہ اپنی اس دوسری شخصیت کو دیر تک کھڑی گھورتی رہیں جو ان کے سوا کسی دوسرے کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ اس سے جھگڑتی رہیں۔ اس سے پوچھتی رہیں کہ یہ خیال اُسے کہاں سے مل گیا اور اُس نے کیوں اُسے اُن کی زبان پر سے لڑھکا دیا۔ لیکن انہیں کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا دوسری شخصیت سے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اس دوسری شخصیت کا عندیہ سمجھ سکیں۔ محمدؐ کی آواز نے انہیں پھر کمرے میں واپس بلا لیا۔

محمدؐ کہہ رہے تھے،

"یثرب میں کیا ہے امّی؟"

"یثرب میں کیا نہیں ہے بیٹا ــــ؟" اس سے پہلے کہ آمنہؓ خود جواب دیتیں، وہی دوسری شخصیت بول پڑی اور آمنہ پھر بھونچکا رہ گئیں۔

"مگر آمنہ ــــ میری بچی ــــ بہت بیمار ہو۔ اس حالت میں سفر کیسے ممکن ہے ــــ؟"

"مگر ابا حضور اب میں اچھی ہو جاؤں گی ـــــ میرا مطلب ہے ـــ
آپ اگر وعدہ فرمائیں کہ آپ مجھے یثرب جانے کی اجازت دے دینگے
تو میں ـــــ میں بالکل اچھی ہو جاؤں گی ابا حضور"

عبدالمطلب حیران تھے اس عجیب اعتماد، اس مافوق الفطرت یقین کو
کیا کہہ کر رد کر دیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ آمنہ کے اس عجیب سوال
کا کیا جواب دیں اور کس طرح انہیں سمجھائیں کہ یثرب کے سفر میں کوئی ایسی
بات نہیں جس کا وعدہ آمنہؑ کی بیماری دور کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔
انہیں آمنہ کے اس اعتماد کے سامنے اپنا انکار بڑا پھسپھسا معلوم ہوتا تھا۔
انکار کرنے کی جتنی دلیلیں اُن کے ذہن میں آتی تھیں خود بخود رد ہو رہی تھیں۔
محض اس لئے کہ ان تمام دلیلوں کو کاہنوں کے سے اعتماد کی وہ قوت
حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ جو آمنہ کے سوال میں جھلک اٹھا تھا۔ انہیں خود اپنی
ان دلیلوں کے درست ہونے پر یقین نہیں تھا۔

اس لئے وہ کافی دیر تک سوچنے کے بعد بھی کوئی معقول دلیل نہ
سوچ سکے اور آخر تھک ہار کر بولے،

"اچھا ـــــ! اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو چلی جانا لیکن ایک شرط
ہے اور وہ یہ کہ جب تک تم پوری طرح صحت مند اور توانا نہ ہو لو، یہ سفر
نہیں کر سکو گی۔"

"مجھے منظور ہے ابا حضور" آمنہ کے زرد چہرے پر مسکراہٹوں کی
بستیں آباد ہو گئیں۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے خسر سے سب

کچھ مانگ لیا ہے۔ اور اس کے بعد انہیں کچھ اور مانگنے کی حاجت نہیں رہی ہے۔

انہوں نے مسکرا کر محمدؐ کی طرف دیکھا اور خاصی تابناک آواز میں کہا،

"تم بھی میرے ساتھ چلو گے محمدؐ ——؟"

"ہاں امیؔ —— ہم چلیں گے یثرب۔" فوراً جواب آیا۔

اور آمنہ کا دل بے اختیار ہو کر تڑپ اٹھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ محمدؐ کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیں —— اور اس طرح اُس بے پناہ مسرت کا اظہار کر دیں جو نہ جانے کیوں اُن کی رُوح کے ہر گوشے پر بادِ بہاراں بن کر چھا گئی تھی۔

گھر کے دوسرے افراد تو ایک طرف خود امّ محمدؐ کو یہ حیرت تھی کہ یثرب جانے کے وعدے میں ایسا کون سا جادو تھا جس نے یکایک اُن کی طبیعت میں ایسا خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ وہی چار دن کے اندر اندر بخار یکایک ٹوٹ گیا اور جسم حیرت انگیز طور پر اپنے اندر ہر صعوبت اور ہر تکلیف کو برداشت کر لینے بلکہ تکالیف کو پچھاڑ کر رکھ دینے کی قوت محسوس کرنے لگا۔

گھرانے کی عورتوں کو یہ خیال تھا کہ امّ محمدؐ کافی دنوں کے بعد میکے جانے لگی ہیں۔ اس لئے خوش ہیں اور یہ خوشی اُن کی دن بدن سنبھلتی ہوئی صحت

کا راز ہے۔ خود سردار عبدالمطلب دوسروں کے سامنے اس جواز کی تائید کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے سامنے کبھی انہوں نے اس جواز کو اہمیت نہیں دی۔ وہ آمنہ بنت وہب سے ایسا گہرا اور اتنا بے پایاں پیار کرتے تھے کہ اپنی بہو کے ذہن کی اکثر باتیں جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھیں سردار عبدالمطلب پر عیاں تھیں۔ گویا انہوں نے ان تمام واردات کو خود محسوس کیا ہو۔ اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار عبدالمطلب کو خود عبداللہ مرحوم سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی وفات کے بعد یہ محبت اُن کی مغموم بیوہ کے لئے غیر شعوری طور پر وقف ہو گئی تھی۔

بہر حال گھر والوں کی حیرت آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی۔ ام محمدؐ کی علالت افسانہ بن گئی اور ان کی صحت جو بڑی تیزی سے بہتر سے بہتر دن کی طرف بڑھ رہی تھی ایک معمول بن کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ محمدؐ کی آمد سے پورے ۲۱ دن بعد آمنہ بنت وہب نے غسل صحت فرمایا۔

اور ان ۲۱ دنوں میں مکّہ کی سیاست بد سے بدتر کی طرف تیزی سے چلتی رہی۔

ایک طرف عبدیغوث نے مکّے بھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اور دوسری طرف بنو ہوازن کے خیموں میں لاوے سے اُبل رہے تھے۔ بنو ہوازن تو باقاعدہ اپنے حلیفوں کو جمع کر چکے تھے۔ کمانوں اور نیزوں کی مرمّت کر لی گئی تھی اور تلواروں کو صیقل کر لیا گیا تھا۔ قریشیوں کو ایک فیصلہ کن

شکست دینے اور ان کے بے جا حد تک بڑھے ہوئے نسلی غرور کو آخری بار کچل ڈالنے کی پوری تیاریاں کر لی گئیں۔ ان ہنگامی حالات میں سردار عبدالمطلب جیسے ذمہ دار سردار کی مصروفیات ظاہر ہے کہ بہت زیادہ ہو گئیں۔ آمنہ بنت وہب کی صحت کی طرف سے اطمینان ہونے کے بعد وہ پورے طور سے مکے کی بل کھاتی چکراتی سیاست میں کود پڑے۔ صبح سے شام تک صحن کعبہ میں مذاکرات ہوتے۔ سردار عبدالمطلب کعبہ کے سامنے اپنی سفید چادر بچھا کر اس پر بیٹھتے۔ ان کے دونوں طرف ان کے صاحبزادے ہوتے اور سامنے — اکثر ننگے فرش پر — مکہ کے بڑے بڑے سیاس جن میں حرب بن امیہ سب سے پیش پیش تھے آکر بیٹھ جاتے۔ اور بنو ہوازن کے متعلق خبریں سنی جاتیں، اُن پر تبصرہ ہوتا اور عبدالعزیٰ ث قریشیوں کو انتقام لینے پر بھڑکاتا۔

ان موقعوں پر اکثر محمدؐ بھی دادا کے ہمراہ تشریف رکھتے۔ یہ بات حرب کو کئی دفعہ بری طرح سے کھٹکی تھی۔ اُس نے ایک سے زائد مرتبہ مزاح کے انداز میں سردار عبدالمطلب کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ بچے کو ہمراہ لانا اور وہ بھی خاص طور پر ایسے وقت میں جب ایک بہت بڑا فوجی مسئلہ درپیش ہے ایسی محبت کا اظہار کرتا ہے جو وقت کے مناسب نہیں لیکن ان باتوں کے باوجود محمدؐ اکثر دادا کے ہمراہ ہوتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بڑی اہم بات چل رہی ہوتی اور محمدؐ دادا کی پیٹھ سے لگے آگے پیچھے ہل کر جھولا جھولنے میں محو ہوتے۔

حرب اور اُس کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے سرداروں کی کسی بات نے اثر نہیں کیا ـــــ اکثر یہ ہوتا تا کہ کوئی چبھتا ہوا طعنہ سُن کر سردار عبدالمطلب محمدؐ کو اپنی پشت پر سے ہٹا کر اپنی گود میں بٹھا لیتے جہاں محمدؐ چُپ چاپ بیٹھے بزرگوں کی بحث بڑے غور اور انہماک سے سُنا کرتے۔

یہ اکھڑی ادھڑی سیاست ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ بنو ہوازن جنگ کی تیاریوں میں پورے جوش و خروش اور پورے انہماک کا اظہار کر رہے تھے اور اُدھر سردار عبدالمطلب اپنے حلیف قبیلوں سے بات چیت کر رہے تھے کہ شام کو جانے والے ایک قافلہ کی تیاریاں مکّہ کے کوچہ و بازار میں گونج اٹھیں۔

شام کو جانے والا راستہ یثرب سے ہو کر جاتا تھا ـــــ ہاں یثرب ـــــ!

وہی چھوٹا سا شہر جہاں امّ محمدؐ کی دنیا ریت اور مٹی کے چھوٹے سے ڈھیر کے نیچے سو گئی تھی ـــــ چھُپ گئی تھی امّ محمدؐ کی نظر سے۔
اور اسی قافلے کے ہمراہ محمدؐ اور امّ محمدؐ کو یثرب تشریف لے جانا تھا ـــــ

برکہ خوش تھی ـــــ!
اُس نے مچل مچل کر، روٹھ روٹھ کر ـــــ اور بعض دفعہ تو بالکل بچوں

کی طرح آنسو بہا بہا کر مالکن سے ہم کاب رہنے کی اجازت لے لی تھی۔ اور گو اُس کی ہر دلیل کا معقول جواب مالکن نے دیا تھا۔ مثلاً جب اُس نے یہ دلیل پیش کی کہ محمدؐ کی دیکھ بھال کرے گی تو مالکن کی طرف سے یہ جواب ملا تھا کہ یہ کام وہ خود ہی کر لیں گی۔ جب اُس نے یہ کہا کہ راستے میں مالکن اور چھوٹے حضورؐ کو تکلیف ہو گی، یہ کہہ کر اُس کی دلیل رد کر دی گئی کہ تکلیف کی ایسی کوئی وجہ نہیں۔ قافلے میں سب لوگ سردار عبدالمطلب کے عقیدت مند ہیں۔ اس لئے اس دودمانِ عالی کی قابلِ احترام دلہن کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی۔ لیکن جب برکہ منطق اور دلیل بازی سے عاجز آ کر اپنے آخری ہتھیاروں پر آ گئی۔ جب اُس کا منہ پھول کر کپا ہو گیا اور بالآخر جب وہ پکے پھوڑے کی طرح بہہ گئی اور رو دی تو مالکن حضور بھی مجبور ہو گئیں۔

"عجیب مصیبت ہے بھئی تُو تو" انہوں نے فرمایا تھا۔

"تو پھر مار ڈالئے نا ۔۔۔ جان چھوٹے" برکہ نے مچل کر کہا تھا۔

"بہت سر چڑھتی جا رہی ہے تو برکہ" مالکن بظاہر خاصے غصے میں تھیں۔ لیکن برکہ کو بھی تو غصہ آ گیا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے۔ اُسے کیوں نہیں ساتھ لے جایا جا رہا۔ اس لئے اُس نے تنک کر زٹ سے جواب دیا تھا،

"تو حضور میں کب کہتی ہوں ۔۔۔ پھینک دیجئے نیچے ۔۔۔ برکہ مر تو جائے کسی طور"

اور مالکن کے چہرے پر یکایک محبت پھوٹ آئی تھی۔

"بڑی شریر ہے تو۔" انہوں نے فرمایا۔

برکہ نے مالکن کو نرم ہوتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے بڑھی اور پیروں سے چپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی وہ کہہ رہی تھی،

"مجھے نہ چھوڑ کر جائیے مالکن حضور —— دیوتاؤں کا واسطہ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے ورنہ سچ کہتی ہوں جب آپ واپس تشریف لائیں گی تو برکہ زندہ نہ ہو گی۔"

اور مالکن اس کی ہچکیوں کے درمیان کہتی رہیں۔

"اری اٹھ تو —— اری کیا ہو گیا تجھے پگلی —— کیا پاگل پن ہے یہ۔"

اور جب برکہ نے اٹھ کر پھر وہی پاگل پن کی باتیں کیں تو مالکن نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا،

"لیکن آقا حضور ——"

اور برکہ کے آنسو یکایک خشک ہو گئے۔

"سردار آقا تو چاہتے تھے کہ میں ہمرکاب رہوں لیکن حضور —— میرا مطلب ہے وہ بھی تو حضور ہی کے اشارے کے منتظر ہیں۔ آپ اجازت دے دیں تو وہ فوراً مان جائیں گے۔"

"اچھا بھائی —— ہم ہار گئے —— بس —— !"

"تو تیاری کروں مالکن۔" برکہ کی آواز آئی اس کی آنکھوں میں آنسو گویا کبھی آئے ہی نہ تھے۔

"اور کس طرح سے کہوں"

اور برکہ کو بجلی لگ گئی۔ اُس نے گھر بھر میں اودھم مچا دیا۔
صبح قافلے کو روانہ ہونا تھا اور شام کو گھر بھر میں ایک عجیب ہنگامہ تھا۔

سردار عبدالمطلب خود مطبخ میں آئے تھے۔ آج سے قبل آمنہ رض نے انہیں کبھی مطبخ میں نہیں دیکھا تھا۔ تاجروں کا گھرانہ سفر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا کیونکہ سفر ہی تو اُن کا اصل وظیفۂ حیات ہے۔ روزمرہ کا ایک معمول۔ اور پھر ایسا گھرانہ جس میں ایک چھوڑ چھ چھ آٹھ آٹھ تاجر ہوں وہاں سے تو کوئی نہ کوئی سفر کے لئے جاتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے سردار عبدالمطلب نے کبھی سفر کو اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن آج خلاف معمول وہ سخت اُداس تھے۔ اور اپنی اداسیوں کو مصروفیت میں گم کرنا چاہتے تھے آج خود اُن کی نگرانی میں زادِ راہ تیار ہو رہا تھا۔

ستوؤں اور کھجوروں کے تھیلے سردار نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ دیکھے انہیں ہاتھوں پر تولا کچھ حساب لگایا اور ہر بار اُن میں اور ستو اور کھجوریں ڈالنے کا حکم دیا جس کی تعمیل ہر بار کی گئی۔ یہاں تک کہ چرمی تھیلوں میں مزید ستوؤں کی گنجائش نہیں رہی۔ پانی کے مشکیزوں کا معائنہ ہوا۔ گوشت اپنے سامنے بھنوایا گیا اور اس طرح کے دوسرے چھوٹے چھوٹے کام خود سردار کی نگرانی میں ہوئے۔

محمدؐ اور اُمِ محمدؐ کی تیاری بڑی مختصر تھی۔ کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی

اور بس ———

محمدؐ سو چکے تھے اور امّ محمدؐ صبح کے انتظار میں تھیں۔

انتظار کی یہ گھڑیاں بالآخر ختم ہو گئیں۔ خاندان کے اکثر افراد اُونٹوں کو چھوڑنے کے لئے چوک میں آئے تھے۔

وہی چوک جسے آج سے کچھ سال قبل ——— محمدؐ کی پیدائش سے کچھ ماہ پہلے ——— امّ محمدؐ نے اپنے کوٹھے کی منڈیر پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا وہی دھکڑ دھکڑ جلتی ہوئی مشعلیں اور اُن کی مٹیالی مٹگجی روشنی میں چمکتی ہوئی ہاشمیوں کی وہی عبائیں ——— اٹھاؤ، رکھو، پکڑو، باندھو اور چھوڑو کا وہی ہنگامہ ——— وہی عظیم شور۔

آج امّ محمدؐ اونٹ کے کجاوے میں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت کی ہر دم پھیلتی پھسلتی چادر سمٹ آئی ہے اور خود عبداللہ اس قافلے کے ساتھ ہیں۔ ابھی ابھی جب اونٹ لد جائیں گے قافلہ سالار کی تیز بلند آواز گونجے گی اور حدی خوانوں کے نغمے کے ساتھ اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں سے بنی ہوئی یہ ندی بوقبیس کی بلندیوں کی طرف بہنے لگے گی، تو عبداللہ آ جائیں گے۔ وہ امّ محمدؐ کی اونٹنی کی مہار تھامیں گے اور چل دیں گے۔ آمنہؓ کو ایک عجیب قسم کا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب خوشی جس میں ہنگامہ نہیں تھا بلکہ جو آہستہ آہستہ ہولے ہولے اُن کے دل کے ارد گرد اطمینان بن کر رینگ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ اُن کے سارے دُکھ، اُن کی ساری پریشانیاں دُھل گئی ہیں اور وہ اپنے محبوب کے ساتھ

دیارِ محبوب کو جا رہی ہیں۔

یکایک سردار عبدالمطلب کی آواز آئی۔ محمدؐ اُن کی بانہوں میں تھے اور برکہ چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں اٹھائے سردار کے پیچھے پیچھے تیزی سے آ رہی تھی۔ ابولہب اونٹنی سے ذرا فاصلے پر کھڑا کسی تاجر سے شام میں سودے کے لین دین کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔

عبدالمطلب اپنے پوتے سے کہہ رہے تھے،

"اپنی والدہ کا خیال رکھنا بیٹا۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو نا"

"جی بابا ـــــ!" چھوٹے حضورؐ اپنے دادا کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے دادا کے جواب میں سر ہلا کر کہا۔ گویا دادا کے ایک ایک لفظ کو اُنہوں نے اپنے شعور میں محفوظ کر لیا ہے۔

"اور بیٹا ـــــ تمہیں معلوم ہے تمہاری اماں بڑی اداس رہتی ہیں انہیں پریشان نہ کرنا۔ اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے اور اپنی ماں کو پریشان نہیں کرتے اور تم تو بہت ہی اچھے ہو میرے لال ـــــ تم اتنے اچھے ہو کہ کوئی تم سا نہ ہوا تھا"

دادا نے بھینچ کر محمدؐ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ آمنہؓ ان باتوں کو سن کر ایک جھٹکے کے ساتھ الجھن اور ماضی سے نکل کر حال کے مٹیالے دھندلکوں میں آ گئیں۔ ان کے کانوں نے اپنے بچے کی آواز سنی۔

"جی بابا ـــــ میں کبھی پریشان نہیں کروں گا امی کو۔"

"وعدہ ہوا ۔۔۔۔ ؟" دادا کے آنسوؤں کو محمدؐ نے نہیں دیکھا تھا البتہ ان کی سفید گھنی داڑھی کی اوٹ میں ایک اُداس مسکراہٹ کالی کالی تیز آنکھوں سے اوجھل نہیں رہی تھی۔

"جی بابا ۔۔۔۔ وعدہ ہوا!"

بابا نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ چھوٹا سا ہاتھ اس بڑے چوڑے ہاتھ کی پہنائیوں میں سمٹ گیا۔ جو مکے کی منہ زور سیاست کی راسیں کھینچتے کھینچتے کھردرا اور سخت ہو گیا تھا۔ بابا محسوس کر رہے تھے، اگر شعوری طور پر نہیں تو ذہنی طور پر یقیناً محسوس کر رہے تھے کہ اس ننھے ہاتھ کے ہلکے کمزور دباؤ میں اعتماد کی وہ قوت ہے جو بہت کم ہاتھوں کو نصیب ہوتی ہے ۔۔۔ کسی کو نصیب نہیں ہوتی ۔۔۔۔!

بابا ہنس دیئے اور انہوں نے محمدؐ کو اٹھا کر محمل میں بٹھا دیا۔

صبح کاذب کی تاریکیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ جب سالارِ قافلہ کی گرجدار آواز نے اونٹوں کو بلبلانے کا حکم دیا۔ گھوڑے ہنہنانے لگے اور قافلے میں مد و جزر کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

حارث، ابی طالب اور دوسرے چچاؤں نے بھتیجے کو پیار کیا بھاوج کو الوداع کہی اور برکہ کو دھیان رکھنے کی ہدایات دیں۔

سردار عبدالمطلب نے بڑھ کر اپنے پوتے کا چہرہ اپنی چوڑی ہتھیلیوں میں سمیٹ لیا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے تھے۔ اُنہوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آمنہ کی طرف دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا،

"میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں بنت وہب ——! لیکن میں تم سے اپنی امانت واپس لینے کے لئے زندہ رہوں گا —— محمدؐ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔"

اور آمنہ کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔ اپنے عظیم فرض کا شدید احساس آج پہلی دفعہ اور بالکل نئے انداز میں ان کے ذہن کی محرابوں میں انگڑائیاں لینے لگا تھا۔

سردار عبدالمطلب اونٹنی کے ساتھ ساتھ بوقبیس پر چڑھنے لگے۔ امِ محمدؐ کے کہنے پر اُنہوں نے کہا تھا۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں بیٹا!"

اور قافلہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سڑک بوقبیس کی بلندیوں پر پہنچ کر دوسری طرف ڈھلوان کی طرف مڑ گئی۔

سردار عبدالمطلب رک گئے —— اُنہوں نے ہاتھ ہلا کر کہا،

"بنت وہب میں اگلے شعبان کو اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا —— یاد رکھنا بیٹیا ایک بوڑھا باپ تمہارا اور تمہارے بچے کا منتظر ہو گا۔"

بنت وہب کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی سی اِن بیا در آ گئی۔ اُنہوں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن وہ سردار عبدالمطلب کے پریشانیوں میں ڈھکے ہوئے چہرے کو نہ دیکھ سکیں —— اُنہوں نے اپنا چہرہ دوسری

طرف گھما لیا ـــــ!

اور قافلہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اونٹوں کے پیر سپاٹ ریتیلے میدان کو چھونے لگے۔ آمنہ محمل کی جھریوں سے دیکھ رہی تھیں۔ دور بوقبیس کی بلندیوں پر ایک چھوٹا سا نقطہ ابھی تک دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اُفق کے سینے میں کوئی چیز چبھ کر رہ گئی ہو ـــــ!

یثرب میں

چھوڑ کر غنچے کو صحرا میں صبا رخصت ہوئی
دے کے اک پیغامِ نو موجِ ہوا رخصت ہوئی

۱

مکّہ اور یثرب میں زمین آسمان کا فرق ہوگا، یہ برکہ کے تصوّر میں بھی
نہیں آسکتا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آٹھ دس روز کا سفر کر کے
ایک ملک کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں نہیں آئی بلکہ ایک دُنیا سے
دوسری دنیا میں آگئی ہے۔ یہاں کے زمین و آسمان مکّہ کے زمین و آسمان سے
مختلف تھے۔ اتنی عظیم تبدیلی تھی کہ برکہ کا ذہن کئی دنوں تک اس تبدیلی سے
ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ جب وہ لوگوں کو مکّہ جیسی صاف ستھری زبان ہلکے
سے بدلے ہوئے انداز میں بولتا سنتی تو یک لخت چونک سی جاتی اور
لمحے کے ایک چھوٹے سے حصّے کے لئے یہ محسوس کرنے لگتی کہ پردیس میں
وہ یکایک کسی ہم وطن سے مل گئی ہے۔ یہ احساس اُسے دن میں ایک دفعہ
نہیں کئی دفعہ ہوتا تھا۔ اور وہ ہر بار ایک عجیب سا دھچکہ محسوس کرتی تھی
بازار میں دکاندار سے گفتگو کرتے وقت وہ جھجکتی تھی۔ اُسے ذہنی طور پر

یہ شک رہتا تھا کہ شاید دکاندار اُس کی زبان نہ سمجھ سکے اور آٹے کی بجائے کوئی اور چیز اس کی جھولی میں ڈال دے۔

اور اس کی وجہ تھی۔ چاروں طرف اونچی اونچی سُرخ تپتی ہوئی ننگی پہاڑیوں سے گھرا ہوا مکہ اُس کی ذہنی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ مکہ کی بے پناہ گرمی ——— شدید چمکیلی دھوپ۔ تیز گرم ہواؤں کے پاگلوں کی طرح چکراتے، بل کھاتے بگولے، چاروں طرف پھیلی ہوئی خشک، ریتلی، کنکر آلود سرخ زمین جس کا بانجھ پن اس کی صورت سے ظاہر تھا۔ بارش کے موسم میں پہاڑیوں پر تیزی سے آبشاروں کی شکل میں گرتے، شور مچاتے، برساتی نالے، جو اپنی عارضی زندگی کا مرثیہ اس طرح چیخ چیخ کر سناتے تھے گویا قتل کی سزا پا کر کشاں کشاں مقتل کی طرف کھنچے جا رہے ہوں۔ اور پھر طویل لرزتی گلابی شامیں جو غروب آفتاب کے بعد بھی گھنٹوں مغرب سے لے کر مشرق تک گلال اڑاتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد آنے والے دہکتے لرزتے ستارے جن کی روشنیاں باریک ریت سے لدی ہوئی ہواؤں کے دبیز پردے چیرنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھیں ——— اور ان سب پر مستزاد بے پناہ، بے انداز شبنم جو دن بھر دھوپ کی شدت سے پھیلنے والی چٹانوں کو یکایک اپنی خنکیوں میں ڈبو کر ریت کے انباروں میں بدلتی رہتی تھی۔ عناصر کے یہ عجیب انداز اور ان سے عجیب تر مکے کے رہنے والوں کے طبائع ——— ایک طرف حرب بن امیہ جھوٹے شان و شکوہ کی شدید بھوک کا مریض اور دوسری طرف خود مکہ کے محترم آقا سردار

عبد المطلب جنہیں خاندانی وقار کے ساتھ ساتھ عظیم شخصیت بھی عطا کی گئی تھی۔ صحن کعبہ میں بچھی ہوئی چادر اور کعبہ کی دیواروں کے سائے میں بیٹھے ہوئے مکّہ کے بڑے بڑے سردار جن کی چتونیں ہمیشہ شکن آلود رہتی تھیں اور جن کی تلواریں میانوں سے تڑپ کر باہر آجانے کے لئے ہر دم کوئی معمولی سے معمولی بہانہ ڈھونڈا کرتی تھیں اور ان ساری شدید عنصری اور جذباتی شدتوں کے باوجود مکّہ دلہن کی طرح سجا رہتا تھا۔ دُور دُور تک پانی اور سبزے کا نشان نہ ہونے کے باوجود مکّہ کے بازار ہر طرح کی نعمتوں سے لدے رہتے تھے۔ ہر قسم کا پھل، ہر طرح کی کھجوریں، ہر قسم کا گوشت اور غلّہ جتنا چاہیے خرید لیجئے۔ یہ سب عجیب تضاد — یہ ساری عجیب کیفیتیں برکہ کی رُوح کا جزو تھیں۔ وہ محسوس کیا کرتی تھی۔ پہلے یہ احساس شعوری نہیں تھا۔ لیکن یثرب میں آکر شعور کی پوری وسعتوں کو محیط ہو گیا کہ وہ — برکہ — ایک منفرد شخصیت نہیں ہے۔ ایک اکائی کا درجہ اُسے حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ وہ مکّہ کا ایک حصّہ ہے جیسے مکّے کے کسی ٹکڑے — جیسے اس سرخ، بنجر، بانجھ زمین کے کسی حصّے میں جان آگئی ہو اور وہ اپنے اصل جسم سے علیحدہ ہو کر گھومنے لگا ہو۔ اور یثرب کے بازاروں میں گھومتے وقت برکہ کو اپنی شخصیت کے متعلق اس نئی دریافت پر حیرت ہوتی تھی وہ ایرانی الاصل ہونے کے باوجود کسی قدر مکّی ہو چکی تھی — مکّہ نے اسے کسی حد تک اپنا لیا تھا۔

یثرب گویا اس کی ذات سے کوئی الگ چیز تھی۔ اس کی تین طرف

پھیلی ہوئی اونچی نیچی سیاہ پہاڑیاں جو لاوے سے بنی ہوئی معلوم ہوتی تھیں برکہ کی انفرادیت سے مختلف تھیں۔ اس کی اونچی اونچی کھجوریں، اس کے سبز پوش نخلستان، اس شہر میں پانی کی فراوانی، جگہ جگہ پر کھارے اور میٹھے پانی کے کنوئیں، تالاب، اس کی نرم نرم دھوپ، جس کی نرم گرمیاں صبح کے وقت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ٹھنڈی ہوائیں، کھلے کھلے مکان، مکانوں کے سامنے وسیع صحن، فراوانی رزق کے تمام نشانات، یہودیوں کی بڑی بڑی توندیں اور گول چمکتی ہوئی دھلی دھلائی کھوپریاں، ان کی لمبی داڑھیاں اور ہونٹوں پر لٹکی ہوئی مونچھیں جن کے اندر اُن کے ہونٹ چھپ جاتے تھے اور ان کی مسکراہٹیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ محلوں میں بٹا ہوا شہر اور ہر محلے میں ایک ہی خاندان کے لوگ ـــــ گویا شہر کے اندر چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہو گئے ہوں ـــــ جو ہر طرح سے خود کفیل تھے۔ یہ سب چیزیں مکے سے بہت مختلف تھیں ـــــ برکہ سے بہت مختلف تھیں۔ یہ سب کچھ برکہ کی شخصیت کا حصّہ نہ تھیں۔ ان چیزوں نے برکہ کی تعمیر میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا۔ اس لئے برکہ ان کے درمیان کچھ اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ یثرب اُس کا اپنا نہیں تھا۔ اس لئے برکہ آٹھ ہی دس دنوں میں سخت اداس ہو گئی اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر مکہ پہنچ جائے۔

چھوٹے حضورؐ کے ننھیال بنو عدی بن النجار کی ایک معزز شاخ میں سے تھے۔ اور یثرب کے بڑے باعزت لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ تجارت تو یونہی نام کو تھی۔ لیکن یثرب کا معزز پیشہ زراعت ان کا خاندانی

پیشہ تھا۔ کھجوروں کی لمبی لمبی قطاریں یثرب کے نواح میں باغات کی صورت میں موجود تھیں۔ یثرب کی کھجوریں یوں بھی عرب بھر میں مشہور تھیں اور یہ بات غلط نہیں ہے کہ یثرب میں ۱۲۵ قسم کی کھجوریں پیدا ہوتی تھیں۔ ان میں ایک کھجور ایسی بھی تھی جس میں گٹھلی نہیں ہوتی اور یہ صرف عرب میں ہی نہیں، دور دور شام اور روم تک میں مشہور تھی۔ لوگ محض یہ کھجوریں کھانے کے لئے یثرب میں آیا کرتے تھے۔ بنو عدی بن النجار کے باغات میں اس قسم کی کھجوریں کثرت سے پیدا ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ یثرب، حجاز، ہندوستان روم اور شام سے آنے والے راستوں کا مقام اتصال تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جو قافلوں کے لئے بہترین جائے مقام سمجھی جاتی تھی۔ دومتہ الجندل سے آنے اور جانے والے قافلے اسی راستہ سے ہو کر جانا پسند کرتے تھے کیونکہ دوسرا راستہ خشک اور بے آب و گیاہ میدان میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس سارے راستے میں نہ پانی ملتا تھا اور نہ ہی کھانے کے لئے کوئی دوسری چیز۔ اس لئے تمام قافلے یثرب کی شاداب اور زرخیز وادیوں میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہاں قافلے والوں کو پانی کے علاوہ اناج بھی باقی جگہوں سے سستا مل جایا کرتا تھا۔

اس جغرافیائی حیثیت نے یثرب کو عرب بھر میں ایسی معیشتی اور سیاسی اہمیت دے دی تھی۔ جو دوسرے کسی شہر کو نصیب نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے مکہ عرب بھر کا روحانی مرکز تھا اور روح کی پیاس بجھانے کے لئے عرب کا ہر قبیلہ مکے ہی کی طرف رخ کرتا۔ اس لئے مکہ عرب کا

معزز ترین شہر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے یثرب
کو بھی بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ عرب کے روحانی پیشوا
۔۔۔ مکّے والے ۔۔۔ اس کی اہمیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے
تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی تجارت اور دولت کی شہ رگ یثرب والوں
کے ہاتھ میں ہے۔ یثرب والوں کو خوش کئے بغیر وہ اپنی تجارتی زندگی کو
پوری طرح سے بحال نہیں رکھ سکیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ مکّے کے اکثر سرداروں نے یثرب میں رشتہ داریاں
کر لی تھیں۔ بنو ہاشم کا خاندان ان سب میں پیش پیش تھا۔ سب سے پہلے
ہاشم نے خود عدی بن النجار کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی جس
سے شیبہ پیدا ہوئے۔ یہی شیبہ بعد میں عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے
شیبہ کافی دیر تک یثرب میں رہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آپ کے بچپن
کا اکثر حصّہ یثرب میں گزرا۔ اور جب ان کے چچا مطلب انہیں یثرب سے
لے کر مکّہ آئے تو لوگوں نے انہیں مطلب کا غلام سمجھا اور عبدالمطلب کے
نام سے پکارا۔ مطلب نے مکّہ والوں کو سمجھا تو دیا کہ یہ اُن کے بھائی کا لڑکا
شیبہ ہے لیکن عبدالمطلب نام کچھ ایسی گھڑی میں تجویز ہوا تھا کہ یہی نام
لوگوں کی زبان پر جاری رہا۔

بڑھاپے کی منزلوں میں پہنچ کر عبدالمطلب اپنے چھوٹے لڑکے
عبداللہ کی شادی پھر اسی خاندان میں کرنے کے لئے آئے۔ قرعۂ فال آمنہ
بنت وہب کے نام پڑا لیکن عبداللہ کی شادی سے پہلے عبدالمطلب نے

خود اپنی شادی اسی دودمانِ عالی کی ایک عالی نسب صاحبزادی سے کر لی اس لڑکی کا نام ہالہ بنت وہیب ہے اور انہیں کے بطن سے حضرت حمزہؓ پیدا ہوئے تھے۔

غرض یہ کہ یثرب کی یہ معیشتی اور سیاسی برتری تھی جس کی وجہ سے بنو عدی بن النجار کا یہ خاندان مکہ کے قریشی خاندان سے پیوند ہو گیا اور اب برکہ اپنی مالکن اور چھوٹے حضورؐ کے ساتھ ایک ایسے خاندان کی مہمان تھی، جو رشتوں کے تار پود سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عدی بن النجار کا پورا خاندان جہاں محمدؐ اور امِ محمدؐ کی دلجوئی میں لگا ہوا تھا۔ وہاں برکہ پر بھی توجہ کی کمی نہ تھی۔ گو برکہ ایک معمولی کنیز تھی اور عام طور پر کنیزوں کے ساتھ برتاؤ کچھ ایسا نہیں ہوتا تھا جو قابلِ فخر ہو لیکن امِ محمدؐ نے اس چنچل لڑکی کو اس طرح اپنایا تھا کہ یہ سرے سے کنیز معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے برکہ پر بھی پوری توجہ ہوتی تھی اور اس کا دل بہلانے اور اُس کی اداسیوں کو دُور کرنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود برکہ اداس تھی۔ اُس نے دسویں ہی دن مالکن حضور پر زور دینا شروع کر دیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ ایک دن اُس نے اپنی اداسی کا ذکر کر ہی دیا،

"تمہارا یثرب میں جی نہیں لگتا برکہ ——؟" مالکن نے حیرت بھری نظروں سے برکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مالکن حضور —— کچھ —— عجیب طرح سے لگ رہا ہے جیسے ——

بس جیسے جی نہ لگتا ہو۔"

"لیکن برکہ یثرب تو یثرب ہے۔"

"ہاں مالکن حضور ـــــ حضور کا مائکہ ہے نا یہاں۔ بھائی، ماموں سبھی ہیں۔ اس لئے ـــــ"

"اور بھی ہے ـــــ برکہ ـــــ میرا اور بہت کچھ ہے یثرب میں ـــــ"

وہ کہہ کر خاموش ہوگئیں اور پھر آہستہ آہستہ ایک عجیب طرح کا پردہ اُن کی آنکھوں پر چھانے لگا۔ برکہ اپنی مادّی آنکھوں سے اس پردے کو رینگ رینگ کر بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مالکن حضور کی پیشانی جو عام طور پر چمکدار ہوا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے دھندلاتی سی چلی گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آمنہ بنت وہب اس پردے کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا،

"جانتی ہو برکہ ـــــ کل میں تمہارے آقا سے بڑی زبردست جنگ کرکے آئی تھی۔"

"آقا سے جنگ، مالکن حضور ـــــ؟" برکہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں برکہ ـــــ بڑے زوروں کی لڑائی ہوئی ہم دونوں میں ـــــ اور آخر جانتی ہو برکہ کیا ہوا ـــــ تمہارے آقا محمدؐ کے واسطے دینے لگے۔ اور پھر میں چپ ہوگئی۔"

برکہ کو یہ باتیں سُن کر تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ مالکن حضور کیسی باتیں کرنے

گی ہیں؟ اُن کی یہ کیفیت کیسی عجیب ـــــ خاصی خوفناک ـــــ ہے۔ اُس کا جی چاہتا تھا اپنی مالکن کے کندھے پکڑے اور انہیں جھنجھوڑ دے۔ مالکن خواب دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً وہ بیداری کے عالم میں نہ تھیں۔

لیکن یہ جانتے ہوئے بھی برکہ یہ گستاخی نہ کر سکی۔ اُسے وہ دن نہیں بھولا تھا۔ جب مالکن نے فرمایا تھا،

"برکہ مجھے خواب دیکھنے دیا کرو ـــــ اگر مجھ سے یہ خواب چھین لئے گئے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

اور برکہ آج بھی مطیع بن گئی۔ اُس نے مالکن حضور کے ارشاد کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اپنی حیرتوں پر تصنع کے دبیز پردے ڈال لئے اور کہا،

"پھر مالکن حضور ـــــ پھر کیا ہوا ـــــ؟"

"کچھ نہیں پھر میں چلی آئی۔"

"مگر آقا فرماتے کیا تھے۔"

"وہی پرانی رٹ لگے چلی جاؤ آمنہ ـــــ وہاں ابا حضور ہیں ـــــ حارث ہیں ـــــ سبھی ہیں۔ وہ سب تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ میں نے ابا حضور کی ساری باتیں اُن سے کہہ دی ہیں برکہ ـــــ میں نے بتایا تھا کہ ابا حضور میری کتنی خبر رکھتے ہیں۔ میں کھانا نہیں کھاتی تو خود بھی نہیں کھاتے۔ مجھے ذرا تکلیف ہو جائے تو انہیں سخت پریشانی ہوتی ہے۔ وہ یہ سُن کر بڑے خوش ہوئے برکہ ـــــ اور مجھ سے کہنے لگے۔ پھر تم یہاں رہنے سے کیوں گھبراتی ہو ـــــ کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

"پھر آپ نے کیا فرمایا مالکن حضور؟"

"کیا کہتی ــــ میں نے کہا ــــ سبھی ہیں لیکن عبداللہ ــــ تم نہیں ہو۔"

یہ لفظ چیخ بن کر مالکن کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ برکہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اُس نے گھبرا کر کہا،

"مالکن حضور ــــ!"

مالکن نے برکہ کی طرف دیکھا۔ برکہ دیکھ رہی تھی مالکن کی آنکھوں پر سے ایک جھلی سی ہٹتی چلی گئی ــــ نور سے معمور پیارے بھولے بھالے چہرے کی کھچی ہوئی بھنوؤں میں ایک عجیب اداسی سی چھا گئی۔ بے خودی کا وہ عجیب تشویش پیدا کرنے والا انداز جو یہ باتیں کرتے وقت پیشانی پر ہویدا تھا۔ آہستہ آہستہ ــــ بالکل واضح اور مرئی انداز میں ــــ بدل گیا۔ مالکن حضور نے برکہ کو اس نظر سے دیکھا گویا کسی اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔

"کیا ہوا برکہ ــــ؟" اُنہوں نے حیرت سے پوچھا "چیخ کیوں رہی ہو۔"

"جی ــــ؟" اس سوال نے برکہ کے اعصاب پر نہ جانے کیا اثر ڈالا تھا کہ اُسے یکایک یوں محسوس ہوا کہ وہ چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔ اُس نے گھبرا کر کہا،

"جی کچھ نہیں مالکن حضور ــــ میں حاضر ہوئی تھی اگر کوئی ضرورت ہو۔"

"میں تم سے باتیں کر رہی تھی نا برکہ۔"

"جی مالکن ——!"

"کیا کہہ رہی تھی میں!"

"سردار آقا کے متعلق۔" برکہ یہ بات کہنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر مالکن کو سب کچھ یاد ہوا تب —؟ اور برکہ کے پاس اس بات کی کیا دلیل تھی کہ مالکن کو یہ سب کچھ یاد نہیں ہوگا۔

"ہوں ——" آمنہ نے ایک عجیب زہرخند کے ساتھ کہا جیسے وہ اپنے آپ ہنس رہی ہوں، "سردار آقا کے متعلق۔"

"جی مالکن حضور ——!"

"اور تم جی میں ہنستی رہیں۔ کیا سوچ رہی تھی برکہ۔"

"جی کچھ نہیں مالکن حضور —— میں تو بس سنتی رہی۔"

"جھوٹی ——"

"کنیز کی یہ جرأت نہیں۔"

"بہرحال —— برکہ —— میں تم سے جانتی ہو یہ سب کچھ کیوں کہہ دیتی ہوں۔"

"مالکن کی کنیز پروری ہے۔"

"نہیں برکہ —— میں یہ سب کچھ اس لئے کہہ دیتی ہوں کہ تم جب مکے میں جاؤ تو آقا حضور سے کہہ سکو۔"

"تو کب چلئے گا مالکن حضور مکے ——!"

"ابھی نہیں ——— ابھی مجھے ——— ابھی مجھے نہیں جانا ہے برکہ۔"

"مگر مالکن ——— "

"محمدؐ کہاں ہیں ——— ؟"

"تالاب پر کھیل رہے ہیں۔ کبوتروں میں بڑے خوش رہتے ہیں، چھوٹے حضور۔"

"لیکن تالاب بہت گہرا ہے برکہ ——— تمہیں ان کا خیال رکھنا چاہئے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔"

"وہ بچی بھی ہے حضور آقا کے ساتھ ——— اور غلام بھی۔"

"تم بھی جاؤ برکہ ——— " مالکن نے جیسے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا "ضرورت ہوئی تو بلا لوں گی۔"

۲

اپنی اداسی اور مالکن حضور کی خوابوں میں یوں یکایک کھو جانے کی پریشان کن عادت کے باوجود برکہ کو ایک اطمینان ضرور تھا اور وہ یہ کہ جب سے یہ لوگ یثرب میں آئے تھے۔ برکہ کی مالکن بہت خوش تھیں۔ یثرب کی صحت مند آب و ہوا نے مالکن حضور کی صحت پر بڑا ہی خوشگوار اثر کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہاں نہ وہ سورج کی شعاعوں میں جلتا جھلستا گھر تھا اور نہ اس کی وہ منحوس منڈیر جس پر کھڑی ہو کر برکہ کی مالکن پہروں شام اور یمن سے آنے والی سڑکوں کے چوک کو تکتی رہیں۔ جہاں پہنچ کر انہیں نہ دھوپ کی شدت ہی کا احساس رہے اور نہ کثرت سے گرنے والی شبنم کا۔ یہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی اس لئے یہاں آکر برکہ کی مالکن حضور کے معمولات میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں وہ باقاعدگی سے صبح اٹھتیں، ہاتھ منہ دھوتیں، بالوں کو گوندھتیں، اپنے لباس کو عطر میں

بسائیں اور تھوڑا بہت ناشتہ کرکے سیدھی بنو نجار کے قبرستان میں چلی جائیں۔
یثرب میں قدم دھرتے ہی انہوں نے اپنے منجھلے ماموں سے عبداللہ کی آخری آرام گاہ کا پتہ پوچھا تھا۔ اور جب تعزیت کے ہنگامے ختم ہوئے تو اسی ماموں کو ہمراہ لے کر قبرستان گئی تھیں۔
اور کیسا عجیب خیال تھا یہ جو اُس وقت آمنہ بنت وہب کے ذہن میں سکہ جمائے ہوئے تھا۔ اتنی شدت کے ساتھ کہ دوسرے خیال کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔
وہ جب اپنے منجھلے ماموں کے ساتھ اپنے خاندان کے محلّے سے نکلی ہیں تو انہیں یقین تھا کہ جب وہ قبرستان میں پہنچیں گی تو عبداللہ کو اپنے انتظار میں پائیں گی۔ ان کے اپنے عبداللہ ان کا راستہ دیکھ رہے ہوں گے اور جب آمنہ اُن کے سامنے آئیں گی تو تازہ چھوٹی چھوٹی ریشمی داڑھی کی اوٹ میں چھپے ہوئے عبداللہ کے سرخ ہونٹ ایک معنی خیز مسکراہٹ میں یونہی سا ہلیں گے۔ وہ ان کا استقبال کریں گے، شکایت کریں گے کہ آمنہ اتنی دیر کے بعد آئی ہیں۔ اتنا طویل انتظار کرایا ہے آمنہ نے۔
وہ انہی خیالات میں گم اپنے محبوب شوہر سے ملاقات کے پُرمسرت جوش میں بھری ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتیں قبرستان کی طرف لپکی چلی گئی تھیں۔ اتنی تیزی اور ایسی سبک خرامی سے کہ اُن کے منجھلے ماموں کو حیرت ہوئی تھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک مجبور بے کس بیوہ کا سر یوں تنا ہوا کیسے ہو سکتا ہے ـــــ اُس کی آنکھوں میں یہ عجیب بے موقعہ سی چمک کیسے پیدا

ہو سکتی ہے۔ ان کی بے پناہ خاموشیوں میں یہ عجیب قسم کا سرور کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن منجھلے ماموں نے اپنی بیوہ بھانجی کے اس غیر معمولی انداز کو نظر انداز کرنے کی کامیاب کوشش کی اور کوئی سوال کئے بغیر ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

یہاں تک کہ دونوں قبرستان میں پہنچ گئے۔

آمنہ یکایک ٹھٹھک کر رک گئیں۔ انہوں نے ماموں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ ماموں انہیں کہاں لے آئے ہیں۔ یہ جگہ عبداللہ سے ملاقات کی جگہ تو نہیں ہو سکتی۔ ان ویرانوں میں عبداللہ سے ملاقات کیسے ممکن ہے۔

اور ماموں آمنہ کے چہرے پر بکھرے ہوئے اس حیرت ناک سوال کو پڑھے بغیر بولے،

"ابھی قبر دور ہے —— چلی آؤ ——"

اور مزید کچھ کہے بغیر آگے بڑھے۔

آمنہ کے خواب یکایک ٹوٹ گئے تھے۔ ان کی چال دھیمی پڑ گئی گردن جھک گئی۔ اور پھر —— تھوڑی دور اور چلنے کے بعد ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ ماموں آگے آگے جا رہے تھے۔ انہیں آمنہ کے اندر تیزی سے پیدا ہوتی ہوئی ان کیمیائی تبدیلیوں کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ آمنہ کی آواز انہیں سنائی دی،

"ماموں ——!"

وہ رُک گئے، مڑے اور تیزی سے امِ محمدؐ کے قریب آ گئے۔

"آمنہ ـــــ!" انہوں نے کہا۔

"مجھے سہارا دو ماموں ـــــ میں ـــــ میں چل نہ سکوں گی۔"

اور ماموں نے دونوں ہاتھوں سے آمنہ کو تھام لیا تھا ـــ آرام سے، پوری نرمی سے، انتہائے شفقت کے ساتھ اور آمنہ ان کے ساتھ ساتھ لڑکھڑا کر چلنے لگیں۔

امِ محمدؐ کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اپنے ماموں کی حیرتوں کا اندازہ کر سکتیں۔ یہ تو ری تبدیلیاں ایک انتہا سے دوسری انتہا پر فوری طور سے کود جانے لگیں۔ یہ چکرا دینے والی کیفیت ماموں کے بس سے باہر تھی وہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔

"کیا ہوا بچی ـــــ کیا ہوا۔" انہوں نے اپنی حیرت اور سادگی کا اظہار کیا تھا۔

"کچھ نہیں ماموں ـــــ تھامے رہیئے مجھے۔"

اور ماموں نے شفقت کے بے پایاں جذبے سے مرعوب ہو کر اپنی غمزدہ بھانجی کو سینے کے ساتھ لگا لیا۔ امِ محمدؐ ڈولتے ہوئے قدموں سے دھیرے دھیرے ہولے ہولے آگے بڑھیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد آمنہ نے یکایک پوچھا،

"کیا محمدؐ کے ابا سچ مچ وفات پا چکے ہیں ماموں؟"

اور ماموں نے اپنی بھانجی کی طرف دیکھا۔ وہ اسے حیرت سے بھی

مذاق سمجھیں یا کیا سمجھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ان الفاظ سے کیا مطلب اخذ کریں کہ دوسرا سوال کٹتے ہوئے درخت کی طرح چیختا ہوا اُن کے ذہن کی ابھرتی و بجتی بلندیوں اور پستیوں پر گرا۔

"آپ نے اپنی آنکھوں سے انہیں مرتے ہوئے دیکھا تھا۔؟"

ماموں کا سر جھک گیا۔ انہوں نے آمنہ سے آنکھیں ملانے کی ناکام کوشش کی اور پھر نگاہیں دوسری طرف پھیرلیں۔ اُن کی آواز اُن کی مرضی کے بالکل خلاف اُن کے حلق میں خرخرائی۔ اور آمنہ بنت وہب نے سُنا،

"ہاں ——"

"بہت زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی ہوگی انہیں۔"

اور پھر ماموں نے دُور اُفق میں آنکھیں گاڑ کر سوچتے ہوئے سے لہجے میں کہا تھا،

"بس یوں معلوم ہوتا تھا ایک پھول چارپائی پر پڑے پڑے مرجھا گیا ہے۔"

"نہیں ماموں ——!" آمنہ نے جواب دیا، "ان کا چہرہ مرجھایا تو نہ ہوگا۔ عبداللہ کا چہرہ مرجھا نہیں سکتا۔"

"ہاں ٹھیک ہے —— ایسا مرجھایا نہیں تھا —— بس یونہی —— ہلکا سا زرد پڑ گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا ایک لمبے سفر کے بعد تھک کر سو گئے ہیں۔"

"مگر انہوں نے کوئی ایسا لمبا سفر بھی تو نہیں کیا تھا ماموں۔" پچیس

سال تو یوں آنکھ جھپکتے میں گزر جاتے ہیں۔"

"وہی تو میرا مطلب ہے۔ بس صرف تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے"

"انہوں نے ——— بیماری کے دوران میں ماموں ——— کبھی کبھی مجھے بھی یاد کیا تھا۔"

"نہیں ———؟"

"ہاں ماموں مجھے ——— کبھی انہیں میں یاد آئی تھی۔"

"وہ تو مکہ جانے کے لئے بے تاب تھے بیٹی ——— کہتے تھے کسی اونٹ پر میری چارپائی کس دو ——— میں آمنہ سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میں جلدی لوٹ آؤں گا۔"

"پھر تم نے کیوں نہ انہیں بھیج دیا۔"

"کیسے بھیج دیتے بیٹا ——— بیماری میں سفر کون برداشت کر سکتا ہے۔"

"اور یہاں کا آرام بھی کس سے برداشت ہوا ہے ماموں۔ بڑے ظالم ہیں آپ سب لوگ۔"

اور آمنہ چپ ہو گئیں۔

"ہم نے اطلاع بھیج دی تھی ——— ہمارا خیال تھا تم آؤ گی ——— عبداللہ کو تو یہی رٹ تھی نا۔ وہ کہتا تھا یا مجھے بھیج دو اور یا آمنہ کو یہاں بلا لو ——— ہم نے اسی غرض سے ایک آدمی مکہ بھیج دیا تھا لیکن تمہاری بجائے حارث آ گئے۔ اور اگر تم بھی آ جاتیں تو کیا ہو جاتا۔ بیٹا ——— تقدیر

کا لکھا تو حارث کے آنے سے پہلے ہی پورا ہو چکا تھا۔"

اور آمنہ چپ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ عبداللہ کی قبر کے قریب جا کر ماموں نے کہا،

"یہ رہی عبداللہ کی قبر۔"

آمنہ اسی طرح ماموں کا سہارا لیے کھڑی گم صم قبر کی طرف دیکھتی رہیں ریت ملی مٹی کی ایک لمبی لمبی ڈھیری جس کے سرہانے کو پائنتی سے علیحدہ کرنے کے لئے پتھر کا ایک بڑا ٹکڑا رکھ دیا گیا تھا۔

آمنہ قبر کی طرف دیکھتی رہیں اور اُن کے منجھلے ماموں اُن کے قریب کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ آخر ماموں بولے،

"آمنہ ــــ!"

لیکن بھانجی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ انہوں نے قدرے پریشانی کے ساتھ پکارا،

"بنت وہب۔"

آمنہ نے اُن کی طرف دیکھا ــــ آنکھوں کی کالی کالی چمکتی پتلیوں میں ایک عجیب قسم کے عمق کا احساس ہوا تھا ماموں کو ــــ اور یہ عجیب احساس تیزی سے ماموں کے ذہن میں چمک کر ذہن ہی کے کسی عظیم لبسیط خلا میں گم ہو گیا۔ اتنی تیز چمک تھی اس احساس کی کہ ماموں کا شعور اس کوندے کی لپک کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں نہیں لے سکا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی بھانجی کی تیز کالی آنکھوں کے عمق میں ایک نئی دنیا آباد

ہو گئی ہے جو اس دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ابھی ابھی طاری ہونے والی افسردگی غائب ہو چکی تھی اور بنت وہب کی تیز آنکھوں کے عمق میں تیرتی ہوئی ایک نئی دنیا مسرّت اور انبساط کی دنیا معلوم ہوتی تھی۔ ماموں صرف اتنا سمجھ سکے کہ آمنہ یکایک خوش ہو گئی ہیں۔ اور اس وقت خوش ہیں۔ کیوں اور کیسے ــــ کے سوال ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوئے۔ وہ آمنہ کی اس خوشی پر خوش ہو گئے۔ سادہ دل عرب زندگی کی ان گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا۔ جہاں برکہ کا کم عمر ذہن مالکن کے ساتھ شدید محبت سے پیدا ہونے والے کسی چھٹے شعور کی مدد سے پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ خاموش ہو گئے اور بنت وہب آہستہ آہستہ بڑھ کر قبر کے سرہانے پر رکھے ہوئے بڑے پتھر پر بیٹھ گئیں۔

سردار وہب اور سردار وہیب کے خاندان میں اس بات کا بڑا چرچا رہا تھا کہ آمنہ اپنے خاوند کی قبر پر جا کر ایک آنسو نہیں روئیں۔ عام رواج کے خلاف انہوں نے اپنے بال بھی نہیں نوچے، چہرہ نہیں پیٹا، اپنے چہرے پر زخم نہیں بنائے اور رو رو کر قبر کو نہیں جھنجھوڑا۔ عبداللہ کی قبر کی مٹی جوں کی توں رہی۔ اُسے نہیں اڑایا گیا۔ یہاں تک کہ آمنہ کو کھجوروں کا وہ حلوہ کھانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی جو اُن کی بھاوج نے تیار کر رکھا تھا بھاوج کا خیال تھا کہ آمنہ عام عورتوں سے زیادہ شدت کے ساتھ قبر پر ماتم کریں گی اور جب قبرستان سے لوٹیں گی۔ تو نقاہت کی وجہ سے لے

حال ہو رہی ہوں گی۔ اس وقت انہیں کھجوروں کے گرم اور قوت بخش حلوے کی ضرورت ہوگی۔ یثرب کی عورتیں ماتم کے بعد یہ حلوہ کافی مقدار میں کھایا کرتی تھیں اور اس کے بعد اپنے اندر ایسی قوت محسوس کیا کرتی تھیں جو اُن کے والدین کو اُن کے دوسرے نکاح کی فکر میں مبتلا کر دیتی تھی۔ آمنہ کی بھاوج نے بھی یہی سوچا تھا۔

لیکن جب آمنہ واپس آئیں تو اُن میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جو معمول کے مطابق ہو۔ وہ خلاف معمول خوش تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ عبداللہ کی قبر پر سے نہیں، عبداللہ سے مل کر اور اُن سے باتیں کر کے آ رہی ہیں۔

اور اُس دن سے آج تک یہ خوشی قائم تھی۔ وہ ہر روز قبر پر جاتیں اور اطمینان کی ایک عجیب دنیا آنکھوں میں لئے واپس آ جاتیں۔ یہ اُن کا معمول بن گیا تھا۔ مالکن حضور کے اس اطمینان نے برکہ کو بھی مطمئن کر دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو یثرب کے ساتھ ہم آہنگ کرنے لگی تھی۔

اور اس طرح تین مہینے بیت گئے۔

ایک دن آمنہ بنت وہب قبرستان سے واپس آ رہی تھیں کہ انہیں اپنے باپ کے گھر میں ایک ہنگامے کا سا احساس ہوا۔ مردانے میں بہت سے لوگ جمع تھے اور باتوں کا شور صحن کی نیچی دیواروں پر سے چھلک رہا تھا۔

آمنہ سوچتی ہوئی سی چھوٹی دروازے کے راستے اندر چلی گئیں۔

برکہ مالکن کو دیکھتے ہی لپکی۔ اُس کے چہرے پر بے پناہ ایسے انداز

خوشیاں ناچ رہی تھیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر مالکن کو کندھے سے پکڑ لیا
اور اچھلتے ہوئے کہا،

"مالکن حضور ــــ مکّے سے لوگ آئے ہیں۔"

اُسے یقین تھا کہ مالکن بھی اس خبر کو اتنی ہی بڑی خوشخبری سمجھیں گی جتنی
بڑی خود برکہ سمجھ رہی ہے لیکن مالکن نے عجیب افسردہ حیرت سے پوچھا،
"مکّے سے۔"

"ہاں مالکن ــــ سردار آقا نے پیغامی بھیجے ہیں۔"

مالکن کے ہونٹ واضح طور پر سفید پڑ گئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا،
"ابا حضور کی طرف سے آئے ہیں۔"

"ہاں ــــ" برکہ کی خوشی پر اوس پڑ گئی تھی۔ اُسے غیر متوقع طور پر
ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مالکن اس خبر کو سُن کر یقیناً خوش نہیں ہوئی تھیں۔
"کیا کہتے ہیں یہ لوگ؟"

"یہ تو معلوم نہیں ہو سکا ابھی تک ــــ شاید آپ کو اور چھوٹے حضور
کو لے جانے کے لئے آئے ہوں۔"

"نہیں ــــ" مالکن حضور نے چونک کے کہا تھا، "میں ابھی نہیں جاؤنگی"
فیصلہ کُن انداز ــــ جس کے بعد کسی سوال کسی دلیل کی ضرورت نہیں
رہتی اور آمنہ بنت وہب دوسری طرف چلی گئیں۔

مردانے میں شام تک ایک ہنگامے کی سی کیفیت رہی۔ مختلف
قبیلوں اور خاندانوں کے سردار دُور دُور کے محلّوں سے آتے رہے اور بلند

تیز باتیں ہوتی رہیں۔ بکریوں کے تکے کھائے گئے۔ مطبخ شام تک مصروف رہا ــــــــ

اور جب رات کی تاریکیوں نے یثرب کو خاموش کر دیا تو آنے والے چلے گئے۔ صرف مکّہ سے آئے ہوئے چھ آدمی باقی تھے جن کا انتظام مہمان خانے میں کر دیا گیا تھا۔

رات کو جب مرد مہمانوں سے فارغ ہو کر اندر آئے تو آمنہ کو معلوم ہوا کہ مکّہ والے انہیں لے جانے کے لئے نہیں بلکہ ہوازن اور قریشیوں کے جھگڑے کے متعلق کچھ گفتگو کرنے کے لئے آئے ہیں۔

آمنہؓ کو اس جھگڑے میں ذرّہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ یہاں تک کہ مکّے میں بپا ہونے والا یہ ہنگامہ ان کے ذہن سے یکسر فراموش ہو چکا تھا۔ اور وہ دوبارہ اس کو کریدنے اور اس کی تفصیلات سننے کے لئے تیار نہ تھیں لیکن اس خبر نے گھر بھر میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔

اور وجہ ظاہر تھی۔ ام محمدؐ کا خاندان ــــــــ بنو نجیم ــــــــ بنو سلیم کی شاخ تھا اور بنو سلیم قریش کی شاخ۔ بنو سلیم اس وقت مکّہ سے نکلے تھے، جب بنو خزاعہ نے عدنانی قبائل کو مغلوب کر لیا تھا اور انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ مکّہ کے نواح کو چھوڑ کر عرب کے مختلف مقامات میں منتشر ہو جائیں چنانچہ بنی بکر بحرین میں جا کر آباد ہو گئے۔ بنی حنیفہ نے یمامہ میں سکونت اختیار کی بنی تغلب ساحل فرات پر قابض ہو گئے۔ بنی تمیم الجزیرہ میں اور بنو سلیم نے یثرب کے نواح میں پناہ لی۔

لیکن اس جغرافیائی دوری نے خاندانی تعلقات کو منقطع نہیں کیا تھا۔ سب ایک دوسرے کے حلیف تھے اور اس طرح مکہ سے ایک طرف ساحل فراط اور دوسری طرف یثرب تک ایک خاندان کی زنجیر بن گئی تھی جو قافلوں کی آمدورفت کے لئے بڑی مفید ثابت ہوتی۔ اسی زنجیر کی وجہ سے قریش کے تجارتی قافلے ہر موسم اور ہر حال میں بے روک ٹوک دُور دُور کا سفر کرتے تھے اور انہیں بدوی قبائل سے بہت کم خطرہ ہوتا تھا۔ ادھر کسی بدوی قبیلہ نے حملہ کیا کہ بنی کنانہ کا نعرہ لگایا گیا اور تمام قبیلے یکجا ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ بدوی قبائل بھی اس مضبوط زنجیر سے بے خبر نہ تھے۔ اس لئے اکا دکا ڈاکے سے بڑھ کر کسی متحد اور منظم حملے کی جرأت کبھی نہ کر سکے۔ اور قریش کے تجارتی راستے ہمیشہ محفوظ اور مامون رہے۔

ان قدیمی تعلقات کے ساتھ ساتھ جدید رشتہ داریاں بھی ہوتی رہتی تھیں اور اس طرح یہ زنجیر مضبوط سے مضبوط تر بنتی رہتی۔

یہی زنجیر جنگ کے دنوں میں ہلائی جاتی اور معمولی خاندانی مناقشت بڑھتے بڑھتے حجاز گیر جنگ کی صورت اختیار کر لیتی۔ میدانِ عکاظ میں ایک قریشی نوجوان کی جوان مستیوں نے آج پھر اس طویل زنجیر کو جھنجھوڑ دیا تھا اور یثرب میں بنی تیم کا پورا گھرانہ اس کی جھنکاروں سے گونج اٹھا تھا۔

امِ محمدؐ کے منجھلے ماموں بڑے غصے میں تھے۔ مردانے سے آتے ہی چیخ کر بولے،

"ہمیں جنگ کی تیاریاں کرنا ہوں گی۔"

عورتیں جو صبح سے کوئی خبر سننے کے لئے بے چین تھیں اور لونڈی غلاموں کے ذریعہ باہر سے آنے والی ہر معمولی سے معمولی بات کو غور سے سن رہی تھیں اس دھماکے سے لرز گئیں۔

"جنگ ۔۔۔!"

"ہاں ۔۔۔ جنگ ۔۔۔ بنی کنانہ کی ساری شاخیں قیس عیلان کی تمام شاخوں سے اپنے بدلے لینے کے لئے آمادہ ہیں۔"

"لیکن جھڑپ تو ہوازن والوں سے شروع ہوئی تھی ماموں۔" ام محمد نے اپنے بچے کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے کہا، "آقا حضور کچھ بتا رہے تھے ۔۔۔ نہ جانے عبدالعوث کے پوتے ۔۔۔ یا کسی اور نے عکاظ کے میدان میں ہوازن والوں کی بے عزتی کردی تھی۔"

"بے عزتی وے عزتی کا سوال نہیں ہے ۔۔۔ سنا ہے ہوازن والے قیس عیلان کی تمام شاخوں کو جمع کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے معاملہ طول پکڑ جائے۔"

"لیکن سردار آقا تو فرماتے تھے۔ ابھی قریش والوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" برکہ جو قریب بیٹھی تھی بول پڑی،

"ہو گیا فیصلہ ۔۔۔ ان ہوازن والوں سے نبٹ لیا جائے گا۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟" ایک اور عورت نے پوچھا۔

"جنگ ۔۔۔!"

"آقا حضور فیصلہ کرا دیں گے۔ مجھے یقین ہے۔" بنت وہب نے کہا۔

"مگر معاملہ بڑا اُلجھ چکا ہے۔ جنگ لازمی ہے۔"

"اس سے نقصان تو دونوں طرف کا ہوگا۔"

"نقصان سے کون ڈرتا ہے۔"

"تو کیا ہم بھی حصّہ لیں گے اس جنگ میں۔"

"یقیناً ——!"

اور اسی قسم کی باتیں دیر تک آمنہ بنتِ وہب کے کانوں کے ارد گرد مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہیں یہاں تک کہ خاموشی چھا گئی۔

اور آمنہ ان ہنگاموں سے بہت دور کسی پُر فضا جگہ میں تیرتی ہوئی سی چلی گئیں۔ اُنہوں نے اس جگہ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا —— مکّے میں تو اس قسم کی جگہ کا وجود ہی نہیں ہو سکتا اور یثرب میں بھی —— آمنہ کو یاد نہیں تھا کہ انہوں نے کبھی ایسی پُر فضا جگہ دیکھی ہو۔

سبز پوش اونچی اونچی پہاڑیاں جن پر عجیب و غریب قسم کے درخت لگے تھے۔ ان درختوں کی شاخیں ٹنڈ منڈ کھڑی تھیں۔ جیسے زمین نے آسمان کی طرف اپنی باہیں پھیلا دی ہوں۔ ان شاخوں پر کوئی پتا نہ تھا، کوئی پھول نہ تھا۔ اور اس کے باوجود زمین کی یہ پھیلی ہوئی باہیں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں آمنہ ان عجیب و غریب درختوں کے جنگل میں گھومتی رہیں، کافی دیر تک پھرتی رہیں اور انہیں یکایک یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان سنسان درختوں پہ پھول نکل آئے ہیں اور آمنہ کو ان پھولوں کا پتہ اس وقت چلا ہے جب ان پھولوں کے لمبے لمبے خوشبودار ہار ان کی گردن میں حمائل ہو گئے ہیں۔ وہ ہار

پہنے اس جنگل میں گھومتی رہیں۔ انہوں نے یہ ہار کس وقت بنایا، کس وقت پہنا
اس بات کا انہیں پتہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کے ذہن نے یہ سوچنے کی کوشش
کی تھی کہ یہ ہار کیسے بنا، کہاں سے آیا اور ان کی گردن میں کیوں کر ڈال دیا گیا
پھر یکایک آمنہ خوفزدہ سی ہو گئیں۔ مغرب سے ایک گھٹا اٹھی تھی۔ اس کی
آغوش میں خوفناک بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ آمنہ سہمی سہمی نظروں سے ان بجلیوں
کو دیکھتی رہیں اور یکایک ان کے گلے سے خوشبودار ہار غائب ہو گئے۔ آمنہ
نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، درختوں پر پھول نہیں تھے۔

اور آمنہ چونک کر بیدار ہو گئیں۔ ان کی سانس تیزی سے چل رہی تھی
جیسے وہ بڑی بلندی پر تیزی سے چڑھنے کی وجہ سے ہانپ رہی ہوں۔

محمدؐ ان کے پہلو میں سو رہے تھے۔ آمنہ نے بدقت اپنی پریشانیوں
پر قابو پایا اور اپنے معصوم کی طرف دیکھا۔ کتنا بھولا —— کتنا پیارا —— کتنا
عجیب بچہ یتیم ہو گیا۔

ان کا جی چاہتا تھا کہ جھک کر اپنے لال کی اس خوبصورت پیشانی
کو چوم لیں۔ جس کے بکھرے بال ناک کے اوپر ناک کی سیدھ میں بنی ہوئی
دیئے کی لو جیسی سرخ لکیر کو کوشش کے باوجود چھپانے میں ناکام رہے تھے
لیکن ماں نے اپنی اس خواہش پر اپنے بیٹے کے آرام کو قربان نہیں کرنا چاہا
اور صرف آنکھوں ہی آنکھوں سے اُس پیارے مکھڑے کا بوسہ لے لیا۔

نہ جانے آمنہ کی نگاہوں میں کیا تھا۔ محمدؐ آہستہ آہستہ ہلے۔ چھوٹے
چھوٹے چوڑے ہاتھ بلند ہوئے اور ماں کے گرد حمائل ہو گئے۔ محمدؐ خواب

میں مسکرا دیئے تھے۔

اور آمنہ کی تیزی سے چلتی ہوئی سانسیں آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آگئیں۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ محمدؐ کے ہاتھوں نے ان کے سارے وسوسوں کو ختم کر دیا ہے۔ جیسے ان ہاتھوں کے ہلکے نرم دباؤ نے بلند آواز سے کہہ دیا ہو۔۔۔

"گھبرایئے نہیں امی۔۔۔۔ گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کے پاس ہوں اور محمدؐ جس کے پاس ہوں اُسے اور کیا چاہیئے۔"

امّ محمدؐ نے اپنے ننھے کے ہاتھوں میں سے اٹھنے والی اس بلند ترین آواز کو کھلے کانوں سے سنا تھا۔ انہوں نے پوری احتیاط اور آہستگی سے کروٹ بدلی۔ اب اُن کا چہرہ محمدؐ کے چہرے کے بالکل سامنے تھا انہوں نے غور سے اپنے بچے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی ہلکی ہلکی تاریکیوں میں ارد گرد سونے والوں کے خراٹے تیر رہے تھے۔ ان ہلکی ہلکی تاریکیوں میں آمنہؓ کو اپنا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہیں پہلی مرتبہ شعور کی پوری قوت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ ان ہلکی نرم نرم تاریکیوں میں محمدؐ کے چہرے کا ہر خط نمایاں طور پر دکھائی دے رہا ہے۔

شاید یہ ان کے تصوّر کی جادو گری تھی۔ محمدؐ اس وقت ان کے تصوّر پر اس واضح طور سے نقش ہو گئے تھے کہ ان کے چہرے کا ہر خط انہیں صاف نظر آ رہا تھا اور اگر یہ نہیں تو پھر کوئی ایسی روشنی تھی جس کا مخرج غیر مرئی تھا۔ کوئی ایسا نور جس کے منبع کو مادی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں لیکن جو یقیناً کمرے

میں موجود محمدؐ کے چہرے کے ہر خط کو اجاگر کئے ہوئے تھا۔

آمنہؓ نے اس پر نور چہرے کی جزئیات کو اپنی مادی آنکھوں سے حیران ہوئے بغیر دیکھا۔ وہ ضرور حیران ہوتیں لیکن کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ آمنہؓ کے ذہن نے اس سارے واقعہ کو اس کی ساری حیرت زائیوں کے باوجود پوری طرح سے قبول کر لیا تھا اور ان کا ذہن کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ ایسا ہونا ہی چاہئے بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آمنہ کو حیرت ہوتی۔

انہوں نے پُراسرار نور کی اس غیر مرئی بارش کو دیکھا۔ پوری آہستگی سے ان کا سر یونہی ہلکی سی جنبش کے ساتھ آگے بڑھا اور اُن کے ہونٹ ذرا آگے بڑھ کر نور کے غلاف میں لپٹے ہوئے ماتھے سے چھو گئے۔

آمنہؓ کی رگوں میں اطمینان تیرنے لگا اور اُن کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں ——— !

۳

مکّہ سے آئے ہوئے مہمانوں کو یثرب میں آج آٹھواں دن تھا اور ان آٹھ دنوں میں یثرب کی پوری فضا بدل گئی تھی۔ بنو سلیم کی تمام شاخوں کے سردار پہلے اکا دکا ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ پھر ایک عام جلسہ کرنے کی رائے ہوئی۔ جس میں اس عظیم قبیلہ کے تمام سرداروں کو مدعو کیا گیا تاکہ قریش اور ہوازن کے جھگڑے کے متعلق کوئی فیصلہ ہو سکے۔

یہ جلسہ بڑا ہنگامہ خیز تھا۔

ساری شاخوں کے سردار ایک بات پر متفق تھے کہ اگر قریش کو ضرورت پڑی اور ہوازن والوں نے ان پر حملہ کر دیا تو وہ سب قریش کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے قومی فرائض کا احساس تھا اور سب جانتے تھے کہ اگر مکّہ کے قریش ہوازن والوں کے سامنے محض اس لئے شکست کھا گئے کہ ہوازن والے قیس غیلان کی تمام شاخوں کو متحد کرنے میں

کامیاب ہو گئے ہیں تو قریش خاندان کا دبدبہ ختم ہو جائے گا اور بنی کنانہ کی وہ مضبوط زنجیر جو ہر قبیلے کی معیشتی، سیاسی اور مجلسی زندگی کی ضامن ہے، کمزور ہو کر ٹوٹ جائے گی۔ شاید وہ دن بھی آ جائے کہ قریش کو ایک دفعہ پھر ذلیل ہو کر مکے سے نکلنا پڑے اور پھر کسی قصی بن کلاب کی پیدائش کا انتظار کرنا پڑے کہ وہ آ کر اس زنجیر کی مختلف کڑیوں کو پھر سے ملا دے اور انہیں زندگی کی نوید دے۔

اس لئے سب چاہتے تھے کہ قریش کی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو ــــ

لیکن سوال دولت کا تھا۔ بنو سلیم قتل ہونے کے لئے سر تو دے سکتے تھے۔ ان کے پاس یقیناً خون کی اتنی دھاریں موجود تھیں جو بہہ کر مکہ کے زمین و آسمان کو سرخ بنا سکتی تھیں لیکن وہ تلواریں نہ تھیں جو دوسروں کی گردنیں کاٹ سکیں، وہ ڈھالیں نہ تھیں جو وار روک سکیں، وہ نیزے نہ تھے جن کی انیاں جگر کے پار ہو سکیں۔ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے دولت کی ضرورت تھی۔

اور بہ نظر ظاہر بنی سلیم کے پاس دولت کی کمی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ان کے دُور دُور تک جھومتے، لہلہاتے کھیت، ان کی کھجوروں کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے باغات اور ان کے کنوؤں کا سیال چاندی کی طرح بہتا ہوا پانی تھوڑا نہیں تھا۔ یہ سب دولت ہی تھی اگر اس دولت کو سمیٹ لیا جاتا، ایک جگہ جمع کر لیا جاتا تو بنی سلیم ڈھالوں، نیزوں اور

تلواروں کے انبار خرید سکتے تھے اور بنی سلیم کی عورتوں کو ہی معلوم تھا کہ یہ دولت گھروں سے باہر نہیں گئی۔ سب کچھ ہے۔ آخر وہ عظیم مطبخ جن کے چولہوں میں دہکنے والے انگاروں پر کبھی راکھ نہیں جمی تھی۔ دولت ہی کے زور پر تو گرم رہ سکتے تھے وہ بڑے بڑے ریوڑ جو چراگاہوں کا صفایا کر دیتے تھے، دولت ہی کی نشانی تو تھی۔

لیکن اس کے باوجود آج بنی سلیم کا ہر سردار اس سوچ میں بہت گہرا ڈوبتا جا رہا تھا کہ وہ اپنی عزت کو بچانے کے لئے ہتھیار کہاں سے لائے۔ اس کے قبیلے نے اُسے مدد پر پکارا تھا۔ وہ اس پکار پر کس طرح لبیک کہے۔

اوس اور خزرج کی خانہ جنگیوں نے اس قبیلے کو تباہ کر دیا تھا۔ خول موجود تھا۔ دولت اور ثروت کی فراوانی کے سارے ظاہری نشان موجود تھے لیکن اندر سے پورا قبیلہ ہی کیا ——— یثرب کا ہر عرب قبیلہ کھوکھلا ہو چکا تھا۔

اور لطف یہ ہے کہ کھوکھلے پن کی اس وجہ کو سبھی جانتے تھے۔

ہر قبیلہ، ہر شاخ اور ہر بطن کے ایک ایک بچے کو اس تاریخ کا ایک ایک حرف یاد تھا کہ فلسطین جب حکومت روما کے ہاتھوں پر فتح ہوا تو فلسطین کے اکثر یہودی قبیلے اپنے علاقے سے نکل آئے یا مذہبی عدم رواداری کی وجہ سے نکال دیئے گئے۔ ان میں سے کچھ یہودی خاندان اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد یثرب کی سرسبز وادیوں میں آ گئے۔ زمین زرخیز تھی۔ شہر

تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور گرم مصالحے کی سب سے بڑی منڈی کی حیثیت سے کافی منفعت بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ قبیلے یہیں پر ٹک گئے تھے۔ بنو نصیر والوں نے صحرائے ہرا کے ایک نخلستانی علاقے کو اپنا مرکز بنایا جو وادیٔ زبادیہ کے درمیان ایک گہری نشیبی آتش فشاں پہاڑی کی چٹان پر واقع ہے۔ اس کے گرداگرد چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں۔ جن کو مجموعی طور پر خیبر کہا جاتا تھا۔ بنو نصیر پناہ گیر بن کر آئے۔ تھوڑی بہت دولت بھی اُن کے پاس تھی۔ خیبر کی بستیوں میں رہنے والے عربوں نے اپنی روایتی شان کے مطابق انہیں پناہ دی۔ اور گو عربوں اور یہودیوں کے درمیان مذہبی اختلافات تھے۔ تاہم عربوں نے ان اختلافات کو نظرانداز کر دیا۔ یہ سمجھ لیا کہ ہم اپنے بتوں کی پوجا میں مگن رہیں گے۔ اور یہودی اپنے تنہا خدا ـــــ یہوداہ ـــــ کی عبادت کرتے رہیں گے۔ کثرت آخر اکائی سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے ایک نہ ایک دن آئے گا۔ جب یہودیوں پر عربی دیوتاؤں کی طاقتیں آشکارا ہو جائیں گی اور یہودیوں کی گردنیں بھی ان کے سامنے خم ہونے لگیں گی۔

لیکن وہ جس چیز کو بھول گئے تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ مہمان داری اور آنے والے کی عزت و تکریم کا جو جذبہ اُن کے قومی خصائل میں شامل تھا اُس نے انہیں جس چیز سے بے پروا بنا دیا تھا وہ یہ تھا کہ یہودی ہمیشہ اور ہر حال میں یہودی ہی ہوتا ہے وہ خواہ کہیں بھی پیدا ہوا اُس کا خون نہیں بدل سکتا۔ چنانچہ یثرب اور خیبر میں آنے والے یہودیوں نے بھی قومی خصائل کو برقرار رکھا اور پناہ دینے والوں کو لوٹنے کے پورے ہتھیار تیار کر لئے۔ فصل بونے کے

موسم میں اشرفیوں کی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے جاتے۔ ہر عرب زمیندار کو
اُس کے گھر میں جا کر قرض دیا جاتا اور اس کے عوض ان کی زمینیں لکھالی جاتیں
کٹائی کے موسم پر محض زمینداروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے صرف سود لینے
پر ہی اکتفا کی جاتی اور اصل ان کے ذمے واجب الادا چھوڑ دیا جاتا یہاں
تک کہ اصل اور سود مل کر زمیندار کی حیثیت سے بڑھ جاتا اور مسکرا مسکرا
کر ادب اور لحاظ کے تمام ہتھیاروں سے سجا ہوا یہودی اس کی زمین کا
مالک بن جاتا۔ خود قبیلے کا جرگہ اپنے آدمی کے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور
ہو جایا کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا تھا کہ ان یہودیوں کو ہر مرنے والے
کے خاندان کے حالات کا علم رہتا۔ جہاں کسی نے آخری ہچکی لی، یہ اچھے
ہمسائے تعزیت کو پہنچ گئے۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بیواؤں کو تسلی تشفی
دی اور مدد دینے کی پیش کش کی۔ یتیم بچے ان ہمدردیوں کی طرف لپک پڑے
اور اس سے پہلے کہ وہ جوان ہو کر شعور کے سن تک پہنچ سکیں وہ زمین سے
محروم ہو جاتے۔ اگر یتیم جوان ہوں تو اُن کی خاطر داری اور دل جوئی میں بھی
کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے بہترین قسم کی شراب
مہیا کی جاتی۔ یثرب کی حسین ترین عورت اس کے دل بہلانے کو لائی جاتی۔
اور اگر کوئی اس یہودن پر عاشق ہو جاتا تو اُس کی زمین، اس کے باغات، اس
کی تجارت تک یہودی ساہوکار کے ہاتھ میں چلے جاتے اور وہ خودکشی کر
لینے پر مجبور ہو جاتا۔

اس قسم کے ہتھکنڈوں سے بہت جلد یہ پناہ گزیں بڑے مالدار بن

گئے تھے۔ بڑے بڑے کنوئیں، کھیت اور تالاب ان کی ملکیت میں چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ خیبر پورا اُن کے قبضے میں چلا گیا اور انہوں نے بستیوں کے اردگرد سبزی مائل چٹانوں سے کاٹ کاٹ کر بڑے پتھروں سے قلعے بنا لیے۔

عرب بنیادی طور پر سادہ دل ہے۔ انہیں اس قسم کے مکارانہ ہتھکنڈے نہیں آتے۔ وہ اگر دشمن ہیں تو کھلے اور اگر دوست ہیں تو بے ریا اور بے لوث۔ جب یثرب کے اکثر عربوں کی دولت یوں یہودیوں کے گھروں میں سمٹ گئی تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے یہودیوں کو یثرب سے نکال دینے کی تجویزوں پر غور شروع کیا۔

اور غور بھی کیا ہوتا ——؟ ان کے سامنے صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ اور وہ جنگ کا راستہ تھا۔ چنانچہ یثرب کے عرب قبائل نے مل کر یہودیوں پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور انہیں نکال باہر کرنے کا ارادہ مصمم کر لیا۔

لیکن یہودیوں نے طاقت کا جواب طاقت سے دینے کی بجائے پھر انہی مکارانہ چالوں پر تکیہ کیا اور عربی قبائل کو باہم لڑا دینے کی سازش شروع کر دی۔

جہاں بھوک ہو وہاں ہر قسم کی سازش پھل جایا کرتی ہے۔ یہودی یثرب کے عربوں کو معاشی طور پر مفلوج بنا چکے تھے۔ اس لیے ان کی یہ سازش پوری طرح سے کامیاب ہوئی۔ اوس اور خزرج کی قدیم رقابتیں اُبھر کر سطح پر آگئیں اور دونوں طرف سے تلواریں کھچ گئیں۔

خانہ جنگی اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ یثرب پر ٹوٹ پڑی

معاشی استحصال نے پہلے ہی سے کمر توڑ رکھی تھی اُس پر خانہ جنگی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اوس اور خزرج کی مختلف شاخیں مختلف بہانوں سے لڑتی رہیں اور یہودی دونوں کو آلات جنگ مہیا کرنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ یثربی عربوں کی رہی سہی پونجی بھی یہودی علاقوں میں سمٹنے لگی۔

اوس اور خزرج کے قبائل بالعموم اور بنی کنانہ کی شاخیں بالخصوص اس تاریخ سے پوری طرح واقف تھیں لیکن اس واقفیت کے باوجود وہ یہودیوں سے صرف نفرت کر سکیں۔ انہیں یہودیوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ انہیں صرف اپنا ہی نہیں پورے یثرب کا دشمن سمجھتی تھیں اور پورے خلوص اور پوری سچائی کے ساتھ اس دشمنی پر قائم تھیں لیکن اس کے باوجود ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی خیالی دشمنیوں اور رقابتوں کو چھوڑ کر اس مشترکہ دشمن کے استیصال کی کوئی تدبیر کرتیں جو ان کی قومی زندگی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ان کے وہ غلط تصورات اپنی جگہ پر قائم تھے جن کو یہودی استعمال کرتے اور ایک بھائی کے ہاتھ سے دوسرے بھائی کا گلا کٹوا دیتے تھے۔ وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے پر فوقیت اور برتری کے دعوے باندھتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ نسل اور خاندان کا غلط غرور ہی انہیں بربادی کی طرف لئے جا رہا ہے ــــــ وہ یہودی کو دشمن سمجھنے کے باوجود ایک دوسرے سے عزت اور شرف کے خیالی تاج

چھین لینے کے لئے یہودی ہی سے قرض لے کر تلواریں اور ڈھالیں بنواتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کا کھوکھلاپن خود ان کی نگاہوں کے سامنے ننگا ہو کر ناچنے لگا۔

اور اب ان تمام اُلجھنوں کے ساتھ ایک اور اُلجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اب یثرب کے عربی خاندان اپنے کھوکھلے پن کو مصنوعی طور پر چھپانے کے لئے قرض لے رہے تھے۔ اپنے کنوئیں اور اپنے باغات اس لئے رہن رکھ رہے تھے کہ اس کا بھائی یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ غریب ہو چکا ہے اور بھائی اس لئے قرض لے رہا تھا کہ وہ اپنی برتری کا لوہا منوانے کے لئے اپنے سے ڈرے ہوئے بھائی سے ڈر رہا تھا۔

یہ زہریلا چکر چل رہا تھا کہ مکّہ سے مدد کے لئے پکارا گیا۔ سب جمع ہوئے ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اس پکار پر لبیک کہنے کے لئے بیتاب نہ ہو۔ لیکن ایسا کوئی بھی نہ تھا جو فوری طور پر اپنے عزیز و اقارب کی مدد پر دوڑ پڑے۔ سب اپنے کھوکھلے پن کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے اور سب پوری قوت سے اُسے ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک نوجوان کی جوشیلی تقریر کو ایک بڈھے نے کھنکار کر روکا،

"تم جو کہہ رہے ہو ٹھیک ہے میرے چچا کے پوتے —— ہمیں واقعی جوق در جوق اور فوج در فوج مکّہ کی طرف جانا چاہیے اور قریش کی مدد کرنی چاہئیے۔ ہوازن کے ساتھ ہماری پرانی عداوت ہے اس میں کسی کو

کلام نہیں۔"

"میں اسی لئے کہہ رہا ہوں۔" نوجوان کا جوش قدرے سرد پڑ گیا تھا بوڑھے کا ٹوکنا اُسے بُرا لگا تھا لیکن بزرگی کی عزت بہر حال لازمی تھی! اُس نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش میں اُس جوش کو بھی دبا دیا جو اس کی تقریر کا واحد دلچسپ پہلو تھا۔

"ہمیں فوراً قریش کی مدد کو پہنچنا چاہیئے۔ یہ صرف قریش کی مدد نہیں، اپنی پُرانی عداوتوں کا بدلہ لینے کا بہترین اور سنہرا موقع ہے۔"

"بالکل درست!" بوڑھے نے پھر کہا" بلکہ میری طرف سے اپنی جوشیلی باتوں میں ایک اور کا اضافہ کر لو۔ اس موقع کو اگر بنو سلیم نے کھو دیا، تو شاید دوبارہ ایسے حالات پیدا نہ ہوں۔ اور بنی سلیم اپنے پُرانے دشمنوں سے اپنے باپ دادا کی دشمنیوں کے بدلے نہ لے سکیں۔"

تصدیق اور تائید کی ہلکی آوازوں کی چھوٹی لہریں آدمیوں کے اس متحرک تالاب پر اُبھریں اور پھر غائب ہو گئیں۔

"تو پھر ہم کیوں مکّہ کے ان معزز پیغامبروں کو صاف لفظوں میں یہ نہیں کہہ دیتے کہ ہم قریش والوں کے ساتھ ہیں اور ہر طرح سے ان کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔"

"ہاں ــــ ہم کیوں ایسا نہیں کہتے ــــ؟" بوڑھے نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا" ہم کیوں یہ نہیں کہتے۔"

"میں ایک تجویز پیش کروں۔" دُور بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے فورا

مل کر اور اپنے آپ کو پوری طرح سے تیار کر کے کہا،
"ضرور ضرور" کا غلغلہ اٹھا۔ لوگ اس پراسرار خاموشی سے اکتا چکے تھے۔

"میری تجویز یہ ہے کہ بنو سلیم کے ہر گھر پر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ تلواروں، ڈھالوں، نیزوں اور دوسرے سامانِ حرب کی ایک مقررہ مقدار دے۔ یہ ساری چیزیں چنے ہوئے چند آدمیوں کے سپرد ہوں اور جب ہم متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمارے پاس وافر مقدار میں سامان جنگ جمع ہو گیا ہے تو قریش کو اطلاع دے دی جائے۔"

مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگ چور آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

آخر اسی بوڑھے نے پھر گلا صاف کیا اور پوچھا،
"سامانِ جنگ تو شاید اس طرح جمع ہو جائے ــــ لیکن بنی سلیم والو ــــ مکہ کی مدد کو بڑھنے والی فوج کا رسد کہاں سے آئے گا؟"
"وہ بھی اسی طرح جمع کر لیا جائے گا۔" اسی آدمی نے جواب دیا۔
"بات تو کچھ غلط معلوم نہیں ہوتی۔" صدارت پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر سردار نے کہا جس کے گلے پر تلوار کا ایک لمبا زخم اس کی سیاہ داڑھی کے گنجان دھندلکوں میں جیسے بہہ کر جذب ہو گیا تھا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔
"مجھے بھی اس کی معقولیت پر کوئی شبہ نہیں۔" بوڑھے نے اطمینان کے

ساتھ کہا — "لیکن ایک سوال ہے۔ اگر قوم اجازت دے تو پوچھ لوں"۔

"ضرور — ضرور"۔

"اس سے کسی کی توہین مقصود نہیں لیکن ہم جنگ کے متعلق غور کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جنگ بڑی اہم چیز ہوتی ہے۔ اس کو قطعاً غیر جذباتی ہو کر سوچنا چاہیئے"۔

"آپ تکلف نہ فرمایئے"۔ تجویز پیش کرنے والے نے پورے اعتماد سے کہا "بے تکلف کہئے۔ ہم سب واقعہ کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ رہے ہیں"۔

"میرا مطلب تھا۔ میں اپنے بھائی ہی سے پوچھتا ہوں کہ وہ اس قومی جنگ میں کتنے نیزے، کتنے تیر، کتنی کمانیں، کتنی ڈھالیں، کتنی تلواریں دے سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے چندہ کتنا دے سکتے ہیں میرے بھائی"۔

"تم کیا دو گے؟" تجویز پیش کرنے والا چمک کر کھڑا ہو گیا۔

"کچھ نہیں — مجھ میں ایک حبہ دینے کی ہمت نہیں ہے"۔ بوڑھے نے نہ جانے کس طرح صاف گوئی اختیار کرنے کی طاقت اپنے اندر پیدا کر لی تھی۔ "اسی لئے میں نے پوچھا ہے کہ میرا بھائی کیا دے سکتا ہے"۔

"جو قوم کہے گی"۔

"قوم — ؟" بوڑھے نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا "کیا قوم اس بات کی بھی ضمانت دے گی کہ میرا بھائی جو کچھ دے گا وہ لگنے جانے سے پہلے راستہ میں نہیں روک لیا جائے گا — میرا مطلب ہے کوئی

یہودی ——— اُسے اپنا مال سمجھ کر نہیں روک لے گا۔ اور ہمارے قبیلے میں اتنی ہمت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اس یہودی کے دعوے کو باطل ثابت کر دے۔ اور یہ مال اُس سے لے کر قومی ضرورت میں صرف کر دے۔"

بڈھے کی باتوں سے مجلس میں سناٹا چھا گیا تھا۔ آج ان جمع ہونے والے عظیم المرتبت سرداروں میں سے تقریباً ہر ایک نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ اُن کے راز کسی سے پوشیدہ نہیں اور اس مجلس میں آنے والے ہر آدمی کا راز ایک دوسرے کو معلوم ہے۔

لیکن انسان بہر حال انسان ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں سے آخری لمحے تک جنگ کرتا ہے۔ اس سناٹے پر بہت جلد قابو پا لیا گیا۔ سچائی کے پہلے حملے نے ذہنی قویٰ کو سُن ضرور کر دیا تھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ایک نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا اور تڑپ کر کہا،

"اگر یہودیوں نے اس کی جرأت کی تو ہماری تلواریں انہیں زندہ نہ چھوڑیں گی۔"

بڈھے نے مطمئن آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا اور اعتماد سے بھرپور آواز کے ساتھ کہا،

"شاید میرے چچا کے بیٹے کو یہ بات یاد نہیں رہی کہ یہودی فلسطین سے بھاگے ہوئے بے دست و پا پناہ گزین نہیں رہے ہیں۔ ان کی کئی نسلیں اس شہر میں گزر چکی ہیں اور اس عرصے میں خیبر کی بستیوں میں کئی ایسے سنگین قلعے تعمیر ہو چکے ہیں جن کی دفاعی حیثیت ہماری ساری قوتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے

—— میرا بھائی جانتا ہے کہ ہم یہودیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم اُن سے جنگ نہیں چھیڑ سکتے۔"

"لیکن یہ قومی سوال ہے۔"

"کوئی سوال خواہ اُس کی حیثیت بظاہر انفرادی ہی کیوں نہ ہو، قومی سوال ہی ہوا کرتا ہے، میرے چچا کے بیٹے —— لیکن اس کے باوجود گزشتہ دو ڈھائی صدیوں میں جو کچھ ہوا میں اس کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتا۔ یہودیوں نے ہمیں آپس میں لڑایا ہے۔ معاشی طور پر ہمیں اپنا غلام بنا لیا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک ایسا نہیں جس کا ایک ایک بال یہودیوں کے قرض میں نہ بندھا ہو —— کوئی نہیں جس کی زمین، جس کے باغات، جس کے مکان، جس کے جانور یہودیوں کے پاس رہن نہ ہوں۔ وہ قوم جو اس طرح اپنے دشمن کی معاشی غلامی میں مبتلا ہو۔ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتی اور آزادی کے ساتھ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔"

سبھی کو معلوم تھا کہ بوڑھا غلط نہیں کہہ رہا۔ اس لئے جوش ٹھنڈے پڑ گئے۔ چاروں طرف سے اعتراضات کی بارش ضرور ہوئی۔ بوڑھے کو ٹیڑھی آنکھوں سے بھی دیکھا گیا۔ دل ہی دل میں اُس پر قوم میں بزدلی پھیلانے کا الزام عائد کر کے اُسے بُرا بھی سمجھا گیا۔ یہ سب ہوا لیکن با ایں ہمہ سب کو اعتراف تھا کہ بوڑھا غلط نہیں ہے۔ اس لئے اعتراضات پھیکے اور بے دلانہ انداز میں کئے گئے اور بالآخر جوش نے سنجیدہ غور و فکر کی صورت اختیار کر لی۔ یہ طے پایا کہ کسی دوسرے دن کسی دوسری جگہ مجلس مقررہ کی جائے اور

اس بات پر غور کیا جائے کہ قوم کے اس اہم ترین معاملے میں بنو سلیم کس طرح اور کس انداز میں حصّہ لے سکتے ہیں۔

مجلس برخاست ہو گئی۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اور آج ——— زندگی میں پہلی مرتبہ ان لوٹ کر جانے والوں میں سے ہر کوئی اپنی بے دست و پائی کے شدید احساس میں مبتلا تھا اور پوری شدّت کے ساتھ کچھ سوچ رہا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ سبھی سوچ رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ ذہن پوری طرح سے مصروف تھے پورے غور و خوض اور پورے انہماک کے ساتھ ذہن سوچنے پر مصر تھے لیکن جب تجزیہ کیا جاتا، جب کوئی یہ سوچتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے تو اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ایک غبار ذہن کے پردوں پر مسلط تھا ——— سوچ جو دھند کی طرح ذہن کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔

آمنہؓ بنت وہب کے ماموں، بھائی اور چچا بھی ایسے ہی بوجھل ذہن لے کر گھر آئے تھے۔

دستر خوان پر بھی یہ دھند مسلط رہی۔ کوئی ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں مبتلا تھے۔

اور اسی طرح یہ گہری سوچ بنو سلیم پر کئی دن مسلط رہی۔ یہاں تک کہ مکّہ سے آنے والے یہ پیغام لے کر لوٹ گئے کہ یثرب والے قریش کی مدد کو تیار ہیں ——— یثرب والوں کے خون کا ہر قطرہ قریش کے لئے بہہ جانے

کو بے تاب ہے لیکن ——— ہاں لیکن ——؟

قریش کا پیغام لانے والوں کو کسی نے کھل کر اپنی اصلی کیفیت سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ یہ کہا گیا تھا کہ قریش کی جنگ یثرب والوں کی اپنی جنگ ہے لیکن یثرب والے اپنے جھگڑوں میں بہت بُری طرح سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ اوس و خزرج کے چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں پُرانے جھگڑے چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے جب تک یہ جھگڑے طے نہ ہولیں اور یثرب والے متحد اور متفق نہ ہولیں قریش کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے۔ پیغام بھیجا گیا کہ اگر ممکن ہو تو قریشی ہوازن والوں کے ساتھ معاملے کو طول دیں اور یثربی دوستوں اور رشتہ داروں کو اتنا موقع دیں کہ وہ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کر سکیں اور متحد ہو سکیں۔

قریش کے پیغام بر یہی پیغام لے کر گئے تھے لیکن ان میں سے ہر ایک اصل حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔

قریش کے پیغامبر شام کے قریب مکّہ میں پہنچے تھے اور قریشیوں کے اکثر سرداروں نے اُن کا پر جوش خیر مقدم کیا تھا۔ خاص طور پر عبد یغوث کی بے چینی قابلِ دید تھی۔ وہ ہر روز صبح شام یثرب سے آنے والے راستے پر چڑھ جاتا اور دیر تک بوقبیس کی دوسری طرف حدِ نظر تک پھیلے ہوئے لق و دق صحرا کو دیکھا کرتا۔ ہوا کا ہر بگولا جس میں ریت اڑانے کی سکت تھی، عبد یغوث کو مضطرب کر دیتا اور وہ اپنی بوڑھی آنکھوں پر اپنے جسم کا پورا

بوجھ ڈال کر دیکھا کرتا۔ نگاہیں اکثر مایوس ہوتی رہتیں لیکن آج شام کو اُسے ایک قافلہ دکھائی دے گیا۔ اُس نے چیخ کر "یا محشر قریش" کا نعرہ مارا تھا اور یہ پیغام دُور دُور تک پہنچ گیا تھا کہ جو پیغام بر یثرب کو گئے تھے، لوٹ آئے ہیں ——

سردار عبدالمطلب کعبے کی دیوار کے سائے میں چادر بچھائے دوسرے سرداروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تو وہ بھی بے تابی کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ حارث نے کہا تھا،

"عبدلغوث کو تو ہر روز صحرا کے دامن میں قافلے نظر آتے ہیں ابا حضور آپ تشریف رکھئے، ابھی دھوپ بہت تیز ہے۔"

اور سردار عبدالمطلب کے اعصاب پر حارث کی منطق کا کچھ اثر ہوا بھی، وہ چند لمحوں کے لئے کچھ تذبذب میں مبتلا بھی ہوئے تھے لیکن پھر اُنہوں نے کچھ سوچ کر کہا تھا،

"دیکھ لینے میں کیا حرج ہے —— آؤ۔"

"غلام پتہ لے آئیں گے ابا حضور —— میں نے انہیں حکم دے رکھا ہے۔ قافلے کے آتے ہی ہمیں اطلاع مل جائے گی۔"

"شاید آمنہ کی کوئی خبر لائے ہوں یہ لوگ —— تم لوگ آؤ تو۔"

اور حارث نے مزید بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اگر عبدلغوث یثرب سے آنے والوں کے انتظار میں بے قرار تھا تو سردار عبدالمطلب کو بھی کم بے چینی نہ تھی۔ وہ صبح شام اگر بوقبیس کی بلندیوں پر نہیں

جاتے تھے۔ نو دن، گھنٹے اور لمحے ضرور گنتے رہتے تھے۔ یثرب کا پورا راستہ ان کے تصور کی محرابوں میں کھچا ہوا تھا۔ انہوں نے اس بات کا کسی پر اظہار کیا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن دل ہی دل میں وہ سوتے جاگتے یہ سوچتے رہتے تھے کہ اب قافلے نے فلاں جگہ پڑاؤ کیا ہوگا ــــ اب فلاں مقام پر ڈیرا ہوگا۔ آج انہیں یثرب پہنچ جانا چاہیئے۔ یثرب والے اُن سے ملے ہوں گے اور انہوں نے ــــ مکّہ سے جانے والوں نے ــــ آمنہ سے ملاقات کی ہوگی۔ محمدؐ سے ملے ہوں گے۔ برکہ بھی اُن سے ملی ہوگی۔ اور پھر انہیں اپنی اس بے چینی پر حیرت ہونے لگتی تھی۔ آمنہ، محمدؐ اور برکہ سے ملاقات کے فوراً بعد۔ یہ لوگ کیوں مکّہ کی طرف نہیں پلٹ پڑے۔ یثرب میں انہیں اور کون ایسے اہم کام تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ رُکے ہوئے ہیں اور پھر انہیں فوراً خیال آجاتا۔ پیغام بر صرف عبدالمطلب کے جگر پاروں کی صحت و سلامتی کی خبر لینے کے لئے یثرب نہیں گئے تھے۔ انہیں قریشیوں نے چندہ کر کے بھیجا تھا اور اس لئے بھیجا تھا کہ یثرب میں رہنے والے قریشی قبیلوں اور قریش کے حلیف قبیلوں کو ہوازن کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کریں۔ جب تک یہ کام نہ ہو جائے یہ لوگ نہیں لوٹیں گے۔

عبدالمطلب کو اپنی اس پریشانی پر یقیناً افسوس تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک اہم قومی سوال کو اپنے جذبات میں دوسرے درجے پر رکھ دیں یہ تو ایک طرح سے قومی تقاضوں کو اپنے جذباتی تقاضوں پر قربان کرنے والی بات ہے اور عبدالمطلب نے اپنی طویل زندگی میں یہ جرم کبھی نہیں کیا تھا

ان کی پوری زندگی سیاست میں گزری تھی اور انہوں نے ہر حال میں اپنے جذباتی تقاضوں کو قوم کی ضروریات پر قربان کیا تھا، لیکن یہ نیا تقاضا ــــ جذبات کی یہ نئی انگڑائی خود عبدالمطلب کے لیے عجیب اور ناقابلِ فہم تھی شاید عبداللہؓ کی وفات نے عبدالمطلب کو اُن کی بیوہؓ اور اُن کے یتیم کے سلسلے میں بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی ــــ!

ہاں یہی وجہ ہو گی ــــ!

لیکن عبدالمطلب کا دل اس تجزیئے ــــ اس جواز سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔

یا شاید آمنہؓ اور محمدؐ کے جانے سے یہ پریشانی ہو رہی تھی۔ محمدؐ تو خیر پہلے بھی بنو سعد میں رہے تھے۔ اُس وقت بھی عبدالمطلب کو ایک بے چینی ضرور رہتی تھی لیکن آمنہؓ اس کا علاج کر دیا کرتی تھیں ــــ ہاں اسے علاج ہی کہیئے۔

انتظار ضرور رہتی تھی۔ اُن کی صحت کے متعلق بھی پریشانی ہوتی تھی۔ جی میں بار بار یہ آتا تھا کہ بنو سعد میں کسی کو بھیجیں اور محمدؐ کا حال پوچھ بلائیں اور پھر اپنے اس خیال کو اکثر آمنہؓ کے سامنے پیش بھی کیا جاتا لیکن آمنہؓ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا کرتیں،

"محمدؐ اچھے ہیں ابا حضور" یا "مکے کی آب و ہوا ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ بچہ صحت مند رہ سکے۔" یا پھر یہ "محمدؐ کو ابھی بنو سعد کی ضرورت ہے۔"

یہ منطق عبدالمطلب کو لاجواب کر دیا کرتی اور اس کی مدد سے وہ اپنی

جانتے تھے۔ نو دن، گھنٹے اور لمحے ضرور گنتے رہتے تھے۔ یثرب کا پورا راستہ ان کے تصور کی محرابوں میں کھچا ہوا تھا۔ انہوں نے اس بات کا کسی پر اظہار کیا یا نہیں یہ الگ بات ہے۔ لیکن دل ہی دل میں سوتے جاگتے یہ سوچتے رہے تھے کہ اب قافلے نے فلاں جگہ پڑاؤ کیا ہوگا ۔۔۔ اب فلاں مقام پر ڈیرا ہوگا۔ آج انہیں یثرب پہنچ جانا چاہیئے۔ یثرب والے اُن سے ملے ہوں گے اور انہوں نے ۔۔۔ مکّہ سے جانے والوں نے ۔۔۔ آمنہ سے ملاقات کی ہوگی۔ محمدؐ سے ملے ہوں گے۔ برکہ بھی اُن سے ملی ہوگی۔ اور پھر انہیں اپنی اس بے چینی پر حیرت ہونے لگتی تھی۔ آمنہ، محمدؐ اور برکہ سے ملاقات کے فوراً بعد یہ لوگ کیوں مکّہ کی طرف نہیں پلٹ پڑے۔ یثرب میں انہیں اور کون ایسے اہم کام تھے جن کی وجہ سے یہ لوگ رُکے ہوئے ہیں اور پھر انہیں فوراً خیال آجاتا۔ پیغام بر صرف عبدالمطلب کے جگر پاروں کی صحت وسلامتی کی خبر لینے کے لئے یثرب نہیں گئے تھے۔ انہیں قریشیوں نے چندہ کر کے بھیجا تھا اور اس لئے بھیجا تھا کہ یثرب میں رہنے والے قریشی قبیلوں اور قریش کے حلیف قبیلوں کو ہوازن کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کریں۔ جب تک یہ کام نہ ہو جائے یہ لوگ نہیں لوٹیں گے۔

عبدالمطلب کو اپنی اس پریشانی پر یقیناً افسوس تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک اہم قومی سوال کو اپنے جذبات میں دوسرے درجے پر رکھ دیں یہ تو ایک طرح سے قومی تقاضوں کو اپنے جذباتی تقاضوں پر قربان کرنے والی بات ہے اور عبدالمطلب نے اپنی طویل زندگی میں یہ جرم کبھی نہیں کیا تھا

ان کی پوری زندگی سیاست میں گزری تھی اور انہوں نے ہر حال میں اپنے جذباتی تقاضوں کو قوم کی ضروریات پر قربان کیا تھا لیکن یہ نیا تقاضا ——— جذبات کی یہ نئی انگڑائی خود عبدالمطلب کے لئے عجیب اور ناقابل فہم تھی شاید عبداللہ کی وفات نے عبدالمطلب کو اُن کی بیوہؓ اور اُن کے یتیم کے سلسلے میں بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی ——!

ہاں یہی وجہ ہو گی ——!

لیکن عبدالمطلب کا دل اس تجزیئے ——— اس جواز سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔

یا شاید آمنہؓ اور محمدؐ کے جانے سے یہ پریشانی ہو رہی تھی۔ محمدؐ تو خیر پہلے بھی بنوسعد میں رہے تھے۔ اُس وقت بھی عبدالمطلب کو ایک بے چینی ضرور رہتی تھی لیکن آمنہؓ اس کا علاج کر دیا کرتی تھیں ——— ہاں اسے علاج ہی کہئے۔

انتظار ضرور رہتی تھی۔ اُن کی صحت کے متعلق بھی پریشانی ہوتی تھی۔ جی میں بار بار یہ آتا تھا کہ بنوسعد میں کسی کو بھیجیں اور محمدؐ کا حال پوچھ بلائیں اور پھر اپنے اس خیال کو اکثر آمنہؓ کے سامنے پیش بھی کیا جاتا لیکن آمنہؓ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا کرتیں،

"محمدؐ اچھے ہیں ابا حضور" یا "مکے کی آب و ہوا ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ بچہ صحت مند رہ سکے" یا پھر یہ "محمدؐ کو ابھی بنوسعد کی ضرورت ہے۔"

یہ منطق عبدالمطلب کو لاجواب کر دیا کرتی اور اس کی مدد سے وہ اپنی

چھپتی بہو کے انداز میں سوچنے پر اپنے آپ کو کامیابی کے ساتھ مجبور کر لیا کرتے تھے۔

اور اب خود آمنہؓ بھی نہ تھیں جو مادرانہ شفقت کے پورے زور کے ساتھ دادا کی بے چینی کو تھپک کر سلا دیتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عبدالمطلب ان دونوں کے متعلق پریشان تھے۔

ہاں —— یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے ——!

لیکن ان کا دل اس وجہ سے بھی مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ذہن کافی دیر تک اس دلی کیفیت کا تجزیہ کرتا۔ وجہ اور جواز کے ساتھ گھنٹوں آنکھ مچولی ہوتی اور آخر عبدالمطلب اس آنکھ مچولی سے تھک کر اس پر سوچنا ہی چھوڑ دیتے۔

وہ یہ کہہ لیتے،

"ہاں پریشان ہوں —— محمدؐ نہیں ہیں اس لئے پریشان ہوں۔ ٹھیک ہے اُن سے مجھے بے پناہ —— لامحدود —— بے کنار محبت ہے۔ درست ہے میں نے اپنے کسی بیٹے —— کسی پوتے سے ایسی محبت نہیں کی لیکن دل پر بس کس کا چلتا ہے۔ یہ ہے ہی ایسا۔ اس سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ سب کو ہو جاتی ہے۔"

اور اس طرح انہوں نے اپنے ذہن کو اپنی بے چینی کے ساتھ ایک طرح سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ یہ بے چینی اُن کا معمول بن گئی تھی اور ان سے ملنے والوں نے بھی اسے معمول کے طور پر قبول کر لیا تھا۔

حارث اور عبدالمطلب کے دوسرے لڑکوں نے مزید سوال کرنے کی ضرورت اسی لئے محسوس نہیں کی تھی اور خاموشی سے والد کے ساتھ چل دیئے تھے۔

حرم سے باہر لوگ گھروں سے نکل نکل کر چوک کی طرف ایک سیلاب کی صورت میں بہتے نظر آ رہے تھے۔ سردار عبدالمطلب اپنے بیٹوں کے ساتھ اس ہجوم میں شامل ہو گئے۔ قریشی انبوہ میں بھی اپنے سردار کی تکریم کر رہے تھے اور قوم کے نوجوان سردار کے ارد گرد ہالے کی صورت میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ خیال رکھا جا رہا تھا کہ سردار کو ہجوم کی وجہ سے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

اپنے باپ کی یہ عزت دیکھ کر عبدالمطلب کے بیٹوں کی گردنیں تن گئیں اور ان کی چال میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا ہو گیا۔

سردار عبدالمطلب ان ساری باتوں سے بے نیاز اپنے خیال میں مگن تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ چوک آ گیا۔

ہجوم بہت بڑا تھا۔ سردار عبدالمطلب خاصے قدآور ہونے کے باوجود اُن لوگوں کو دیکھ نہیں سکے تھے جو یثربیوں کا پیغام لے کر آئے تھے۔ اُن کی نگاہیں سروں کی اونچی نیچی اُبھری دبی ہوئی چادر پر اٹک کر رہ گئیں۔ تاہم وہ آگے بڑھتے گئے۔

اور پھر قریشیوں نے اپنے سردار کو آتا دیکھ لیا۔

"راستہ دو ——— راستہ چھوڑو ——— سردار عبدالمطلب

آرہے ہیں۔ کی آوازیں عمومی شور کی سطح پر واضح بلبلوں کی طرح اُبھرتی اور پھوٹتی رہیں۔ راستے میں آنے والے چھٹتے اور ہٹتے رہے اور سردار عبدالمطلب ہنستے مسکراتے، خیر مقدم کرتے ہوئے آدمیوں سے بنی ہوئی ایک تپلی سی گلی میں سے ہو کر تیزی سے بڑھتے گئے۔ جس احترام کو ان کی شخصیت نے مکّی نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا گو اُس کی بنیاد جنگ کی دُور سے آنے والی دھمک ہی پر تھی تاہم یہ منظر مکّے میں رہنے والے قریشی عوام کی اجتماعی ذہنیت کا بڑا ہی اچھا ثبوت تھا۔ قریش بہت سے چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں منقسم ہونے کے باوجود ایک تھے اور وقت پڑنے پر ایک ہو سکتے تھے۔ عبدالمطلب یہی سوچتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

آخر "یا سردار قریش" کی بلند آواز نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے دیکھا بنی عدی کے وہ نوجوان جو اپنے ادھیڑ عمر سالار کے ہمراہ یثرب گئے تھے، بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔

سردار قریش نے ایک ایک کو سینے سے لگایا اور شفقت سے ایک ایک کے سر پر بوسہ دیا۔ سروں میں لگے ہوئے زیتون کے تیل کی پھیکی پھیکی خوشبو یمن کے عطر پر چھا جانے کی پوری اور کامیاب کوشش کر رہی تھی۔

لیکن سردار قریش کی توجہ اس طرف نہیں ہوئی۔ اُن کے دل میں خلجان سا بپا تھا۔ وہ ان آنے والوں سے فوراً محمدؐ اور آمنہؓ بنت وہب کا حال

پوچھ لینا چاہتے تھے۔ ان کی زبان اپنے جگر گوشوں کے متعلق پوچھنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ لیکن قوم سردار قریش سے کسی اور سوال کی متوقع تھی۔ اس لئے سردار قریش کی بوڑھی رگیں بڑی شدت کے ساتھ اپنے جسم اور روح کی اس بے چین خواہش کے خلاف جنگ کر رہی تھیں اور آخر سیاست جذبات پر قابو پا لینے میں کامیاب ہوئی۔ سردار قریش نے استقبال کی رسمی باتوں کے بعد اپنی ہموار متین آواز میں کہا،

"امیر حبش ——— قوم نے تمہیں یثرب والوں سے کچھ پوچھنے کے لئے بھیجا تھا۔ قوم تمہارے جواب کی منتظر ہے۔"

"سردار قریش" قاصدوں کے امیر نے پورے رسمی انداز میں کہا، "میں یثربی دوستوں اور رشتہ داروں کی طرف سے جواب لے کر حاضر ہو گیا ہوں لیکن اگر سردار قریش اجازت دیں تو میں آج کے دن آرام کی مہلت چاہوں گا۔ لمبے سفر نے مجھے تھکا دیا ہے سردار قریش!"

ہجوم کی طرف سے احتجاج کا غلغلہ بلند ہوا۔ پرجوش قریشیوں نے امیر حبش کو چیخ چیخ کر پکارا اور اسے رائے عامہ کے بوجھ سے دبا دینا چاہا لیکن امیر حبش اس وقت اپنی اہمیت کو پوری طرح سے سمجھتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ قریشیوں کو ایک رات انتظار کی زحمت دینے سے اس کی اہمیت میں کتنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نے پھر سردار قریش کو مخاطب کیا ———،

"معاملہ اہم ہے اور میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ بعض

ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو اکثر کانوں سے محفوظ رہنا چاہیئے! بنات ہوازن پوری طرح سے چوکنے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہونا چاہیئے سردار قریش ——— میں ذاتی طور پر اس معاملے کو بڑی اہمیت دیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس طرح جلسۂ عام میں یثربیوں کے جواب کو نشر کرنا ہمارے قومی مفاد کے خلاف ہے۔ میں سردار قریش سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ کل دار الندوہ میں جلسہ فرمائیں۔ میں وہاں اپنی روداد عرض کر دوں گا۔"

سردار قریش امیر حبیش کی اس دلیل سے اتنے متاثر نہیں ہوئے تھے البتہ وہ اپنے دل میں ابھرتی ہوئی گھبراہٹ سے ضرور خوفزدہ تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ اپنے دل کی بات زبان سے نہ کہہ دیں۔ اس لئے وہ جلد از جلد اس ہجوم سے نکل جانا چاہتے تھے۔

انہوں نے اپنی آواز کو ہموار بنانے کی کوشش کی اور کہا،

"میری رائے میں امیر حبیش کی اس التجا کو نہ ماننا غلط ہوگا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جواب سننے کے لئے کل ہی کا وقت موزوں ہے۔"

مخالفت اور حمایت میں آوازیں ایک شور کی شکل میں بلند ہوئیں اور بالآخر حرب بن امیہ ایک بیٹھے ہوئے اونٹ کے کجاوے پر اپنے غلاموں کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور اپنی بلند آواز میں بولا،

"یا معشر قریش ——— تم نے سردارِ قریش کا حکم سن لیا۔ میں منادوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ آج پورے مکہ میں منادی کر دیں کہ کل دوپہر سے پہلے دار الندوہ میں مجلس مشاورت منعقد ہوگی اور امیر حبیش یثرب سے جو جواب

لے کر آئے ہیں قوم کے سامنے رکھیں گے۔ قوم ان جوابات پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی کہ بنو ہوازن کے ساتھ جس جھگڑے کا آغاز ہوا ہے اُسے کس صورت میں نبٹایا جائے۔ اس لئے میری التجا ہے کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور منادی کا انتظار کریں:

اور جب گلابی شام مکّے کے آسمانوں پر نقش کی جا رہی تھی جب سردار قریش نے ڈھول کی آواز کے بعد منادی کرنے والے کی آواز سنی جو اُن کے حکم سے پورے مکّہ کو مطلع کر رہا تھا۔ اس وقت سردار قریش اپنے گھر میں تخت پر بیٹھے تھے۔

منادی کرنے والے کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی اور سردار قریش کے چہرے پر سوچ اور استغراق کی گہری لکیریں ابھرتی آتی تھیں۔ حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت وہیب اپنے سرتاج سے ذرا ہٹ کر بیٹھی تھیں۔ اُن کی جوانی بوڑھے عبدالمطلب کے سفید ریش بڑھاپے کا عجیب تضاد تھی لیکن بایں ہمہ تضاد ہالہ بنت وہیب کے چہرے پر کسی ذہنی پریشانی کا اثر نہیں تھا۔ وہ ایک بیٹے کی ماں اور مہربان خاوند کی بیوی کی حیثیت سے پوری طرح مطمئن تھیں۔

ہالہ نے اپنے خاوند کو ایک دو دفعہ اچٹتی نگاہ سے دیکھا اور یہ سوچ کر چپ ہو گئیں کہ سردار قریش آنے والے واقعات پر غور کر رہے ہیں۔ لیکن جب منادی کرنے والے کی آواز مکّہ کی دوریوں میں تحلیل سی ہوتی

گئی۔ اور سردار قریش یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے تو ہالہ نے حیرت سے اپنے سرتاج کی طرف دیکھا اور پوچھا،

"میرے بچے کے والد کو کسی چیز کی ضرورت ہے ــــ؟

"نہیں ہالہ ــــ" عبدالمطلب نے جلدی سے جوتا پہنا، "میرا انتظار کرنا میں ابھی آ کر کھانا کھاؤں گا۔"

"مگر رات تیزی سے آ رہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں ہالہ ــــ اور یہ رات اگر آ گئی تو مجھے بہت پریشان کرے گی۔"

ہالہ نے حیران آنکھوں سے دیکھا عبدالمطلب جا چکے تھے۔

ہالہ کو یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے تک اپنے سرتاج کی واپسی کا انتظار کرتی رہی ہیں۔ دیئے میں بتی ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ اکسانی پڑی تھی اور ہالہ نے ایک بار نہیں ہزار بار کھڑکی میں سے جھانک کر مکے کے سنسان بازاروں کو دیکھا تھا جو رات کے پہلے ہی پہلے اشارے پر اس طرح سو گئے تھے گویا رات نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ کعبہ دور سے ایک کالے نکتے کی طرح دکھائی دیتا تھا اور اس میں ٹمٹماتے چراغ ایک روشن صند کی طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ نظر آتے تھے۔

آخر سردار قریش تشریف لے آئے ــــ!

اور کتنے خوش تھے سردارِ قریش ــــ!

انہوں نے آتے ہی ہالہ کو یہ خوشخبری دی کہ وہ یثرب سے آنے

والے قافلے کے امیر بحیش سے مل کر آ رہے ہیں اور ہالہ کے تمام عزیز اور رشتہ دار خوش ہیں۔

ہالہ نے اس خوشخبری کو مسکراتے ہونٹوں اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ سنا اور پھر سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن سردارِ قریش ان سوالات کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے ان میں سے ایک سوال کا جواب نہیں دیا اور ہالہ کے گھر والوں کی خوشی کی خبر سنانے کے فوراً بعد کہا،

"محمدؐ بالکل ٹھیک ہے ——"

"اچھا اور میرے چچا کا لڑکا؟" ہالہ نے پوچھا۔

"امیر بحیش کہتا تھا —— محمدؐ سارا دن اپنے نانا کے تالاب پر کبوتروں اور بطخوں سے کھیلتا ہے۔ دن بھر وہیں ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی لڑکی بھی —— جانے کیا بھلا سا نام بتایا تھا امیر بحیش نے —— بہرحال وہ بھی محمدؐ کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔"

"وہ میری پھوپی کی بیٹی ہے —— بڑی شریر ہے۔ ہم اُسے عربدہ کہتے ہیں۔"

"تو خیر ——" سردارِ قریش تو جیسے صرف اپنی بات سنانے پر مصر تھے "محمدؐ دن بھر تالاب پر کھیلتا ہے۔ میں نے امیر بحیش سے پوچھا، تم محمدؐ سے خود ملے تھے۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں تالاب پر کھیلتے دیکھا ہے۔ امیر بحیش جب تالاب پر گئے تو جانتی ہو ہالہ محمدؐ کیا کر رہے تھے؟"

"کھیل رہے ہوں گے عربدہ کے ساتھ؟"

"ہاں عریدہ بھی تھی ـــــ لیکن محمدؐ عجیب کھیل کھیل رہے تھے ہالہ"
"کچھ کہہ بھی تو ڈالئے"
"اس تالاب پر کنکر بہت ہوتے ہیں۔ امیر حبیش کہہ رہا تھا"
"میں بھی اسی تالاب پر کھیلا کرتی تھی۔ کچھ ایسا گہرا نہیں اور کھجوریں بہت ہیں۔ اس لئے جگہ بہت ٹھنڈی ہوتی ہے"
"ہاں تو محمدؐ" سردار عبدالمطلب نے جیسے ہالہ کی بات ہی نہیں سُنی اور ہالہ کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ سردار اس کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہے، "اُن کنکروں سے ایک مینار بنا رہے تھے۔ امیر حبیش کہتا ہے کہ جب اُس نے محمدؐ سے پوچھا کیا بنا رہے ہیں ابن عبداللہ۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ مینار بنا رہا ہوں۔ میں اس پر چڑھ کر اللہ سے باتیں کروں گا"
ہالہ ہنس دیں،
"بچوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں"
"لیکن محمدؐ ہر بچے سے مختلف ہے ہالہ ـــــ ہر بچے سے مختلف ہے، میرا محمدؐ"
"وہ تو ٹھیک ہے" ہالہ اپنے حمزہؓ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اُن کی آواز اپنے الفاظ میں وہ معنی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی جو الفاظ کی اپنی ذات میں موجود تھے "لیکن بچپن میں ایسے کھیل کھیلے ہی جاتے ہیں"
"نہیں ہالہ ـــــ ہمارا ایمان تو یہ ہے کہ ہم اللہ سے دیوتاؤں کی وساطت کے بغیر ہم کلام نہیں ہو سکتے۔ اللہ تک پہنچنے کے راستے صرف

دیوتا ہیں۔ بچے جب کھیلتے ہیں اپنے ماحول کے مطابق ہی تو کھیلتے ہیں ہالہ"

اور ہالہ کی سمجھ میں یہ اُلجھی ہوئی منطق نہیں آئی۔ انہوں نے سردار کی طرف مطمئن انداز میں دیکھا اور کہا،

"یہ بات تو ہے۔ کل ہی حمزہؓ کعبے میں پوجا کی نقل کر کے کھیل رہے تھے آپ کو پتہ ہے سردارِ قریش" ہالہ اپنے خیالات میں ڈوبتی چلی گئیں "حمزہؓ نے آپ کی جوتی سیدھی کھڑی کر دی اور کہا یہ ہے ہبل۔ خود کاہن بن کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور تیلیوں کو ہبل کے تیر بنا کر فال دیکھنے لگے"

ہالہ ہنس پڑیں۔

حمزہؓ کی اس حرکت کا ہالہ کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سردارِ قریش بھی اپنے بچے کی اس بھولی بات پر ہنسیں گے لیکن عبدالمطلب کا چہرہ اسی طرح سنجیدہ تھا۔ انہوں نے کہا،

"میں خود اس قسم کے کھیل کھیلا کرتا تھا ——— یثرب کی گلیوں میں میں نے ایک معبد بنایا تھا۔ اور اس میں بنو سلیم کے سارے دیوتا کنکروں کی صورت میں جمع کر لئے تھے۔ مگر ہالہ ——— یہ محمدؐ کا کھیل تمہیں کچھ مختلف سا معلوم نہیں ہوتا"

"کوئی خاص مختلف تو نہیں ہے"

"تم نہ جانے کیوں نہیں سمجھتیں" سردار عبدالمطلب ہالہ کی کم فہمی پر چڑ سے گئے تھے۔ اور ہالہ نے اسے محسوس بھی کر لیا تھا "محمدؐ اللہ سے بلا واسطہ ہم کلام ہونے کے لئے مینار بنا رہے تھے"

"تو پھر کیا ہوا!"

"پھر ــــــ پھر یہ ہوا کہ محمدؐ بہت مختلف ہیں ہالہ ــــــ کعبہ کے دیوتا ان کے ذہن میں جیسے موجود ہی نہیں۔"

"یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

اور سردار عبدالمطلب کا ذہن ایک جھٹکے کے ساتھ رک گیا۔ ہالہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ کعبہ کے دیوتا پرانے اور تقدس مآب تھے۔ عبدالمطلب اور ان کی کئی پشتوں نے ان دیوتاؤں کی چوکھٹ پر سجدے نچھاور کر کے ان کے تقدس اور ان کی تحریم کو ایک ایسے آہنی حصار میں محفوظ کر دیا تھا۔ جس پر کسی طرف سے کسی طور کوئی حملہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کا تقدس اور ان کی عظمت مکہ کے موسموں کی طرح پرانی اور غیر فانی تھی۔ محمدؐ ان پرانے اور عظیم دیوتاؤں کو اپنے جذبات سے یکسر خارج کئے ہوئے تھے اور یہ بات اچھی نہ تھی۔

ہالہ نے غلط نہیں کہا تھا ــــــ یہ بات یقیناً اچھی نہ تھی۔

سردار عبدالمطلب کے جذبات ایک جھٹکے کے ساتھ دوسری سمت پر بہنے لگے۔ ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے کھانا مانگا اور کھاتے کھاتے یہ ارادہ کر لیا کہ جب آمنہؓ محمدؐ کو واپس لے کر آئیں گی، تو سردار اپنے پوتے کو زیادہ وقت تک اپنے پاس رکھیں گے۔ وہ کعبے میں انہیں ساتھ لے جایا کریں گے۔ موقعہ دیں گے کہ کعبے میں رکھے ہوئے دیوتاؤں کے پجاری محمدؐ کو تعلیم دے سکیں اور اس طرح آہستہ آہستہ محمدؐ اپنے

آبار کے مذہب کو پوری طرح سے سمجھنے پر قادر ہو جائیں گے ۔

اس ارادے سے نے دادا کو پوری طرح سے مطمئن کر دیا اور وہ پوری رغبت کے ساتھ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

۴

اور محمدؐ دادا کے ان ارادوں سے قطعاً بے خبر اور بے پروا دادا سے ڈھائی سو میل کے فاصلے پر یثرب کی خوبصورت چمکیلی اور خوش آئند دھوپ میں بیٹھے کنکروں کا مینار بنا رہے تھے۔ یہ مینار ابھی ایک بالشت سے اونچا نہیں ہوا تھا اور عربدہ محمدؐ کی ہدایت کے مطابق ایسے سنگریزے جمع کرنے میں مصروف تھی جو گول اور چکنے ہوں۔ خوبصورت ہوں اور ڈھیلے ڈھالے مینار کی بلندیوں پر ٹک سکیں۔

اُس نے کئی پتھر اٹھائے تھے۔ دور سے محمدؐ کو دکھا کر پوچھا تھا،

"یہ ٹھیک ہے ابن عمؐ"

اور عربدہ کے ابن عم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار چونک کر دیکھا تھا اور پھر کافی دیر تک غور کرنے کے بعد کہا تھا،

"نہیں ——"

اور عبدہ اپنے ابن عم کے اس استغراق پر حیران ہوئے بغیر پھر پتھر چننے میں مصروف ہو گئی تھی۔ خود ابن عبداللہ کو اپنے اس استغراق کا صحیح علم نہ تھا۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں وہ نہیں جانتے تھے۔ انہیں صرف اتنا پتہ تھا کہ اُن کے دل میں ایک ایسا بلند مینار تعمیر کرنے کی خواہش ہے جس پر چڑھ کر ہر آدمی —— خواہ وہ کوئی بھی ہو —— بدو ہو یا شہری، عربی ہو یا شامی، مکی ہو یا یثربی، امیر ہو یا غریب، سردار ہو یا معمولی آدمی —— کوئی بھی ہو، اس مینار پر آجائے اور بلاواسطہ اُس ذات سے ہم کلام ہو سکے جس کو اللہ کہا جاتا تھا۔ اور جس کے متعلق ہر کوئی یہ جانتا تھا کہ وہ سب کا مالک ہے یہاں تک کہ کعبے میں رکھے ہوئے بڑے بڑے دیوتا، جن کو دیکھنے کے لئے ابن عبداللہ کو دور اُوپر تک نظریں اٹھانا پڑتی تھیں، اُسی کے بیٹے بیٹیاں تھے۔

بنو سعد میں چھوٹے حضورؐ کے رضاعی باپ اور اُن کی رضاعی والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ کوئی آدمی ان دیوتاؤں کے بغیر خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ ابن عبداللہ کے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات نہیں سماتی تھی۔ انہیں اپنے اس سوال کا ابھی تک جواب نہیں ملا تھا کہ اللہ جب سب کا مالک ہے تو پھر اُس تک پہنچنے کے راستے سبھی کو کیوں معلوم نہیں ہو جاتے اور کیوں دیوی دیوتاؤں، بھوتوں، چھلاووں اور جنوں کی مدد کے بغیر اُس تک نہیں پہنچا جا سکتا ——

خود حلیمہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکی تھیں۔

حرث اس سوال کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرنے لگے تھے۔

بنو سعد کا ہر مرد اور ہر عورت اس سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکا تھا۔

اور محمدؐ کو حیرت تھی کہ خود اُن کی والدہ جو اتنی بڑی تھیں کہ محمدؐ کے ہاتھ اُن کے کندھوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے، اس سوال کا جواب نہیں دے سکی تھیں۔

برکہ تو خیر تھی ہی برکہ ـــــ اُس نے یہ سوال سُن کر ہنس دیا تھا ادھر اُدھر کی کوئی بات کی تھی اور محمدؐ کو مزیدار گانا سنانے لگی تھی۔

برکہ بھی سمجھتی رہی تھی کہ اس کے چھوٹے آقا اُس کے گانے میں دلچسپی لے رہے ہیں، اس لئے وہ لہکتی رہی اور اُس کے میٹھے میٹھے بول ہوا میں ناچتے رہے۔ ان بولوں نے محمدؐ کی سماعت پر بھی اثر کیا لیکن اُن کے ذہن کے اندرونی پردوں کو نہ چھیڑ سکے۔ وجہ ظاہر تھی۔ ذہن اس سوال سے لبالب بھرا ہوا تھا اس میں کسی دوسرے خیال کسی دوسرے جذبے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

محمدؐ چاہتے تو برکہ کو روک دیتے اور برکہ فوراً چپ ہو جاتی بہتر بر اور چنچل ہونے کے باوجود برکہ مالک اور غلام کے رتبے کے درمیان اس نازک فرق کو پوری طرح سے جانتی تھی۔ جو بچپن سے اس کے دل میں بٹھایا گیا تھا اس کے علاوہ محمدؐ کے ساتھ والہانہ محبت اُسے باادب رہنے پر ہمیشہ مجبور کئے رہتی تھی۔ اس لئے اگر محمدؐ اُسے چپ ہو جانے کو کہتے تو وہ کبھی اس پر

اصرار نہ کرتی لیکن محمدؐ نے برکہ کو یہ بات کہہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔ برکہ کا دل دکھتا نا ——!

اس لئے وہ چپ چاپ برکہ کا گانا سنتے رہے اور جب برکہ نے اُن سے داد چاہی تو انہوں نے داد دی —— برکہ کے گلے میں رس تھا۔ اور شعروں کے انتخاب کا ذوق بُرا نہ تھا۔ اس لئے داد کھل کر دی گئی۔

اور پھر محمدؐ سے مانگنے والا، خالی ہاتھ کب لوٹایا جاتا تھا۔ جو برکہ اس سے مستثنیٰ ہو جاتی۔

محمدؐ نے برکہ کو خوش کر دیا۔

لیکن وہ سوال ——؟

اور آخر جب یثرب کی طرف آتے وقت برکہ نے راستے کی اکتاہٹوں کو کم کرنے کے لئے بابل کے اُن اونچے میناروں کا ذکر کیا جن کے کھنڈر برکہ کی ماں نے اپنے بچپن میں دیکھے تھے تو محمدؐ کے ذہن میں نئی نئی پگڈنڈیاں بننے لگیں۔ انہوں نے ان میناروں میں خاصی دلچسپی ظاہر کی۔ ان کی ہیئت اور بلندی کے متعلق بڑے باریک سوال کئے یہاں تک کہ اُن کے عظیم تخیل نے ایک مخصوص شکل اُن کے ذہن میں قائم کر دی۔

اور ان کا سوال حل ہو گیا ——؟

انہوں نے سوچ لیا کہ وہ یثرب میں پہنچتے ہی ایسا مینار تعمیر کریں گے جس کے ذریعہ دنیا کا ہر آدمی خدا سے بالمشافہ گفتگو کر سکے۔

اور اس ارادے کو انہوں نے آتے ہی عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا! ان

کے نانا کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر اُن کے نانا کی زمینوں پر ایک تالاب تھا۔ چھوٹے حضورؐ صبح سے شام تک اس تالاب کے کنارے اس مینار کی تیاری میں مصروف رہتے۔

دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ محمدؐ کھیل رہے ہیں اور مطمئن تھے کہ بچہ محفوظ و مامون ہے لیکن محمدؐ کے نزدیک یہ کھیل نہیں تھا۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس مینار کی تعمیر میں مصروف تھے۔

وہ آج بھی اسی بے پناہ سنجیدگی کے ساتھ اس میں مصروف تھے اور عزیدہ ان کے لئے کنکر جمع کر رہی تھی۔

اُس نے اپنی جھولی میں کنکر جمع کئے اور لا کر انہیں محمدؐ کے سامنے ڈھیر کر دیا۔

"چُن لو ۔۔۔۔ ابن عم ۔۔۔۔ میں اور لاتی ہوں۔"

اور محمدؐ پورے انہماک سے کنکروں کا انتخاب کرنے میں مصروف ہو گئے۔

بہت کچھ چھانٹ پھٹک کے بعد محمدؐ نے چند کنکر ڈھونڈے اور انہیں پوری احتیاط اور آہستگی کے ساتھ مینار پر رکھ دیا۔ انہیں بے انتہا خوشی ہوئی۔ اُن کا مینار ایک کنکر اور اونچا ہو گیا تھا۔ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اگر اسی طرح ایک ایک کنکر کے حساب سے مینار بڑھتا رہا تو یہ ایک دن بہت بڑا مینار بن جائے گا۔

برکہ نے آ کر اُن کے انہماک کو توڑ دیا۔

"چھوٹے حضورؐ ——" وہ کہتی آ رہی تھی۔
چھوٹے حضورؐ نے برکہ کی طرف دیکھا اور پھر مینار کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔
"امی حضور آپ کو یاد فرماتی ہیں۔"
"کہاں ہیں امی؟"
"کمرے میں، فرماتی ہیں تشریف لائیے قبرستان چلنا ہے۔"
"قبرستان!"
"ہاں ——!"
"میں بھی ساتھ جاؤں گا برکہ۔"
"جی حضورؐ!" برکہ نے کہا اور جھک کر محمدؐ کو اٹھانے لگی۔
"لیکن میرا مینار برکہ ——"
"حضورؐ کل بن جائے گا۔" برکہ نے محمدؐ کو گود میں اٹھا لیا۔ "امی فرماتی ہیں دیر ہو جائے گی اور جب سے حضورؐ تشریف لائے ہیں ابا حضور کی قبر پر دو ہی چار مرتبہ تو گئے ہیں۔"
"ہمیں اپنے کندھے پر اٹھا سکو گی برکہ؟" محمدؐ کا ذہن اور ان کی نگاہیں ابھی تک اپنے میناروں پر مرکوز تھیں۔
"کیوں نہیں آقا ——" برکہ پھول کی طرح کھل گئی۔ اُس نے زور لگایا اور محمدؐ کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ جانے کے لئے مڑی۔
"ذرا دم لو برکہ!" محمدؐ نے کہا۔ "ہم دیکھ لوں۔"

اور انہوں نے برکہ کے کندھے کی بلندیوں پر سے اپنے مینار کو دیکھا۔ ابھی مینار بہت چھوٹا تھا ــــ بہت ہی چھوٹا۔

"چلو ــــ" انہوں نے فرمایا۔

برکہ چل دی۔

"برکہ ــــ!" محمدؐ نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"آقا پر برکہ کی جان فدا ہو۔" برکہ نے محمدؐ کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم نہ گئے تو امی حضور ناراض ہوں گی۔"

"ناراض تو نہیں ہوں گی چھوٹے حضورؐ۔ لیکن انہیں بُرا ضرور معلوم ہوگا۔ اور آپ نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے امی حضور کے دل کو تکلیف ہو۔"

"ہم اس دفعہ بھی ایسا نہیں کریں گے۔"

برکہ نے اپنے گال ننھے پیارے گھٹنوں سے مل دیئے اور تیزی سے چل پڑی۔

قبرستان کے رعب دار سناٹے میں محمدؐ نے ایک عجیب بات دیکھی ــــ

مٹی کی ڈھیریاں اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں جیسے میدانِ جنگ میں لڑائی ختم ہونے کے بعد لاشوں کو اُن کی جگہ سے ہٹائے

بغیر اُن پر مٹی ڈال دی گئی ہو۔ بڑے بڑے پتھر ہر قبر کے سرہانے پر رکھے تھے
مکمل سکوت طاری تھا۔ ہوا بھی معلوم ہوتا تھا ہولے ہولے دبے پاؤں چل
رہی ہے۔ اس سکوت میں آنے والے بھی خود بخود اپنی نرم ترین آواز میں
بولنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔

لیکن اس سکوت اور اس ہمہ گیر سناٹے کے باوجود قبرستان میں ایک
عجیب بے جان قسم کی زندگی موجود تھی۔ دھیمی ہلکی آوازوں میں بھی ایک
روح تھی۔ پرندوں کے پھڑپھڑانے سے سکوت نہیں ٹوٹتا تھا بلکہ اور گہرا
ہو جاتا تھا۔

یہ دنیا ــــ عجیب دنیا تھی۔

سکوت اور سناٹے کی دنیا ــــ ایسی دنیا جہاں بربادیاں آباد
تھیں۔ جہاں موت ایک زندہ جسم کی طرح رہتی سہتی اور بستی تھی۔

یہ احساس بہت قوی تھا۔ یہاں تک کہ محمدؐ اس احساس کا اظہار کرنے
پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگے تھے۔ لیکن انہیں الفاظ نہیں ملے وہ محض
دنگ سے ہو کر رہ گئے اور قبرستان کی دُور دُور تک پھیلی ہوئی خاموشیوں
کو تکتے رہے۔

آمنہؓ کی آواز سن کر وہ متوجہ ہوئے۔

"ابا سے نہیں ملو گے بیٹا ــــ ان کے پاس بیٹھ جاؤ۔"

محمدؐ نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا اور کسی چھٹے شعور نے انہیں آمنہؓ کے ذہن
میں ابھرتے ہوئے جذبات سے آشنا کر دیا۔ ان کے ذہن نے ان جذبات

کو پوری طرح ہضم نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے جسم نے اسے سمجھ لیا۔ اور محمدؐ پوری آہستگی اور احتیاط سے قبر کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

آمنہؓ نے اپنی مادی آنکھوں سے دیکھا مٹی کی ڈھیری جسے قبر کا نام دیا جاتا ہے، ایک مرئی جھرجھری لے کر پھر ساکن ہو گئی اور آمنہ کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر یہ سوال ابل پڑا۔

"کچھ سکون ملا محمدؐ؟"

"ہاں امی ـــــ لیکن امی ابا بات تو کوئی کرتے نہیں۔"

انہیں یقین تھا کہ قبرستان میں چھائی ہوئی عجیب پر اسرار زندگی بول سکتی ہے باتیں کر سکتی ہے۔

"وہ تمہارے ساتھ باتیں نہیں کریں گے محمدؐ۔" آمنہؓ نے کہا "وہ تمہیں پیار کر رہے ہیں۔ یہی بہت ہے۔"

محمدؐ چپ ہو گئے۔ کیوں کا لفظ پوری شدت کے ساتھ اُن کے ذہن میں اُبھرا تھا لیکن انہوں نے یہ سوال نہیں پوچھا چپ چاپ بیٹھے رہے اور آمنہؓ پوری خاموشی سے قبر کے سرہانے بیٹھی رہیں۔ والدہ کا انہماک اتنا گہرا اتنا بسیط تھا کہ محمدؐ اس میں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔

اور محمدؐ کی اس پر سکوت خاموشی میں آمنہؓ چھپتے چھپاتے وہاں جا پہنچیں جہاں محمدؐ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہ اپنے عبداللہ سے کہہ رہی تھیں۔

"دیکھ لو ـــــ محمدؐ اب بڑے ہو گئے ہیں۔ ان کے دادا انہیں بے حد پیار کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں۔ انہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہو گی پھر

کیا وجہ ہے تم مجھے اجازت نہیں دے دیتے۔ کیوں اپنے پاس نہیں بلا لیتے۔"

اور عبداللہ کی طرف سے وہی پرانا جواب آیا۔

"ابھی محمدؐ کو تمہاری ضرورت ہے آمنہؓ۔ ابھی محمدؐ کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔ اگر تم آگئیں تو جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا۔۔۔؟"

"ابا حضور کی عمر آدھی گھٹ جائے گی۔ تمہارا غم انہیں زندگی سے متنفر کر دے گا۔ جانتی ہو وہ اس وقت بھی فاران کی چوٹیوں پر چڑھ کر تمہارے آنے کا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔ انہوں نے تم سے کہا تھا میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

"لیکن انہیں تو محمدؐ کا انتظار ہے۔ فاران کی چوٹیوں پر محمدؐ کا انتظار ہو رہا ہے سرتاج۔ ابا حضور نے فرمایا تھا محمدؐ تمہارے پاس میری امانت ہے۔ میں اُن کا انتظار کروں گا۔"

"اور تمہارا بھی تو کہا تھا۔"

"لیکن اصل بات تو محمدؐ کی ہے ۔۔۔ اسی لئے تو میں آج اُسے ساتھ لے کر آئی ہوں تاکہ تم دیکھ لو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ محمدؐ اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب انہیں کچھ کچھ سمجھ آگئی ہے۔ اب دادا کو بالکل پریشان نہیں کرتے۔ کسی کو نہیں کرتے۔ بڑی مسکین طبیعت ہے میرے محمدؐ کی۔ رات کو انہیں پیاس لگتی ہے یا کوئی دوسری حاجت ہوتی ہے تو خود ہی اُٹھ کر

چلے جاتے ہیں۔ کسی کو نہیں جگاتے۔ ایک دن برکہ نے شکایت کی تھی کہ چھوٹے حضور رات کو مجھے نہیں جگاتے، تو محمدؐ نے کہا تھا تمہیں بھی تو نیند آتی ہے برکہ۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے بچے کو چھوڑ کر آنے میں کوئی حرج نہیں عبداللہ ——— ابا حضور ان کی دیکھ بھال کریں گے۔"

"لیکن ابا حضور تو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ عمر کب تک وفا کریگی اور وہ کب تک محمدؐ کی دیکھ بھال کر سکیں گے۔"

"اُن کے بعد اُن کے چچا ہیں ——— حارث ہیں، ابو طالب ہیں اور بہت لوگ ہیں میں نے اکیلی اُن کی بہت خدمت کی ہے۔ کیا وہ سب مل کر میرے ایک بچے کی دیکھ بھال نہ کر سکیں گے۔"

اور یہ تکرار دیر تک ہوتی رہی۔ آمنہ کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُن کی عمر کے طویل ترلمحے اس تکرار میں گزرے ہیں کہ محمدؐ کی آواز جیسے دروازے کے باہر سے سنائی دی۔

"امی حضور!" وہ کہہ رہے تھے، "امی حضور"

آمنہ نے اس آواز کو سنا اور جیسے اُٹھ دروازے پر لپک پڑیں جس کے باہر محمدؐ کھڑے انہیں پکار رہے تھے۔

لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ امّ محمدؐ اور محمدؐ میں فاصلہ زیادہ ہو گیا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ ——— جیسے انہیں ایک لمبا راستہ طے کرنا پڑا اور بالآخر جب وہ اپنے خیالی دروازے پر پہنچیں تو محمدؐ پکارتے پکارتے تھک کر

رونے لگے تھے۔ اُن کی کالی ـــــ بے حد کالی آنکھوں میں پانی کی ایک ہلکی سی چادر تیرنے لگی تھی۔

ماں نے اپنی شخصیت کی محرابوں میں سے نکلتے ہی سب سے پہلی چیز جو دیکھی وہ یہی چادر تھی۔ وہ چونک گئیں۔

"محمدؐ!" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، "کیا ہوا میرے لال؟"

اُنہوں نے محمدؐ کو کلیجے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ دراز پلکوں پر آنسو چھلک آئے اور انہوں نے اپنے ذہن کی ان دیکھی محرابوں میں عبداللہ کے الفاظ کی گونج سنی۔

"میں نہ کہتا تھا آمنہؓ ـــــ ابھی محمدؐ کو تمہاری ضرورت ہے۔ ابھی تم یہاں میرے پاس نہیں آسکتیں۔ ابھی تمہیں مکّہ کو لوٹ جانا ہو گا ـــــ مکّہ کو لوٹ جانا ہو گا۔"

اور آمنہؓ کی دراز پلکوں پر آنسو اسی لئے آ گئے تھے وہ مکّہ کو لوٹ جانے پر مجبور تھیں۔

رات محمدؐ کا چھوٹا سا بازو آمنہ کی گردن پر پڑا تھا۔ اُن کی ٹھوڑی اپنی والدہ کے کندھے پر تھی۔

"اب تم برکہ کے ساتھ سویا کرو بیٹا۔" آمنہؓ نے ہولے سے اپنے ہاتھ سے اُن کی گدی پر کھجلی کرتے ہوئے کہا۔

"اُوں ـــــ!" محمدؐ کا چہرہ ماں کے شانے کے قریب دھنس گیا۔ بازو

زور سے ماں کی گردن سے لپٹ گیا۔

"ہم نہیں سوتے برکہ کے ساتھ۔"

"اب تم بڑے ہو گئے ہو نا ــــ!"

"پھر کیا ہوا ــــ؟"

"جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی ماں کے اتنا قریب نہیں رہتے۔ وہ دن بھر کھیلتے ہیں اور رات کو الگ سوتے ہیں۔ ماں تو انہیں یاد بھی نہیں آتی۔"

"ہمیں تو یوں ہی اچھا لگتا ہے۔"

"وہ ٹھیک ہے لیکن تم کوشش تو کرو محمدؐ ــــ کوشش کرو کہ تم ہمیں بھول جاؤ۔"

"مگر کیوں ــــ؟"

"کبھی تمہیں ابا یاد آتے ہیں۔"

"بنو سعد والے۔"

"نہیں بیٹا ــــ اپنے ابا ــــ اپنے عبداللہ۔"

"کچھ ایسا یاد تو نہیں آئے کبھی۔"

"کبھی تم انہیں یاد کر کے روئے ہو۔"

"نہیں تو۔"

"معلوم ہے کیوں ــــ؟"

"کیوں ــــ؟"

"تم نے انہیں کبھی دیکھا نہیں۔ اُن سے پیار نہیں کیا۔ اُن کے ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس نہیں کئے۔ ان کی شفقت کا اندازہ نہیں تمہیں محمدؐ ـــــ اس لئے تمہیں وہ کبھی یاد نہیں آتے ـــ تم کبھی انہیں یاد کر کے نہیں روتے۔"

محمدؐ نے ماں کی طرف سوچتی ہوئی سی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اپنی والدہ کی یہ بات پورے طور سے اُن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن آمنہؓ کو محمدؐ کے ان اثرات کو دیکھنے اور انہیں سمجھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ اپنی رَو میں کہتی چلی گئیں۔

"اگر تم میرے اتنے قریب آ گئے ـــــ اگر اس طرح لپٹتے رہے تم میرے ساتھ، تو میں تمہیں بہت یاد آیا کروں گی محمدؐ۔ تم مجھے یاد کر کے بہت رویا کرو گے اور مجھے وہاں بھی چین نہیں آئے گا۔"

محمدؐ ان باتوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھے۔ البتہ ان کے ذہن میں کوئی چیز ضرور کھٹک رہی تھی۔ انہوں نے اپنے ننھے سے دل کے ارد گرد کہیں کسی نامعلوم جگہ پر تکلیف کا احساس کیا اور بے چین ہو کر کہا،

"کہاں امی ـــــ کہاں نہیں چین آئے گا آپ کو؟"

"میرا مطلب ہے۔" ماں نے اپنی تلخ بات کو نرم کرنے کی پوری کوشش کرتے ہوئے کہا، "اگر فرض کرو مجھے کہیں سے بلاوا آ جائے۔ مجھے جانا ہی پڑے یا میں کہیں جانا چاہوں ـــــ میرا جی چاہتا ہو کہ کہیں چلی جاؤں اور تمہیں ساتھ نہ لے جا سکوں ـــــ اس وقت میں یاد آؤں گی نا تمہیں؟"

"ہاں ـــــ بہت یاد آئیں گی آپ امی۔"

"اور اگر میں تمہیں وہاں اپنے ساتھ لے کر نہ جا سکوں ۔"

"مگر کیوں ـــــ ؟"

"کیونکہ ـــــ بس ـــــ میرا مطلب ہے نہ لے جا سکوں ۔"

"ہم تو آپ کے ساتھ ضرور چلیں گے امیّ ۔"

"نہیں ـــــ" آمنہ یکایک اس اعتماد سے لرز گئیں۔ وہ ڈر گئیں اور چیخ کر بولیں "چپ رہو محمدؐ ۔"

محمدؐ سہم کر ماں کی طرف دیکھنے لگے۔ ماں نے پریشان تیزی سے گھومتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے بچے کو دیکھا۔ محمدؐ کا بھولا بھالا چہرہ سہم گیا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ حیرت میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی والدہ کو جیسے آج پہلی مرتبہ دیکھا۔ یہ تاثر ماں کی قوت برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ بنت وہب نے تیزی سے بچے کو پکڑا اور سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"میرے لال ـــــ" محبت فوارے کی طرح مقدس ہونٹوں میں سے اچھلنے لگی، "میرے محمدؐ ۔"

اس لفظ سے انہیں کتنا سکون، کتنا سرور محسوس ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے انہوں نے زندہ رہنے کا ارادہ کر لیا۔ زندگی ایسی ہی بے معنی اور بے مصرف معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ موت کی وہ لبھا لینے والی خوبیاں ایک لمحے کے لئے زائل ہو گئیں۔

۵

لیکن یہ لمحہ بہت ہی گریز پا ثابت ہوا۔

اس واقعہ پر ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ آمنہ بنت وہب کی شخصیت کے اردگرد پھر وہی خواب اپنے تانے بانے بننے لگے، وہی المیہ قسم کی مسرت ان کی رگ رگ پر چھا گئی۔ وہی قہقہے، وہی بات بات پر مسکرا دینے کی عادت اُن کا معمول بن گئی۔ گھر کے لوگ خوش تھے کہ اُن کی بچی، اُن کی بہن اپنا غم بھول رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ عجیب تشویش محسوس ہو رہی تھی کہ غم کے ساتھ ساتھ آمنہ کچھ اپنے آپ کو بھی بھولتی جا رہی ہیں۔

انہیں وقت پر بھوک نہیں لگتی اور پھر یکایک اشتہا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھانا سامنے رکھے بیٹھی ہیں جیسے کسی کی انتظار میں ہوں اور پھر یکایک ان کے ذہن اور اعصاب میں پھرتی

اُجاتی ہے۔ وہ پوری رغبت سے کھاتی ہیں، ہنستی ہیں، قہقہے لگاتی ہیں۔
برکہ مالکن کی اس کیفیت کو دیکھ دیکھ کر نڈھال ہوئی جاتی تھی اُس نے خاندان کے اکثر افراد کو یہ بتایا تھا کہ مالکن اکثر اوقات اسی وقت کھانا کھاتی ہیں جس وقت وہ چھوٹے سردار کی زندگی میں ان کے ساتھ کھایا کرتی تھیں۔ چھوٹے سردار کی موت کا دن آمنہؓ خاص انداز میں منانے کی عادی ہو گئی تھیں۔ اس روز وہ قبر پر نہیں جایا کرتی تھیں بلکہ اس کمرے میں بیٹھ جایا کرتی تھیں جہاں عبداللہ نے آخری سانس لی۔ وہ اس چارپائی کے قریب منڈلاتی رہتیں جس پر سردار کی وفات ہوئی تھی اور سارا دن ایک کھیل اڑکران کے منہ میں نہ جایا کرتی تھی۔ پھر وہ دن بھی بڑا عجیب ہوتا جس دن سردار کی وفات کی خبر مالکن حضور کو مکہ میں پہنچی تھی۔
وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھتیں، نہاتیں، بال سنواتیں اور اس طرح بیٹھ جاتیں گویا کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔
برکہ کو حیرت تھی کہ اس ذہنی کیفیت کو یثرب والے خوشی کا نام کیسے دے سکتے ہیں۔ کیا صرف ہنس لینا خوشی سمجھی جا سکتی ہے۔ قہقہوں کی اوٹ میں لہراتے ہوئے آنسو واقعی ان عنکبوتی پردوں میں چھپ جاتے ہیں اور انہیں دیکھنا ممکن نہیں رہتا ــــ؟ کیا واقعی اس کی مالکن کی یہ یاس انگیز خوشی اطمینان بخش ہے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں۔ وہ اچھی ہو رہی ہیں اور اپنا غم بھول جائیں گی۔ وہ ہلکی غیر محسوس تشویش جو خاندان والے اس ذہنی ابتری کے متعلق محسوس کر رہے ہیں۔ واقعی کافی ہے اور

ضرورت نہیں کہ اس کے متعلق زیادہ سوچ بچار کی جائے اور کسی ایسے آدمی سے پوچھا جائے جو ان کیفیات سے عام لوگوں سے زیادہ واقف ہو؟

برکہ نے اپنی اس پریشانی کو خفیہ بھی نہیں رکھا تھا۔ اس نے اپنی مالکن حضور کے ماموؤں، چچاؤں، بھائیوں اور ان سے اتر کر گھر کی سب عورتوں کو اپنی اس پریشانی میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اسے سخت حیرت تھی کہ کوئی اس بات کو نہیں سمجھ سکا۔ کسی نے برکہ کی اس پریشانی کا ساتھ نہ دیا۔ اور برکہ کی آنکھوں کے سامنے اس کی محبوب اور محترم مالکن آہستہ آہستہ اپنے خوابوں میں زیادہ گہری ——— زیادہ دور ڈوبتی چلی گئیں۔

آمنہؓ کی شخصیت کا وہ حصہ جس کو صرف آمنہؓ جانتی تھیں آہستہ آہستہ اس حصے پر غالب آ گیا جس کو سب جانتے تھے، دیکھتے دیکھتے محسوس کرتے تھے سا آمنہ اب وہ آمنہ نہیں رہی تھیں۔ اب وہ اپنے اندر ——— اپنی شخصیت کے لامحدود عمق میں کھو گئی تھیں ——— اتنی دور جا چکی تھیں کہ محمدؐ کے آنسو بھی کئی دفعہ انہیں واپس لانے میں ناکام ہو جاتے۔ اپنے اکلوتے کی آواز انہیں بعض اوقات کسی غیر کی آواز معلوم ہونے لگتی اور وہ اس پر متوجہ ہونے کی ضرورت محسوس کئے بغیر اس اتھاہ عمق کی طرف تیزی سے بڑھتی جاتیں جس کی طرف بڑھنے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

اور اس طرح کئی دن گزر گئے۔

پہلے تو محمدؐ نے اپنی والدہ کی اس ذہنی کیفیت کو حیرت سے دیکھا

اور انہیں پکارا کرتا۔ پھر جب آمنہ بنت وہب دُور سے دور تک جانے لگیں اور اُن کی خود فراموشی کی یہ کیفیت ایک معمول سا بن گئی، تو محمدؐ آہستہ آہستہ اس کیفیت سے کچھ مانوس سے ہو گئے

آمنہؓ خوش تھیں۔ اُن کے ذہن کی وہ کسک آہستہ آہستہ دُور ہوتی چلی گئی۔

اور محمدؐ مینار بنانے کے کام میں زیادہ سے زیادہ مصروف ہوتے گئے۔ لیکن یہ مینار روز بنتا اور روز کسی نہ کسی وجہ سے گر جایا کرتا۔ ایک دفعہ خود محمدؐ کے کرتے سے الجھا اور گر پڑا کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ ہوا کے جھونکے سے دھم سے زمین پر آ رہتا۔ دو چار دفعہ تو برکہ کے پیروں سے ٹوٹا اور گرا لیکن اتنی بار گرنے کے باوجود محمدؐ کی دُھن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی مینار کے گرتے ہی وہ پھر اس کی تعمیر میں ہمہ تن محو ہو جاتے۔

ایک دن برکہ نے پوچھ لیا،

"چھوٹے حضور —— ایک بات پوچھوں بتایئے گا؟"

"پوچھو برکہ ——"

"اس مینار پر چڑھ کر آپ اللہ سے باتیں کیا کریں گے نا —!"

"ہاں ——"

"اور اللہ میاں آپ کو جواب دیا کریں گے؟"

"ہاں —— جو بھی اس مینار پر چڑھے گا اللہ میاں سے باتیں کر سکے گا

برکہ —— اونچا ہو گا نا —— !"

"میں بھی چھوٹے حضورؐ ــــــ؟"

"ہاں برکہ تم بھی۔"

"مگر میں تو کنیز ہوں۔"

"پھر کیا ہوا" محمدؐ نے قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ "تم آدمی بھی تو ہو اور جب اللہ سب کا مالک ہے تو تمہارا بھی مالک ہوا۔ اپنے آقا سے ہر کوئی باتیں کر سکتا ہے۔"

"پھر میں ضرور اس پر چڑھوں گی چھوٹے حضورؐ ــــــ اور میں اللہ میاں سے پوچھوں گی کہ اُس نے میری مالکن کو کیا کر دیا ہے ــــــ وہ کیوں اس طرح ہو گئی ہیں۔ اللہ میاں جواب دیں گے نا چھوٹے حضورؐ ــــــ"

"ضرور جواب دیں گے برکہ ــــــ غلام جب اپنے آقا سے کچھ پوچھتا ہے تو آقا جواب دیتا ہے۔"

"مگر بہت دیر لگے گی یہ مینار بنانے میں ــــــ یہ تو ہر روز گر جاتا ہے۔"

"ہاں ــــــ لیکن بنے گا ضرور برکہ ــــــ ایک نہ ایک دن یہ مینار ضرور بنے گا۔"

برکہ محسوس کرتی تھی کہ علت خام ہے۔ ناپختہ ذہن منطق کی کڑیاں جوڑنے کے لئے جو بنیاد قائم کر رہا ہے، وہ یقیناً بچوں ہی کی سی ہے۔ مینار کی تعمیر اور پھر اس پر چڑھ کر اللہ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا تصور برکہ کے پختہ ہوتے ہوئے شعور کو کچھ اجنبی سا معلوم ہوتا تھا لیکن بایں ہمہ محمدؐ علت و معلول کی کڑیوں کو جس طرح ملا رہے تھے وہ غیر معمولی بات تھی۔

عام بچوں کا ذہن ربط و تسلسل کی ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔ تیز اور بے لگام لاشعور ناپختہ شعور میں اپنی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا ہے۔ یہی وہ احساس تھا جس نے برکہ کو کامل یقین دلا دیا تھا کہ اُس کے چھوٹے حضورؐ عام بچوں جیسے نہیں۔ یہ یقیناً غیر معمولی ہیں ــــــ قطعی غیر معمولی۔

اسی لئے وہ محمدؐ کی ہر بات کو غور سے سنتی اور اس میں پوری طرح سے شامل ہونا چاہتی لیکن کوئی ایسی غیر مرئی، غیر محسوس قوت تھی جو اُسے محمدؐ کی باتوں کو کھیل سے کچھ زیادہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔

آج بھی اُس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ مینار کے متعلق باتیں کھیل میں شامل ہونے کے لئے شروع ہوئیں لیکن اسی اَن دیکھی غیر محسوس طاقت نے برکہ کو کھینچ کر اس کھیل کی گہرائیوں میں گھسیٹ لیا اور وہ سچ مچ یہ سمجھنے لگی کہ وہ محمدؐ کے بنائے ہوئے مینار پر چڑھ کر اللہ میاں سے اپنی مالکن کے متعلق پوچھ سکے گی ــــــ صرف یہی نہیں بالمشافہ اور باقاعدہ اس موضوع پر اللہ میاں سے بحث کر کے اس عظیم طاقتور ہستی کو قائل کر سکے گی۔

اس یقین نے برکہ کو بے چین کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ مینار جلد سے جلد تیار ہو جائے۔ اس لئے اس سلسلے میں وہ اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہو گئی۔

"میں پتھر لاؤں چھوٹے حضورؐ؟" اُس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

چھوٹے حضورؐ نے برکہ کی طرف دیکھا۔ برکہ کے ہونٹوں پر نام کو مسکراہٹ نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں کھیل میں شامل ہونے کی وہ مخصوص مربیانہ

چمک نہ تھی جو بچوں کے کھیل میں شامل ہوتے وقت بڑوں کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سب چیزوں کی بجائے برکہ کے چہرے پر خلوص کا ہر وہ نشان موجود تھا جو سنجیدہ کام کرتے وقت ہر چہرے پر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔

محمدؐ نے ملیحے کے تھوڑے سے حصے کے لئے اس سنجیدگی کو دیکھا اور فرمایا:

"ہاں ــــ لے آؤ۔"

اور برکہ کو جیسے کوئی بہت بڑی کارگزاری دکھانے کا اذن مل گیا ہو۔ وہ سنگریزے بٹورنے میں مصروف ہو گئی ــــ!

۶

مینار بن کر گرتا رہا اور محمدؐ برکہ اور عربدہ کی مدد سے اُسے بنانے میں مصروف رہے۔

بنت وہب کو اس مینار میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے عمق میں گہری ——— اور گہری اترتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ اُن کا اکلوتا بھی ان کے لئے بیگانہ سا ہو گیا۔ وہ صبح تھوڑا بہت کھا کر قبرستان چلی جاتیں اور دن بھر شہرِ خموشاں کے سناٹوں میں گزار دیتیں۔ ذہن کے اس یک سمتی بہاؤ نے آمنہؓ کو شاعر بنا دیا تھا۔ اُنہوں نے عبداللہ کے مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے۔

اور یہی مرثیے بیرونی دنیا کے ساتھ آمنہؓ کا واحد رشتہ رہ گئے تھے۔ وہ اپنے والد کے گھر میں اس طرح آئیں گویا مہمان ہوں۔ گھر والوں کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس گھر میں کوئی ایسا نہ ہو جس کے ساتھ انہیں کوئی

رابطہ، کوئی دلچسپی ہو۔ وہ قبرستان سے واپس آتیں اور اکثر کچھ کھائے پیئے بغیر اس کمرے میں چلی جاتیں جہاں سردار عبداللہ نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں گزاری تھیں ــــــ ماموں، چچاؤں، بھائیوں اور بھابیوں کے اصرار کے باوجود آمنہؓ بنت وہب بہت بہت کم کھانا کھاتی تھیں۔ بہت کم بات کرتی تھیں اور گھر کے ہنگاموں میں بہت کم حصہ لیتی تھیں۔

محمدؐ نے آہستہ آہستہ اپنی ماں کی اس ذہنی کیفیت کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ سونے پر اب ضد نہیں کیا کرتے تھے۔ اکثر بے یقینی کے انداز میں پوچھتے،

"امّی ــــــ"

کوئی جواب نہ آتا۔

پھر ذرا بلند آواز میں فرماتے،

"امّی ــــــ"

اور آمنہؓ "ہوں" کہہ کر اُن کی طرف دیکھتیں۔ کافی دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہتیں اور پھر پوچھتیں۔

"محمدؐ ــــــ؟ کیا بات ہے بیٹا؟"

اور محمدؐ ایک عجیب حسرتناک انکسار کے ساتھ اجازت چاہتے۔

"آج میں آپ کے ساتھ سو جاؤں امّی؟"

ماں کے چہرے پر عجیب و غریب تاثرات اُبھرتے۔ ان میں محبت ہوتی، پیار ہوتا۔ مامتا اپنی پوری شدت کے ساتھ کسی مخالف جذبے سے

لرزتی دکھائی دیتی۔ لیکن وہ مخالف جذبہ جو پہلے ماں تا کی ہمہ گیر عظمتوں کے سامنے ہتھیار پھینک دینے پر مجبور ہو جایا کرتا تھا اب غالب ہو جانے کی نشان دکھایا کرتا ——— کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کون سی کیمیاوی تبدیلیاں ذہن میں ہو گئی تھیں جنہوں نے مغلوب کو غالب بنا دیا تھا۔

اور پھر یکایک یہ جواب آتا،

"نہیں محمدؐ ——— تم برکہ کے ساتھ سوؤ گے۔ تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے۔ میرا خیال چھوڑ دو ——— سمجھ لو میں نہیں ہوں۔"

اور محمدؐ چپ ہو جاتے۔

اکثر رات میں برکہ کے ساتھ سوتے سوتے اُن کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ محسوس کرتے کہ اُن کا گلا آنسوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی پلکیں آنسوؤں سے لدی ہوئی ہیں۔ وہ چیخ کر رونا چاہتے ہیں۔ "ماں" کی آواز سے اس گھر کی دیواریں ہلا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کو پکارنا چاہتے ہیں ——— اس ماں کو جو ہونے کے باوجود کہتی ہے کہ وہ نہیں ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے اعصاب کی اس شدید خواہش کا اظہار کر سکیں، اکثر ہلکی ہلکی آوازیں اُن کے کانوں میں آنے لگتی تھیں۔ یہ آوازیں اُن کی والدہ کی چارپائی کی طرف سے آ رہی ہوتیں۔ وہ تکیے پر سے ذرا اٹھ کر اپنی والدہ کی چارپائی کی طرف دیکھتے۔ کمرے کی گہری تاریکیوں میں انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا۔ لیکن آوازیں ایک ملکوتی مترنم ندی کی طرح سنائی دیتیں ———

آمنہؓ مرثیہ گا گا کر پڑھ رہی ہوتیں۔

لیکن اس مرثیے میں غم کا نشان نہ ملتا۔ اس میں ملنے کی آرزو — اور جلدی ہی اپنے محبوب کے پاس پہنچ جانے کا یقین نجم اسعد کی کانپتی روشنیوں کی طرح کانپا کرتا۔

اور محمدؐ اپنے آپ پر قابو پا لیتے — بہت وقت ہوتی انہیں اپنے آپ پر جبر کرنے میں — لیکن وہ بالآخر کامیاب ہو جاتے۔ وہ اپنی والدہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ امی ناراض ہوں گی۔

اور اسی طرح کئی دن گزر گئے۔

کئی دن — جن کی تعداد برکہ کے علاوہ کوئی نہیں گن سکا تھا۔

ان دنوں میں گھر والوں کی تشویش بڑھتے بڑھتے برکہ کی تشویش سے آملی تھی۔

منجھلے ماموں نے ایک دن آمنہؓ کو ایک کاہن کے پاس چلنے کو کہا تھا جو بھوتوں اور چھلاووں سے پیچھا چھڑانے میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے ہر فرد کو یقین ہو گیا تھا کہ صبح سے شام تک قبرستان میں رہنے کی وجہ سے آمنہؓ کو کسی آسیب کی نظر ہو گئی ہے۔

لیکن آمنہؓ نے انکار کر دیا تھا۔ ایک ایسی قطعیت کے ساتھ جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے تیز تلوار کی طرح کاٹتی ہوئی آواز میں کہا تھا — ،

"مجھے کوئی تکلیف نہیں — میں کسی کاہن کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

اور منچلے ماموں چپ ہو گئے تھے۔ انہوں نے گھر کی دوسری عورتوں کی طرف چور آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہیں عورتوں نے ماموں کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔

لیکن وہ نچلے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے چپکے چپکے کسی کو بتائے بغیر کاہنوں سے مشورہ کیا تھا۔ کاہنوں نے دیوتاؤں کے پاس کی دھول دی تھی کہ آمنہؓ کو بتائے بغیر اُن پر چھڑک دی جائے اور وہ دھول کہیں گر کر ضائع ہو گئی پھر کاہنوں نے اپنے طور پر اپنے اپنے معبدوں میں منتر پڑھنے کے وعدے کئے اور اس کے عوض میں خاصی رقم ماموں سے اینٹھ لی۔ ان منتروں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

آمنہؓ اپنی شخصیت کے اعماق میں زیادہ گہری ——— زیادہ دور اترتی چلی گئیں۔

کہ ایک دن انہیں اس اعماق سے کھینچ کر نکال لیا گیا۔

مکّہ سے کچھ لوگ یثرب میں پھر آئے ——— کئی مہینوں کے بعد

یثرب والوں کا یہی خیال تھا کہ بنو ہوازن اور قریشی جھگڑے کے متعلق مزید گفت و شنید ہو گی۔ خود آمنہؓ کا بھی یہی خیال تھا اور اسی خیال کے زیر اثر انہوں نے ان آنے والوں کی طرف توجہ نہیں کی۔

لیکن شام کو جیسے آمنہ کے سر کے کہیں قریب رعد کا دھماکہ ہوا اُن کے منچلے ماموں کہہ رہے تھے۔

"سردار عبدالمطلب نے تمہیں اور محمدؐ کو مکّہ بلایا ہے۔"

برکہ اور دوسری عورتوں نے ماموں کی اس آواز میں کوئی خاص بات نہیں سنی۔ وہی ہموار آواز جس میں جان بوجھ کر افسردگی پیدا کی گئی تھی۔ گھر والے سبھی چاہتے تھے کہ آمنہؓ مکہ چلی جائیں۔ عبداللہ کی قبر انہیں عام زندگی سے بہت دور کھینچ لے گئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مکہ میں آمنہؓ اچھی ہو جائیں گی بُعد بھی تو بعض اوقات رُوح کے زخموں کا اندمال کر دیا کرتا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آمنہؓ کے سامنے اس خیال کا اظہار کرتا۔ اس لئے ماموں نے بڑی کوششوں سے اپنی آواز میں افسردگی پیدا کی تھی۔

لیکن آمنہؓ کے حساس ذہن نے ان الفاظ کو رعد کی بھیانک اور خوفناک کڑک سمجھا۔ وہ گھبرا کر پلٹ گئیں۔ جیسے اس کڑک سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں۔۔

ماموں نے پھر کہا،

"پیغام لانے والے کہتے ہیں کہ انہیں سردار نے تاکید کی ہے۔ سردار بہت پریشان ہیں۔ وہ ہر روز فاران کی چوٹی پر آکر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔"

اور آمنہؓ نے بڑی مشکلوں سے اپنی زبان کو یہ کہنے پر مجبور کیا،

"لیکن میں اکیلی کیسے جا سکتی ہوں ماموں ——— میں ——— میں عبداللہ کو چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں۔"

"عبداللہ کو مرے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا بیٹیا" ماموں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

لیکن ان کی بھانجی جیسے چونک گئی۔ انہوں نے تیزی سے پلٹ کر کہا :

"ماموں ـــــ عبداللہ نہیں مرے۔ تم نہیں جانتے عبداللہ نہیں مر سکتے میری محبت نے عبداللہ کو موت کے منہ سے چھین لیا ہے ماموں ! تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ نہیں مر سکتے ـــــ میرے عبداللہ نہیں مر سکتے تھے۔ میں یثرب میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے وہ مجھ سے ناراض ہو گئے تھے اب میں نے انہیں منا لیا ہے۔ یہ دیکھو وہ میرے پاس ہیں ـــــ وہ میرے پاس ہیں ـــــ میرے عبداللہ کو کوئی نہیں چھین سکتا مجھ سے :"

اور ماموں چپ ہو گئے۔

دوسری عورتیں دم بخود ہو کر رہ گئیں۔

محمدؐ خاموشی سے اس منظر کو دیکھتے رہے۔

برکہ نے یوں محسوس کیا کہ آسمان ٹوٹ کر اس کے اوپر گر پڑا ہے۔ اور وہ عظیم ناقابل برداشت بوجھ کے نیچے دبتی پستی چلی جا رہی ہے۔

اس بات کا کیا جواب دیا جا سکتا تھا ـــــ؟ اس کیفیت کو کیا کہہ کر دور کیا جا سکتا تھا ـــــ؟

برکہ کی ہمدردیوں نے چند دنوں میں وہ معجزہ کر دکھایا جو گھر بھر کے اصرار سے نہیں ہوا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ آمنہؓ یہاں سے واپس چلی جائیں ـــــ مکہؐ کی دوریوں کی ہمدرد آغوش میں۔

اور آمنہؓ بر کہ کے کہنے سننے پر مان گئیں۔

سفر کی تیاریاں تیزی سے ہونے لگیں۔

اور اونٹوں پر کجاوے کسے جا رہے تھے جب آمنہؓ بنت وہب قبرستان کی خاموشیوں میں کھڑی عبداللہ کی قبر کو دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت قبرستان کے سناٹے روایت نہیں کر سکتے تھے۔

ان سناٹوں نے دیکھا، آمنہؓ اپنے سرتاج کی قبر سے مخاطب ہیں اور کہہ رہی ہیں،

"سرتاج ——— سردار مکہ کا پیغام آیا ہے۔ میں محمدؐ کو کچھ دور تک چھوڑنے کے لئے جا رہی ہوں۔ سردار نے محمدؐ کو بلایا ہے سرتاج ——— وہ فاران کی طرف دیکھتے اور محمدؐ کا انتظار کر رہے ہیں۔ پورا مکہ محمدؐ کا منتظر ہے۔ میں اسے زیادہ دیر یہاں نہیں رکھ سکتی۔ میں کچھ دور تک اسے پہنچانے جاؤں گی اور پھر لوٹ آؤں گی ——— پھر میں آ جاؤں گی سرتاج ——— اور پھر کوئی پیغام مجھے واپس نہیں بلا سکے گا۔"

یہ ساری باتیں محبت کی زیر لب آوازوں میں کہی گئی تھیں۔ جیسے ایک دل دوسرے دل سے اپنے راز کہہ دے۔ اس میں کہیں جذبات کی پیچیدگی نہ تھی۔ کہیں پریشان ذہنی کو دخل نہ تھا۔ سیدھی سادی بات سیدھے سادے انداز میں کہہ دی گئی۔ اور آمنہؓ جلد لوٹ آنے کا وعدہ کر کے قبرستان سے چلی آئیں۔

وداع کے ہنگامے اپنی پوری روایات کے ساتھ برپا ہوئے۔ ہر

آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہر آواز رو رہی تھی۔ ایک عظیم قبیلے کی عظیم دکھیاری بیٹی ایک سال تک اپنے باپ کے گھر میں رہنے کے بعد پھر سسرال جا رہی تھی۔ قدرتاً یہ سب کچھ ہوتا ـــــ

لیکن آمنہؓ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ یہ لوگ کتنے سادہ دل ہیں۔ انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اپنوں کو چھوڑ کے کوئی نہیں جایا کرتا۔ اور اگر جاتا ہے تو لوٹ آنے کے لئے۔ اس لئے کہ وہ پھر پلٹ آئیں گی۔

اور قافلہ چل دیا۔

حدی خوانوں کی وہی مانوس آوازیں بلند ہوئیں۔ آمنہؓ کے مائیکے والے دور تک آمنہؓ کے ساتھ ساتھ آئے ـــــ یثرب کے باہر تک ـــــ اور آخر باچشم پُرنم لوٹ گئے۔

آمنہؓ نے انہیں بولتی ہوئی آنکھوں سے جاتے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں،

"میں آؤں گی ماموں ـــــ اور پھر تم مجھے دوبارہ نہیں بھیج سکو گے۔"

لیکن ان بولتی آنکھوں کی آواز کوئی نہ سن سکا ـــــ کسی کے کان اتنے تیز نہ تھے جو آواز کی ان نامحسوس لہروں کو جذب کر سکتے۔

اور قافلہ بڑھتا گیا۔

آمنہ کجاوے کے داہنے جھول میں تنہا بیٹھی تھیں اور محمدؐ برکہ کی گود میں بائیں جھول میں بیٹھے تھے۔

محمدؐ برکہ سے کہہ رہے تھے،

"برکہ ـــــ وہ مینار ہم مکہ میں چل کے بنائیں گے۔"

اور برکہ نے اوپرے سے دل سے کہہ دیا تھا،

"ہاں ـــــ"

"ضرور بنے گا نا وہ مینار برکہ۔"

"اگر حضورؐ بنانا چاہیں گے تو ضرور بنے گا۔"

"میں تو چاہتا ہوں۔"

"پھر ضرور بنے گا۔"

اور محمدؐ چپ چاپ سوچنے لگے تھے۔

لیکن یہ عجیب بات تھی۔ برکہ نے یثرب میں ایک ایک دن اور ایک ایک منٹ گن گن کر کاٹا تھا۔ یثرب ہر لمحہ اس پر بھاری گزرا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ خود یثرب برکہ کو اپنانے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں آکر اس کی مالکن کی ذہنی کیفیت پریشان کن حد تک ناقابل فہم ہو گئی تھی۔ برکہ اُن کی نت نئے انداز میں بدلتی ہوئی کیفیات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی تھی۔ وہ خوش ہوتیں تو برکہ خوش ہو جاتی۔ اور پھر برکہ کو یکایک محسوس ہونے لگتا کہ یہ خوشی حقیقی مسرت نہیں ہے۔ وہ اس پر بے چین ہو جاتی۔ وہ محمدؐ کے ساتھ کھیل کر اور اُن کی دلچسپیوں میں مکمل دلچسپی لے کر اپنے آپ کو بھولنا چاہتی تھی۔ گویا محمدؐ کے تصورات میں پناہ لے رہی ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ پریشان رہتی تھی اور چاہتی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اور جس طرح ممکن ہو سکے وہ اپنی

مالکن کو لے کر اس شہر سے نکل جائے۔

یہی وجہ تھی کہ سردار عبدالمطلب کی طرف سے آنے والا پیغام برکہ کے لئے بادِ بہاراں کا جھونکا ثابت ہوا تھا۔ اُس نے اپنی مالکن کو مکہ چلنے پر منانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ اور جب اُس کی مالکن نے کہا تھا کہ میں تم لوگوں کو چھوڑ کر بھی تو آسکتی ہوں، تو برکہ کی رگ رگ میں شہنائیاں سی بجنے لگی تھیں۔ اُس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ایک دفعہ مالکن چلنے پر تیار ہو جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ مکہ میں جا کر سردار عبدالمطلب سے مالکن حضور کی ایک ایک بات کہے گی اور اُسے یقین تھا کہ سردار پھر مالکن کو یثرب میں نہیں آنے دیں گے۔ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے مالکن اپنا غم بھول جائیں گی۔ اس لئے سفر کی تیاریوں میں اُس نے پورے انہماک اور پوری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

اور جب قافلہ چلا تھا تو برکہ بے انتہا خوش تھی۔

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ قافلہ جوں جوں بڑھتا گیا۔ برکہ کی وہ خوشی غائب ہوتی گئی۔ اب اُسے مطلقاً خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ محمدؐ اور اُن کے بینار میں بھی اُسے خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یکایک وہ بینار برکہ کی نگاہوں میں بچے کا کھیل بن گیا تھا اور اُسے اپنی اس کیفیت پر ہنسی آنے لگی تھی۔ جب وہ اس بینار میں دلچسپی لینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔

برکہ نے ذرا اونچا ہو کر مالکن کی طرف دیکھا۔

لال، نیلی اور سفید دھاریوں کے موٹے کپڑے کی ردا میں لپٹا ہوا

ایک حسین چہرہ ——!

اور معبود ——

برکہ کے پیروں کے تلوے ٹھنڈے پڑ گئے۔

اُسے یکایک محسوس ہوا کہ یہ چہرہ زندہ انسانوں کے چہرے سے مشابہ نہیں —— یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موم سے بنایا گیا ہے۔ جیسے اس کا ملکوتی حسن موم کے بے جان ذرّوں میں منجمد کر لیا گیا ہے۔

برکہ کا جی چاہتا تھا کہ وہ مالکن کو پکارے۔ انہیں آواز دے۔ واپس بلائے انہیں۔ لیکن اس خود فراموشی —— موت کی سی اس بے جان اور بے روح بے خودی میں کچھ ایسا وقار، ایسا رعب تھا کہ برکہ کوشش کے باوجود اپنی آواز بلند نہ کر سکی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی دیوی کے حضور میں حاضر ہے اور اُس کے جسم کی ہر پور محسوس کر رہی ہے کہ یہاں آواز دینا اور پکارنا بے ادبی ہے۔ خاموشی اور سکوت ہی فریضۂ اوّل ہے۔

وہ دم بخود اپنی مالکن کو تکتی رہی اور سردارِ مکّہ کی وہ ناقہ جو خاص طور پر سردارِ مکّہ کے دل و جگر کو یثرب سے لانے کے لئے آئی تھی، اپنی غیر ہموار چال سے چلتی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد برکہ کی رکی ہوئی سانس اٹک اٹک کر اور ہولے ہولے اس کے نتھنوں میں سے نکلی۔ اس کی مالکن کے چہرے پر سے جمود کی وہ کیفیت آہستہ آہستہ تحلیل ہونے لگی —— جیسے سورج نکل آئے۔ اور جمی ہوئی برف کی سطح پر ہلکی ہلکی سلوٹیں جز بز ہونے لگیں۔

لمبی کالی پلکیں جھپکنے لگیں اور مالکن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔

اور معبود ـــــ! کتنا یاس انگیز اطمینان تھا جو برکہ کی رگوں میں سرسرانے لگا تھا ـــــ

اُسے اطمینان ضرور ملا تھا ـــــ لیکن کتنی پریشانی تھی اس اطمینان میں۔ کاش برکہ اپنی اس پریشانی کے معنی سمجھ سکتی ـــــ اور پھر یکایک مالکن کے ہونٹ ہلے۔ اُنہوں نے کہا،

"برکہ ـــــ!"

"مالکن حضور ـــــ!" برکہ نے اس تیزی سے جواب دیا کہ مالکن کے لفظ اس کے اپنے الفاظ میں گڈمڈ ہو گئے۔

"پانی ہے ـــــ؟"

"جی ـــــ"

اور برکہ کے ہاتھ بلا کی تیزی سے اٹھے۔ چھاگل شاید اس ایکا ایکی یورش سے چونک گئی تھی ورنہ اس کے منہ سے پانی نہ چھلک پڑتا۔

مالکن نے پانی کے دو گھونٹ پیئے اور چھاگل برکہ کی طرف بڑھا دی۔ برکہ نے دونوں ہاتھوں سے چھاگل کو پکڑ لینا چاہا اور اُس کے دونوں ہاتھ اس کی مالکن کے ہاتھوں سے چھو گئے۔

برکہ کا سر گھوم گیا۔

اس کی مالکن کے ہاتھ کس طرح کانپ رہے تھے۔

برکہ نے چھاگل جلدی سے رکھی اور ہاتھ بڑھا کر مالکن کے ماتھے پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

نور سے معمور پیشانی گرم تھی ــــ بہت زیادہ گرم۔

"میں ٹھیک ہوں برکہ۔" مالکن نے فرمایا۔

"جی ــــ جی ہاں!" برکہ نے چھپانے کی کوشش کی۔" بالکل مالکن حضور ــــ لیکن ــــ لیکن ــــ"

"کچھ نہیں ــــ تم گھبراؤ نہیں۔"

"جی ــــ جی ہاں ــــ میں نہیں گھبراتی مالکن حضور لیکن حضور کی پیشانی"

اور برکہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکی ــــ

"یہ تو محض تیاریاں ہیں برکہ ــــ"

"تیاریاں ــــ مالکن حضور کیا فرما رہی ہیں۔"

"خوشی سے بھی بدن تپ جاتا ہے برکہ ــــ تم اس بات کو چھوڑو تم نہیں سمجھ سکو گی ــــ شتربان سے پوچھو پہلا پڑاؤ کہاں ہوگا۔"

"جی ــــ بہتر ــــ" برکہ نے مالکن کی طرف تشویش کی ایک نظر ڈالی اور کجاوے کا سہارا لے کر اونچی ہوئی۔ اُس نے شتربان کو پکارا،

"اعرابی ــــ اعرابی۔"

"یابنتِ عم ــــ" جواب آیا۔

"پہلا پڑاؤ کہاں ہوگا ــــ مالکن حضور پوچھ رہی ہیں۔"

"لوائیں بنتِ عم ــــ"

"لوائیں ___"

"ہاں لوائیں۔"

اور برکہ نے گھوم کر اپنی مالکن کی طرف دیکھا،

"لوائیں مالکن حضور۔"

"کتنی دور ہے لوائے۔"

برکہ نے پھر اعرابی سے سوال کیا اور اعرابی نے اسی طرح صاف گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"یثرب سے بارہ میل پر۔"

"ہم کب تک پہنچ جائیں گے لوائے تک۔" برکہ نے مالکن کا سوال دہرایا ___

"صبح ہم لوائیں ہوں گے یا بنت عم۔"

"ٹھیک ہے۔" آمنہؓ نے اطمینان سے کہا۔ اور آنکھیں بند کر کے کجاوے پر سر ٹیک دیا۔

"صبح ___؟ کافی دور آگئی ہیں۔" برکہ نے اس کا مطلب پوچھنا چاہا تھا لیکن وہ نہ پوچھ سکی۔

اور لوائیں آتے ہی مطلب واضح ہو گیا۔

برکہ کی مالکن حضور کا بخار شدت اختیار کر گیا تھا۔ قافلہ والے برکہ کے کہنے پر دو دن تک بخار کے ٹوٹنے کا انتظار کرتے رہے لیکن اس میں

قطعاً کوئی کمی نہیں آئی۔ اور کمی آتی بھی کیسے۔ یثرب کے مضافات میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لوا جو کھاری پانی کے چھوٹے سے کنوئیں کے اردگرد بیس پچیس گھروں کے آباد ہو جانے کی وجہ سے بس گیا تھا۔ یہ گھرانے تھوڑی تھوڑی کھیتی کرتے۔ زمین زرخیز تھی اس لئے گزر بسر ہو جاتی۔ ان بیس پچیس گھروں کی تمام ضروریات یثرب سے پوری ہوتی تھیں اور یثرب سے آنے والے قافلے یہاں پڑاؤ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے معمولی سی تجارت بھی ہو جایا کرتی تھی۔ یہاں کوئی کاہن نہ تھا جو آمنہؓ کی دیکھ بھال کرتا۔ صرف برکہ کی پریشانیاں تھیں، محمدؐ کا افسردہ چہرہ تھا اور زیادہ لوگ تھے جنہیں سردار عبدالمطلب نے پیغام دے کر یثرب بھیجا تھا۔

ان سب سے جو کچھ ہو سکا۔ انہوں نے کیا ــــ لیکن ــــ لیکن ام محمدؐ کی بیماری بڑھتی گئی۔ ان کا تابناک چہرہ زرد پڑ گیا۔ نمک اور پانی سے قے ہوئے۔ اس سے آمنہؓ نڈھال ضرور ہو گئیں لیکن بخار میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

اور قافلہ دو دن تک انتظار کرنے کے بعد چلا گیا۔ زندگی کے قافلے یونہی تو چلتے رہتے ہیں۔ کسی کے لئے کون رکتا ہے ــــ لوا میں بھی قریشی آباد تھے۔ مکہ سے آنے والے قریشیوں نے فوراً سردار عبدالمطلب کی بہو کو ایک فلاح کے گھر میں منتقل کر دیا اور سردار مکہ کی بہو کی پوری نگہداشت ہونے لگی۔

لیکن بیماری دن بدن بڑھتی گئی یہاں تک کہ آمنہؓ پر بحران کی حالت

طاری ہو گئی۔

برکہ ہر دم مالکن کی چارپائی سے لگی ہوئی تھی اور محمدؐ اپنی والدہ کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ آمنہؓ بحران کی حالت میں عجیب عجیب باتیں کر رہی تھیں۔

"اب میں اور آگے نہیں جا سکتی سرتاج ـــــ اب مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔"

"آپ نہ گھبرایئے ـــــ برکہ ساتھ ہے ـــــ محمدؐ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"آبا حضور محمدؐ آپ کے سپرد ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

اور اسی بحران کی کیفیت میں کئی دن گزر گئے۔ ایک دن محمدؐ نے برکہ سے پوچھا،

"برکہ امی کس سے باتیں کرتی ہیں۔"

برکہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ صرف روتی ہوئی آنکھوں سے محمدؐ کی طرف دیکھتی رہی۔

"جواب دو برکہ ـــــ امی کے سرتاج کون ہیں۔"

"سردار عبداللہ ـــــ حضور ـــــ آپ!" اور برکہ نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے۔

"مگر ابا حضور کو وفات پائے تو عرصہ ہو گیا ہے۔"

"آپ نہیں سمجھتے آقا ـــــ آپ نہیں سمجھ سکتے۔" اور شدت گریاں

سے برکہ کی زبان بند ہو گئی۔ اُس نے اپنے چھوٹے حضور کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا ___

"دُعا کیجئے آقا ___ دُعا کیجئے ___ اپنے اللہ سے کہئے۔ وہ نہ ہو جو ہو رہا ہے۔"

"مگر کیسے کہوں برکہ ___ کیسے کہوں ___ سبھی کہتے ہیں دیوتاؤں کے بغیر اللہ تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں۔"

"کچھ تو ہو گی ___" برکہ چیخ پڑی، "آپ نہیں سمجھ رہے ہیں حضور۔ آپ نہیں سمجھ رہے ہیں کیا ہو رہا ہے۔"

اور کچھ دنوں کے بعد جو کچھ ہونا تھا اُس کی تیاریاں مکمل ہونے لگیں۔

آج اُمّ محمدؐ کو کافی افاقہ تھا۔ بحران کی وہ کیفیت نہ تھی۔ بخار گو بہت تیز تھا۔ آنکھیں سُوج گئی تھیں اور چہرہ تمتماتے ہوئے گلاب کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ لیکن سبھی کہہ رہے تھے کہ آج اُمّ محمدؐ کو افاقہ ہے۔ برکہ نے سب کے کہنے سے اپنے آپ کو بھی بدقت ایسا ہی سمجھنے پر راضی کر لیا تھا۔ وہ سرہانے بیٹھی کھاری پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر اپنی مالکن کے ماتھے پر رکھ رہی تھی۔ محمدؐ ماں کی پائنتی کی طرف کھڑے ماں کو دیکھ رہے تھے۔ اُمّ محمدؐ نے ہاتھ اُٹھایا اور نحیف آواز میں بولیں،

"محمدؐ ___!"

"امّی ___"

"ادھر آؤ ___" اور محمدؐ بھاگ کر ماں کی گود میں آ گئے۔

"محمدؐ — تم جانتے ہو — تم — تم یتیم پیدا ہوئے تھے۔"

"مالکن حضور —" برکہ نے کہا — لیکن برکہ کی بات پر توجہ نہیں کی گئی۔

"تم یتیم پیدا ہوئے تھے محمدؐ — تمہارے ابّا۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم سے روٹھ کر چلے گئے تھے۔ اور اب — اب محمدؐ شاید میں بھی چلی جاؤں مجھ سے مکہ نہیں جایا جائے گا۔ تم مکے جانا بیٹا۔ تمہارے دادا سردار عبدالمطلب فاران پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں تم وہاں جانا — اور دیکھو محمدؐ — ابّا حضور سے کہہ دینا میں اپنے سرتاج کو یثرب میں تنہا نہیں چھوڑ کر آ سکتی تھی۔ آپ کا حکم پورا کرنے کیلئے میں نے آپ کی امانت لوٹا دی ہے۔ لیکن میں نہیں آ سکتی تھی۔ میں کسی قیمت پر نہیں آ سکتی تھی اگر ابّا حضور ناراض ہوں تو تم اپنے یہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ دینا اور میری طرف سے معافی مانگ لینا محمدؐ — ابّا حضور سے معافی مانگ لینا اپنی امّی کی طرف سے۔ ابّا حضور تمہارے ان ہاتھوں کی لاج رکھیں گے۔ وہ مجھے معاف کر دینگے میری اس گستاخی کو بھول جائیں گے۔ اُن سے کہہ دینا میرا سب کچھ یثرب میں تھا یثرب میں — میرا — بہت کچھ تھا — سب کچھ تھا —"

مالکن نے برکہ کی چیخوں کو نہیں سنا۔ انہیں جیسے یہ سب کچھ کہہ دینے کی جلدی لگی ہوئی تھی۔ اور جب وہ یہ سب کچھ کہہ چکیں تو انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

جیسے پھول کی پنکھڑیاں شہد کے خزانے لٹا کر بند ہو جاتی ہیں۔

برکہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی مالکن کا زرد چہرہ دیکھتی رہی۔ اُس نے دیکھا حسین مخروطی ٹھوڑی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے اُبھر آئے ہیں۔ جیسے آسمان پھولوں کے حضور کنواری شبنم کا تحفہ گزرانے۔ ان کی سانس ہلکے ہلکے آ رہی تھی لیکن

معلوم ہوتا تھا جیسے بہت لمبا سفر کرنے کے بعد اس کی مالکن تھک کر سو گئی ہیں۔

اور اس نیند ــــ اس عجیب پرسکون نیند کا برکہ کے اعصاب پر شدید اثر ہوا تھا۔ وہ دم بخود کھڑی مالکن کا چہرہ تکتی رہی۔

اور پھر دفعتہً وہ چونک گئی۔

مالکن نے ایک لمبی سانس لی ــــ اور ــــ

برکہ چیخ کر بڑھی۔

مالکن کی سانسیں ختم ہو چکی تھیں۔

ننھے حضورؐ

(ایک تاریخی بیانیہ)

احسان بی، اے

ناشران

آئینۂ ادب چوک مینار۔ انار کلی لاہور

فون نمبر ۶۷۵۰۴